

# امجد علی شاہ

(اودھ کا متشرع چوتھا بادشاہ)



مصنف: فاضل نبیل چودھری سبط محمد نقوی
مقدمہ: عادل فراز

سلسلۂ کتب تاریخ تشیع در ہند ۱۱
Web : www.welayatpublications.com E-mail : welayatpublications@gmail.com

امجد علی شاہ
فاضل نبیل چودھری سبط محمد نقوی
سلسلۂ کتب تاریخ تشیع در ہند ۱۱

۱۱





**Welayat Publications, Delhi-110051**
Contact : 011-61361959, 9958225575
Web : www.welayatpublications.com
E-mail : welayatpublications@gmail.com

J

# امجد علی شاہ

(اودھ کا متشرع چوتھا بادشاہ)

مصنفہ

فاضل نبیل

## چودھری سبط محمد نقوی

مقدمہ

عادل فراز

جملہ حقوق بحق مصنّف محفوظ ہیں


| | | |
|---|---|---|
| نام کتاب | : | امجد علی شاہ |
| مصنف | : | فاضل نبیل چودھری سبط محمد نقوی |
| مقدمہ | : | عادل فراز |
| طباعت | : | کوثر پبلی کیشن نئی دہلی |
| سنہ طباعت | : | اکتوبر ۲۰۲۴ء |
| تعداد اشاعت | : | ۵۰۰ |
| ناشر | : | کوثر پبلی کیشن نئی دہلی |
| قیمت | : | Rs 250/- |

ملنے کا پتہ

**کوثر پبلیکیشن**

**نئی دہلی**

# انتساب

حوزۂ علمیہ کی طرف

رحلت کی تاریخی گھڑی میں

درسِ نظامی کے استاذ الاساتذہ

ملا فتح اللہ شیرازی

کے نام

مدادش چو موزوں به میزاں شود

گراں تر ز خونِ شهیداں شود

# فہرست

❑❑

# عرض کوثر

دنیائے ادب میں فاضل نبیل چودھری سبط محمد نقوی کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے۔ان کی تحقیقی نظر اور ناقدانہ رائے کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔اودھ کی تاریخ سے انہیں گہرا شغف تھا جس کا اظہار ان کی تصنیف ''امجد علی شاہ'' سے بھی ہوتا ہے۔انہوں نے نوابین اودھ کی سیاسی وسماجی زندگی اور لکھنؤ کی تہذیب وثقافت کا تحقیقی وناقدانہ مطالعہ پیش کیا ہے،جس میں نوابوں پر ہونے والے اعتراضات کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔خاص طور پر امجد علی شاہ اور سلطان العلما سید محمد رضوان مآبؒ کے سیاسی اور مذہبی نظریات پر استدلالی بحث کی گئی ہے، جو اس قدر بسط کے ساتھ کسی دوسری کتاب میں نظر نہیں آتی۔مورخین نے امجد علی شاہ کو ان کے مذہبی عقائد اور علماء کے زیر اثر ہونے کی بنیاد پر اودھ کا کمزور ترین بادشاہ قرار دیا اور مخالف عقائد کے افراد نے ان کی کردار کشی کا کوئی موقع نہیں چھوڑا۔اس راہ میں ان اہل قلم نے زیادہ فکری اور قلمی ہنگامے برپا کئے جو انگریزوں کے نمک خوار تھے۔چونکہ امجد علی شاہ کے عہد میں امامیہ عقیدے کو حکومتی مذہب کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی اور پہلی بار تمام حکومتی امور فقہ امامیہ کے مطابق انجام پانے لگے تھے،اس لئے انگریزوں نے امجد علی شاہ کے خلاف ایسے مورخین کا ایک غول کھڑا کر دیا جو ان کے عقائد اور حکومتی سرگرمیوں سے خوش نہیں تھا۔ان میں کمال الدین حیدر، منشی نول کشور، مولانا نجم الغنی، ابوطالب اصفہانی جیسے درجنوں افراد شامل ہیں۔رجب علی بیگ سرور بھی کسی طرح ان سے پیچھے نہیں رہے مگر انہیں انگریزوں کا نمک خوار نہیں کہا جا سکتا بلکہ وہ اپنے ولئ نعمت کی معزولی کی بنیاد پر کبیدہ خاطر تھے،اس لئے انہوں نے 'فسانۂ عبرت' میں امجد علی شاہ کے طریقۂ حکومت کو

تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ چودھری صاحب نے ان تمام مورخین اور اہل قلم کی آراء کا تنقیدی جائزہ لیا اور ثابت کیا ہے کہ امجد علی شاہ پر ہونے والے اعتراضات کی کوئی تاریخی حیثیت نہیں ہے۔

بہرکیف! چودھری سبط محمد نقوی کی معروف کتاب 'امجد علی شاہ' جو عرصۂ دراز سے نایاب تھی اور متعدد اہل نظر اس کتاب کی اہمیت کے پیش نظر تجدید چاپ کا مطالبہ کررہے تھے، اس لئے ہم نے اس کی اشاعت کا فیصلہ کیا۔ نمائندۂ ولی فقیہ حجۃ الاسلام حاج آقای شیخ مہدی مہدوی پور کو اودھ کی علمی تاریخ سے گہری دلچسپی ہے جس کا اظہار گاہے بہ گاہے وہ فرماتے رہتے ہیں۔ اس کا ایک عملی نمونہ امجد علی شاہ پر موجودہ کتاب کی اشاعت کا فیصلہ بھی ہے۔ جناب عادل فراز نے اس کتاب پر مبسوط مقدمہ تحریر کیا ہے اور کتاب کو اشاعتی مرحلے تک پہونچانے میں کلیدی کردار ادا کیا ہے جس کے لئے ہم ان کے ممنون ہیں۔ فاضل مصنف چودھری سبط محمد نقوی صاحب مرحوم کے فرزند ارجمند جناب عابس محمد عسکری صاحب کے بھی شکرگزار ہیں جنہوں نے فراخ دلی کے ساتھ کتاب کو شائع کرنے کی اجازت دی۔ اس کے بعد ان تمام افراد کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں جنہوں نے کسی نہ کسی سطح پر ہماری مدد فرمائی۔

والسلام

کوثر پبلی کیشن

نئی دہلی

# پیش گفتار

بادشاہوں کی رزم میں شمشیر وسناں اور بزم میں طاؤس ورباب کا بیان بہت ہوتا ہے لیکن قلم وقرطاس کا ذکر کم ہی آتا ہے۔ اگرچہ اس کی اہمیت کسی طرح شمشیر وسناں سے کم نہیں ہوتی۔ یہی وہ سلاح جنگ ہے جس سے کام لے کر اپنے موقف کو صحیح، حریف کے موقف کو غلط ثابت کرنے کے علاوہ اپنے محاسن وفضایل ومحامد، دشمن کے رزایل وقبائح کی نشر واشاعت کی جاتی ہے۔ اب تو نشر واشاعت کے بہت سے ذرائع ایجاد ہو گئے ہیں مگر ایک وقت وہ بھی تھا کہ اس کا دائرہ مؤرخ کے قلم، شاعر کی زبان اور خطیب کے بیان تک محدود تھا۔

چنانچہ جب اودھ انگریزوں کی نظر حرص کا نشانہ بنا تو ان کو یہ ضرورت پیش آئی کہ وہ اپنے پیش روؤں کی نالائقی اور اپنی حکومت کے جواز اور استحقاق کے لئے اودھ کے سابق حکمرانوں کی صورتوں کو مسخ کرائیں۔ اس مہم کا انھوں نے اپنی پوری عیارانہ صلاحیتوں کے ساتھ اہتمام کیا۔ وہ نہ صرف اپنا استحقاق حکومت مسلّم کرانا چاہتے تھے بلکہ شعوری اور منظم طریقے سے اس عمل تجاذب کو سریع سپر بنانا چاہتے تھے جس کے ذریعے مفتوح قوم پر فاتح قوم کا سیاسی استیلا اجسام سے گذر کے اذہان واوضاع کو مغلوب و مسخّر کرلیتا ہے اور انجام کار نہ صرف یہ کہ مفتوح قوم اپنے ماضی اور رسم وروایات، علم وادب، اندازِ فکر ونظر سے دور جا پڑتی ہے بلکہ ان کو نگاہ تنفر سے دیکھنے کی بھی عادی ہوجاتی ہے۔ ہندوستان میں عیسائیت کی تبلیغ تو کمپنی کے عمال کا خاص نصب العین تھا۔ بدنصیبی سے اودھ کی سرزمین اس کشت کاری کے لئے زرخیز بھی ثابت ہوئی اور فضا بھی سازگار ملی، درباری سازشوں پر پوری طرح

قابو پانا تو بیدار سے بیدار مغز فرماں روا کے لئے ممکن نہیں ہوتا۔ اکبر اعظم بایں ہمہ عظمت دانش مندی و جلال اقتدار کہیں نہ کہیں درباریوں کے چھینٹوں میں آ ہی گئے۔ ان کا عہد سلطنت مغلیہ کا نقطۂ کمال تھا اور اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے سے انحطاط کی لہر چلی مگر زیر آب، سطح آب بھی معتدل اور ظاہر رو بہ ترقی رہا لیکن ان کی جانشینی کے مسئلے کو حل کرنے کی جو سبیل ان کی اولاد نے نکالی اس نے تباہی کے راستے ہموار کر دیئے۔ فرّخ سیر کے عہد سے تو داستان ناگفتنی ہوگئی۔ دربار سازشوں کی اور ملک طوائف الملوکی کی آماجگاہ بن گیا۔

اسی عہد اختلال میں فرماں روایان اودھ کے سر سلسلہ میر محمد امین سعادت خاں برہان الملک تخت تیموری کے حاشیہ نشینان بساط میں شامل ہوئے اور درباری رقابت، جوڑ توڑ اور سازش و سفارش کی بساط کا مہرہ بنے۔ جب اس بازیچے کی داستان قلم بند ہونے لگی تو ہر مؤرخ نے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق رنگ آمیزی کی اور سب درباریوں کی طرح سیاہی کے دھبّے برہان الملک کے بھی دامن بلکہ چہرے تک پہونچے۔ رہی سہی کسر ان کی ایرانیت نے پوری کی جو ملک کے ایک بڑے طبقے کے لئے پہلے ہی سے ناپسندیدہ عنصر تھی۔ نادر شاہی سفاکیوں نے اور بھی کڑوے کریلے کو نیم چڑھا دیا ''سادات بادشاہ گر'' کے زوال نے اور بھی آگ میں ایندھن مہیّا کیا۔

یہی حالات تھے جنھوں نے انگریزوں کو من مانی تاریخ ڈھالنے کا سانچہ دیا اور اس سانچے سے اودھ کے ہر فرمان روا کا ایسا مجسمہ ڈھل کے نکلا جس سے زیادہ مکروہ و مسخ صورت کا تصوّر نہیں کیا جا سکتا۔

امجد علی شاہ کے زمانے تک انگریز ہندوستان میں اپنی جڑیں کافی گہری کر چکے تھے۔ اودھ پر بھی تقریباً تسلط کامل حاصل کر چکے تھے، اسی کے ساتھ امجد علی شاہ نے حکومت کو منہاج شریعت پر لانے کی مخلصانہ سعی کی اسی لئے وہ جانبدارانہ تاریخ نویسی کا خاص نشانہ بنے اور اس مہم میں بدیسیوں کو دیسیوں کی بھی اچھی حمایت ملی۔ تاریخ کے اس مصنوعی دھارے میں ان کا وجود ایک بے عمل ملّا اور ناکارہ بادشاہ کی حیثیت سے بہتا ہوا نظر آتا ہے۔ ان کا

کردار تاریخ کی گراں قیمت ودیعت بن جاتا اگر ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ہندوستانی عوام خصوصاً اودھ واسی عوام نے حب وطن اور جوش عمل کے زور سے اس صورت گری کی حقیقت کو عالم آشکار نہ کر دیا ہوتا اور تب محبان وطن کے ایک گروہ نے اس جہاد حرّیت کے بعد تاریخ کی نظر ثانی کا کام شروع کیا اور اب اس موضوع پر اچھا مواد جمع ہو چکا ہے۔ یہ طمانیت کی بات ہے کہ ہندوستان کی معروضی تاریخ نویسی کی ضرورت کا احساس بڑھ رہا ہے لیکن پھر بھی ایک ایسا حلقہ اب بھی موجود ہے جس کی عصبیت کو فرماں روایان اودھ کی مسخ صورت ہی دیکھ کے تسکین ہوتی ہے اور وہ راست بینی کی راہ میں اب بھی بقدر حوصلہ مزاحمت کے سامان مہیّا کرنے میں مشغول ہے۔

پیش نظر اوراق اس مزاحمت کی نشان دہی کی ایک ناچیز اور طالب علمانہ کوشش ہیں اور اسے اسی نقطۂ نظر سے ملاحظہ فرمانا چاہیے۔ دراصل مدرسہ سلطانیہ لکھنؤ کے دورِاوّل کی تاریخ پر راقم نے کچھ مضمون ماہنامہ الواعظ لکھنؤ میں تحریر کئے تھے۔ مدرسہ سلطانیہ کے بانی کی حیثیت سے امجد علی شاہ پر جو مضمون لکھا تھا یہ اوراق اُسی کا توسعہ ہیں۔ امجد علی شاہ کے دور کو امین الدولہ امداد حسین خاں وزیر اعظم اور سلطان العلماء سیّد محمد مجتہد العصر کے حالات کے مطالعے کے بغیر سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔ امین الدولہ کا ذکر تو الواعظ کے مضمون میں بھی کیا گیا تھا مگر اس کتاب میں سلطان العلماء کے ذکر خیر کا اضافہ کیا گیا ہے اور توقع ہے کہ اس طرح سے عہد امجدی کو اس کے صحیح سیاق وسباق میں دیکھنے اور سمجھنے میں مدد ملے گی۔

ایسے طالب علم کے لئے جو تعلیم گاہ سے خارج ہو چکا ہے اور ایسے مقام پر قیام پذیر ہے جو اب قصبانیت کی حدیں پار کر کے شہریت کے میدان میں دھیمی رفتار سے قدم اٹھا رہا ہے، یہ کام کس درجہ صبر آزما تھا اس کا احساس انہیں حضرات کو ہو سکتا ہے جو قصباتی زندگی کی کیفیت کے رمز شناس ہیں۔ یہ جملہ معترضہ محض اس لئے ہے کہ آپ ان لوگوں کی غیر معمولی حد تک طویل فہرست دیکھ کے گھبرائیں نہیں جن کے فریضہ شکر گزاری سے مجھے عہدہ برآ ہونا ہے۔ میں قارئین گرامی کی بدمزگی کے اندیشے کو نظر انداز نہ کرتا مگر کیا کروں

کہ مَنۡ لَمۡ یَشۡکُرِ اَلنَّاسَ لَمۡ یَشۡکُرِ اَللّٰہَ کے فرمان سے سرتابی کی جرأت نہیں ہوتی اور آپ میرے اور سب تقصیروں کے ساتھ اسے بھی ذیل عفو میں جگہ دیں۔

میں ممنون ہوں مولانا محمد شاکر نقوی اور جناب مولانا حمید الحسن صاحب پرنسپل جامعہ ناظمیہ کا، جن کا اصرار اس سلسلۂ مضامین کی تحریر کا فوری محرک ہوا، جس کے ایک مضمون کی یہ مفصل ومبسوط صورت ہے۔ ذمہ داران مدرستہ الواعظین اور مدیران الواعظ مولانا مسرور حسن صاحب اور مولانا ابن حسن املوی کا جن کی کریم النفسی سے میں نے الواعظ کے صفحات کا آزادی سے استعمال کیا۔ نگران ادارۂ الواعظ الحاج مولانا سعادت حسین خاں صاحب نے ان مضامین میں ذاتی دلچسپی لی اور مصادر جمع کرنے میں مدد دی۔ مولانا الحاج سید کلب عابد صاحب قبلہ ناظم شیعہ دینیات مسلم یونیورسٹی، مولانا الدکتور سید شبیہ الحسن صاحب نونہروی صدر و پروفیسر شعبۂ اُردو لکھنؤ یونیورسٹی، الحاج چودھری سید علی محمد صاحب زیدی ردولوی، راجہ سیّد احمد مہدی صاحب آف پیر پور، جناب سیّد محمد رشید صاحب نزیل لکھنؤ، الحاج راجہ سیّد بادشاہ حسین و سید شہنشاہ حسین صاحبان آف لور پور، ان حضرات میں ہیں جن کے ذخیرۂ کتب کا میں نے پُوری آزادی سے استعمال کیا اور ان حضرات کی ہمّت افزائی اور اظہار دلچسپی نے بڑی مدد کی۔ مولانا کلب عابد صاحب قبلہ نے بعض مصادر کے اقتباس مہیا فرمائے اور عربی عبارتوں کے لئے کتب خانہ ناصریہ لکھنؤ، کتب خانہ وثیقہ عربی کالج فیض آباد، کتب خانہ بڑی سرکار اور ذخیرہ عابد رضا صاحب (جج) مرحوم زید پور لوہیا یادگار پستکالے اکبر پور، ذخیرۂ پیش نماز منزل فیض آباد، کتاب فروشی دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ سے بھی فائدہ اٹھایا ہے، ان کے ذمہ داروں اور کارکنوں کا اظہار تشکر میرا فرض ہے۔

میری مادر علمی مدرسہ سلطانیہ کے اساتذہ اور طلباء میں مولانا محمد مہدی صاحب قبلہ زید پوری، استاذی مولانا الطاف حیدر صاحب قبلہ، مولوی محمد اصغر صاحب، مولوی شفیق حسین صاحب، مولوی نیاز حیدر صاحب سے بڑی مدد ملی۔ مولوی نیاز حیدر صاحب کی معرفت تاریخ سلطان العلماء مصنفۂ لسان الملۃ زبدۃ العلماء مولانا آغا مہدی صاحب کا نسخہ ذوالفقار حیدر

صاحب ترمذی سے ملا۔ یہ نسخہ غالباً لکھنؤ میں اس پاکستانی کتاب کا واحد نسخہ ہے جس سے میں نے استفادہ کیا۔ ترمذی صاحب کی کشادہ قلبی لائق اعتراف وتشکر ہے۔

نواب صادق حسین صاحب متولی وقف کربلائے امین الدولہ بہادر بھی میرے شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے دلچسپی کے ساتھ امین الدولہ کے بارے میں بعض اطلاعات بہم پہونچائے اور ان کی تصویر مہیا کی۔ امجد علی شاہ بہادر کی تصویر جناب سکندر رضا صاحب (اودھ کلچرل کلب) لکھنؤ کے کرم سے ملی۔ میں نواب امجد علی خاں صاحب مصنف تاجدار اودھ کے تعاون کا بھی معترف ہوں.

ادبستان لکھنؤ کے بزرگوں اور دوستوں سے مختلف طرح کی مدد ملی میں اس کا احسان مندی کے ساتھ اعتراف کرتا ہوں۔ میں اردو اکادمی یوپی کے سکریٹری صباح الدین عمر صاحب کے اظہار التفات کا ممنون ہوں۔

میرے اپنے اقرباء، خوردوں اور بچوں نے یا ان لوگوں نے جو اس زمرے میں شامل سمجھے جاتے ہیں جو مدد کی ہے اس کی تفصیل میں بڑی طوالت ہے، مگر ان کی زحمتوں کا مطالبہ ہے کہ میں ان کا اعتراف قلم بند کروں۔ یہ نام ہیں خواہر محترمہ بیگم رضوی و برادر محترم سید محمد انیس رضوی صاحب، برادرم سید حسین احمد ایڈوکیٹ، برادرم ڈاکٹر جوگیندر پال سوریہ، برادرم ہریش چندر سنگھ ایڈوکیٹ اکبر پور، برادرم سیّد اقبال حسن عابدی و بیگم صفیہ حسن، عزیزی مختار عباس، عابس محمد عسکری، عروج رضوی، رضوانہ نقوی، کاظم مہدی نقوی، اولاد حسین رضوی، ملا غلام یوسف قریشی، میں ان سب کے لئے شکر گزاری کا اظہار کرتا ہوں۔ کتابت جن صاحب کے سپرد تھی وہ بھی میرے اپنے تھے لیکن ان کا کمال آپ آیندہ صفحات میں ملاحظہ کریں گے، کرم کی تفصیل کیا عرض کروں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ صائب کے شعر کا مطلب اب سمجھ میں آیا۔

ہرگزاز چنگیز خان بر عالم صورت نه رفت
آنچه زدست کاتبان بر عالم معنی گزشت

پھر بھی مولوی شوکت حسین صاحب، برادرم شہید صفی پوری صاحب اور عزیزم سید محمد بسملؔ جائسی نے آخر میں جو مدد کی وہ یقیناً لایق شکر ہے۔ میں جناب ساغرؔ لکھنوی اور توقیر حسین صاحب لور پوری کا بھی شکر گزار ہوں۔ کام کی بڑی بھیڑ اور تنگ وقت میں کتاب کی طباعت میں سید انصار حسین صاحب ماہلی منیجر سرفراز قومی پریس لکھنؤ نے جو زحمت اٹھائی ہے وہ بھی یادگار ہے۔ میں مولوی عبدالقیوم خاں ایم اے، بابا پرنٹیکو پریس اور آصف مرزا صاحب آرٹسٹ کا بھی ممنون ہوں۔ اگر یادداشت کی خطا سے کسی محسن یا مددگار کا نام رہ گیا ہے تو اس کے لئے معذرت کرتا ہوں۔ خداوند کریم ان سب حضرات کو جزائے خیر دے۔

سبطِ محمد نقوی
اکبر پور، فیض آباد (اودھ)
۲/دسمبر ۱۹۷۶ عید الاضحیٰ ۱۳۹۶

# مقدمہ

کتاب ''امجد علی شاہ'' معروف ادیب اور ناقد چودھری سبط محمد نقوی کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے جس میں انہوں نے امجد علی شاہ اور ان کے عہد کا عالمانہ اور ناقدانہ تجزیہ پیش کیا ہے۔ اس سے پہلے انہوں نے صوبۂ اودھ کی اجمالی تاریخ بھی قلم بند کی ہے اور برہان الملک نواب سعادت علی خاں سے لے کر محمد علی شاہ کے عہد تک کا مختصر مگر جامع خاکہ کھینچا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ صوبۂ اودھ میں کیسے کیسے سیاسی انقلابات رونما ہوئے اور ایک صوبے کو سلطنت میں بدلنے کے لئے کتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ چودھری صاحب نے نوابین اودھ پر عائد الزامات پر کسی بحث اور تنقید کے بجائے ان سے صرف نظر کو بہتر سمجھا ہے کیونکہ ان تمام الزامات کا شاخسانہ انگریزوں نے تیار کیا تھا، البتہ جہاں ان الزامات کی تردید کو ضروری سمجھا وہاں تاریخی شواہد کی روشنی میں بھرپور زورِ قلم دکھلایا ہے۔ امجد علی شاہ کے عہد کو بیان کرنے سے پہلے چودھری صاحب نے اودھ کے نوابوں اور بادشاہوں کی سیاسی، سماجی اور خانگی زندگی کو قلم بند کیا ہے تاکہ یہ باور کرایا جاسکے کہ آخر امجد علی شاہ ان سب سے کس طرح ممتاز اور منفرد تھے۔ چونکہ انہوں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ امجد علی شاہ اودھ کے متشرع بادشاہ تھے، لہٰذا اپنے دعوے کے دلائل کے طور پر انہوں نے تاریخی شواہد پیش کئے ہیں اور ثابت کیا ہے کہ امجد علی شاہ سے پہلے نوابوں اور بادشاہوں کی اخلاقی، سماجی اور خانگی زندگیاں کس طرح بسر ہو رہی تھیں۔ اگر صوبۂ اودھ میں حضرت غفران مآبؒ جلوہ گر نہ ہوتے تو خطۂ اودھ میں سیاسی، سماجی اور مذہبی انقلاب رونما نہیں ہوتا۔ ان کے بعد سلطان العلما سید محمدؒ، سید العلما سید حسینؒ اور ان کے شاگردوں نے اودھ

کو علم و اجتہاد کا عظیم مرکز بنادیا جس کی بنیاد پر بیت السلطنت کی تہذیب میں بھی تبدیلی رونما ہوئی۔ اس تبدیلی کا اثر نوابوں اور بادشاہوں پر بھی مرتب ہوا اور محمد علی شاہ کا عہد آتے آتے اودھ میں سماجی بدلاؤ کے ساتھ دربار میں بھی برقی تبدیلیاں رونما ہونے لگی تھیں۔ چونکہ امجد علی شاہ کی والدہ بذات خود متشرع خاتون تھیں اس لئے ان کی آغوش تربیت میں پرورش پانے والے بچے کا مذہب سے جڑاؤ لازمی تھا۔ اس عہد کا سب سے بڑا کارنامہ حکومت اودھ کا فقہ امامیہ کے مطابق ڈھل جانا تھا، جس کا سہرا امجد علی شاہ اور سلطان العلما سید محمد رضوان مآبؒ کے سر بندھتا ہے۔ اگر امجد علی شاہ نے سلطان العلما کے سامنے حکومت کو شریعت محمدیؐ کے مطابق چلانے کا مطالبہ نہ رکھا ہوتا تو شاید ہم اس تاریخی فیصلے سے کبھی روبرو نہیں ہوتے اور تاریخ ہندوستان میں 'مرافعۂ شرعیہ' کا محکمہ کبھی قائم نہیں ہوتا۔

اس سے پہلے کہ ہم امجد علی شاہ کے عہد اور حکومت شرعیہ کی اہمیت اور افادیت پر گفتگو کریں، بہتر ہوگا کہ ان سے پہلے اودھ کی مجموعی صورت حال کا جائزہ پیش کیا جائے تا کہ یہ معلوم ہو سکے کہ امجد علی شاہ سے پہلے نوابین اودھ کی اخلاقی، سماجی، سیاسی اور خانگی صورتحال کیا تھی۔ ایسا نہیں ہے کہ نوابین اودھ سلاطین دہلی کے مذاق سے الگ تھے بلکہ وہ ان کے زیر سایہ پروان چڑھے تھے اس لئے ان کے مذاق کا اثر نوابوں پر بھی ہوا اور جو انسانی کمزوریاں اور خامیاں سلاطین دہلی میں موجود تھیں، اودھ کے نواب بھی ان سے مبرّا نہیں تھے۔ بہرکیف! ہم پہلے برہان الملک اور صوبۂ اودھ میں ان کی تقرری کا جائزہ لیتے ہیں۔

## برہان الملک اور صوبۂ اودھ

برہان الملک سید محمد امین موسوی نیشاپوری اودھ کے پہلے منتظم اور صوبے دار تھے۔ ان کے حسن انتظام کی بنیاد پر دہلی سلطنت نے اودھ کے لئے ان سے بہتر منتظم اور مدبر کسی کو نہیں جانا۔ آخر عمر تک وہ صوبۂ اودھ میں دہلی سلطنت کے نائب کی حیثیت سے رہے اور اس کی آمدنی میں خوب اضافہ کیا۔

سید محمد امین نیشاپوری ۱۱۲۰ھ مطابق ۱۷۰۸ء میں ہندوستان آئے۔ پہلے سربلند خاں کے میر منزل ہوئے۔ ترقی کرتے ہوئے قطب الملک کے توسط سے شہزادوں کی جاگیر کا ٹھیکہ ملا۔ اسی دوران سعادت خان کے خطاب اور ہنڈون اور بیانیہ کی فوج داری سے سرفراز ہوئے۔ ۱۷۲۰ء میں اپنے محسن اور مربی قطب الملک کے خلاف سازشی تحریک میں شریک ہوئے اور بیانہ میں قطب الملک کے بھائی امیر الامرا سید حسین علی کا قتل کر دیا۔ اس واقعہ کے بعد جب بادشاہ نے عارضی دربار منعقد کر کے سادات کے قاتلوں کو انعامات تقسیم کئے، اس وقت سعادت خاں کو پانچ ہزار سواروں کا منصب عطا ہوا۔ ڈاکٹر صفدر حسین برہان الملک کے اس اقدام کی سخت مذمت کرتے ہیں اور انہیں دغاباز اور نمک حرام قرار دیتے ہیں۔[۱] جبکہ صفدر حسین ان حقائق کو چھپا لیتے ہیں جن کی بنیاد پر حسین علی کا قتل کیا گیا تھا۔

وزیر السلطنت محمد امین کے انتقال کے بعد بادشاہ نے انہیں آگرہ کی گورنری دیدی۔ اس کے تقریباً دو سالوں کے بعد آگرہ کے ساتھ اودھ کی صوبہ داری بھی مل گئی لیکن کچھ عرصے کے بعد آگرہ کی صوبیداری واپس لے لی گئی اور وہ صرف اودھ کے صوبیدار مقرر ہوئے۔ اس وقت اودھ پانچ سرکاروں پر مشتمل تھا جن میں حویلی اودھ، گورکھپور، بہرائچ، لکھنؤ اور خیر آباد شامل تھے۔ اس صوبے کی آمدنی ستّر لاکھ کے قریب تھی جو سعادت خاں کے انتظام سے دو کروڑ سالانہ تک پہونچ گئی۔ سعادت خاں نے جب اودھ کا انتظام سنبھالا اس وقت ملک میں نیم آزاد جاگیرداری نظام رائج تھا۔ بڑے اور چھوٹے زمینداروں نے دورافتادہ دیہاتوں میں اپنی گڑھیاں بنا رکھیں تھیں جہاں وہ اپنی حفاظت کے لئے فوجی ساز و سامان جمع رکھتے تھے۔ لہٰذا سعادت خاں نے انہیں زیر کرنے کے لئے پہلے لکھنؤ کے امراء، خاص طور پر شیخوں کے حوصلے پست کئے اور انہیں ٹھکانے لگایا۔ لکھنؤ ان کے زیر نگیں آیا تو دیگر علاقوں پر بھی ان کا رعب چھا گیا اور رفتہ رفتہ تمام علاقے ان کے

---

[۱] لکھنؤ کی تہذیبی میراث۔ ص ۴۳

زیر تصرف آ گئے۔صفدر حسین لکھتے ہیں:

''جب برہان الملک اس صوبے میں داخل ہوئے تو انہیں سب سے پہلے لکھنؤ کے شورہ پُشت امراء کو زیر کرنا تھا اور اس کے بعد مضافات میں بیسواڑہ ،بلرام پور،تلوئی، پرتاب گڑھ، گونڈہ اور رسول پور وغیرہ کے سرکش زمیں داروں کو فرماں بردار بنانا تھا۔ انھوں نے پہلے لکھنؤ پر توجہ دی۔یہاں اکبر کے عہد سے شیخ عبدالرحیم بجنوری کی نسل آباد چلی آ رہی تھی ،ان شیخ زادوں نے لکھنؤ میں پانچ محل بنا رکھے تھے جن کو 'پنچ محلہ' کہتے تھے۔اس وقت لکھنؤ کا شہر اور اس کے مضافات انہیں شیخ زادوں کی ملکیت تھے اور ان کے حدود میں ان کی مرضی کے بغیر داخل ہونا خطرے سے خالی نہ تھا۔جب برہان الملک صوبہ دار مقرر ہو کر لکھنؤ کے لئے روانہ ہوئے تو فرخ آباد کے بنگش نواب نے انہیں صورت حال سے آگاہ کر دیا تھا۔انھوں نے گومتی کے پار قیام کر کے بڑی حکمت عملی سے قلعہ مچھی بھون حاصل کر لیا اور اس کے سامنے ہی نقار خانہ تعمیر کرایا جس میں واجد علی شاہ کے وقت تک دن میں چھ بار نوبت بجتی تھی۔''[1]

فتح لکھنؤ کی دھوم نے اودھ کے امراء، جاگیر داروں ،رئیسوں اور زمینداروں کے غرور خاک میں ملا دیئے اور وہ یکے بعد دیگرے برہان الملک کے ہاتھ پر بیعت ہو گئے۔ برہان الملک نے انتہائی دور اندیشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کی درخواستوں کو قبول کیا۔ اطاعت اور مال گذاری کی شرط پر ان کے تمام مقبوضہ علاقے ان کے سپرد کر دیئے۔جن راجاؤں اور تعلقہ داروں نے اطاعت قبول کرنے سے انکار کیا انہیں بھی بالآخر زیر ہونا پڑا۔[2]

ریاست اودھ 1722ء میں معرض وجود میں آئی جس کے پہلے نواب برہان الملک

---

[1] لکھنؤ کی تہذیبی میراث،صفدر حسین۔،۴۲

[2] نادر العصر،منشی نول کشور،ص ۵۲ تا ۵۴۔مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: سوانحات سلاطین اودھ،کمال الدین حیدر، ج ۱،ص ۵۵ تا ۶۱

سعادت خاں تھے۔ریاست اودھ دہلی حکومت کے ماتحت تھی اور انہیں بادشاہ دہلی کی طرف سے 'نواب وزیر' کا خطاب عطا ہوا تھا۔اسی بنا پر اودھ کے نوابوں کو 'نواب وزیر' کہا جاتا تھا۔1722ء میں ریاست اودھ کے قیام کے بعد اس کا پایۂ تخت فیض آباد قرار پایا۔اس ریاست میں نیپال سے لے کر لکھنؤ اور مضافات کے علاقے شامل تھے۔نواب آصف الدولہ کے عہد میں جب روہیلوں کو شکست ہوئی تو یہ ریاست روہیل کھنڈ تک پھیل گئی۔برہان الملک نواب سعادت خاں دیندار شخص تھے۔انہوں نے ہمیشہ سیاسی امور میں بھی شریعت اسلامی کی پاسداری کا خیال رکھا۔برہان الملک کو متضاد صفات کا حامل بتلایا گیا ہے۔ایک طرف جہاں وہ اعلیٰ درجے کے ناظم تھے، دوسری طرف حسن تدبیر، معاملہ فہمی اور ہمت و جواں مردی میں بھی کوئی ان کا ثانی نہیں تھا۔

برہان الملک نے اودھ کے بہتر انتظام و انصرام اور ریاستی استحکام کے لئے مرزا مقیم کو نیشا پور سے بلوا لیا اور اپنی بڑی بیٹی صدر جہاں بیگم کو ان کے ساتھ منسوب کر دیا۔انہوں نے مرزا مقیم کو دہلی دربار سے اودھ کا نائب صوبہ دار مقرر کروایا اور ابوالمنصور کا خطاب دلوایا۔اس طرح مرزا مقیم صفدر جنگ اودھ کے نائب صوبہ دار ہوئے۔برہان الملک نے تقریباً سترہ سال اودھ پر کامیابی کے ساتھ صوبہ داری کی۔ان کے عہد میں اودھ کی فوج بائیس ہزار سوار اور پچاس توپوں پر مشتمل تھی، جس کی دھاک اودھ کے اطراف و اکناف کے راجاؤں اور تعلقہ داروں پر تادم آخر جمی رہی۔برہان الملک کا انتقال ۱۷۳۵ء میں ہوا۔ان کی موت آج تک ایک معمہ ہے جسے مورخین حل نہیں کر سکے۔ان پر دلّی سلطنت سے دغابازی کے الزامات بھی عائد کئے گئے کیونکہ نادر شاہ کے حملے کے وقت انہوں نے محمد شاہ کا ساتھ نہ دے کر نادر شاہ کی حمایت کی تھی۔برہان الملک کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے خودکشی کر لی تھی، لیکن کسی مورخ نے خودکشی کے اسباب بیان نہیں کئے۔برہان الملک جیسے بہادر سے یہ بعید معلوم ہوتا ہے کہ وہ خودکشی کا راستہ اختیار کریں کیونکہ ان کی صوبہ داری دہلی سلطنت کے زیر اہتمام ہوتے ہوئے بھی آزاد تھی اور ان پر کسی طرح کا کوئی سیاسی دباؤ

نہیں تھا۔صوبۂ اودھ میں ان کا دبدبہ تادم آخر قائم رہااور نظم ونسق میں بھی کسی طرح کا خلل واقع نہیں ہوا۔اس لئے ان کی خودکشی کی بات قابل اعتبار نہیں ہے۔

برہان الملک کے انتقال کے بعداودھ کی صوبہ داری کے دودعویدار پیدا ہوئے۔ایک شیر جنگ جو برہان الملک کے بھتیجے تھے اور دوسرے ابوالمنصور مرزا مقیم جوان کے بھانجے اور داماد تھے۔چونکہ مرزا مقیم برہان الملک کے زمانے میں اودھ کے نائب صوبہ داررہ چکے تھے اوران کا تمام اثاثہ انہی کے تصرف میں تھا،اس لئے کامیابی انہی کے ہاتھ آئی۔[1]

برہان الملک کے وکیل لچھمی نرائن نے ان کی طرف سے نادرشاہ کے حضور یادداشت پیش کی اور صفدر جنگ کے حقوق کا تذکرہ کرتے ہوئے درخواست کی کہ اگر مرزا مقیم کی صوبہ داری کوقبول کرلیا جائے تو دوکروڑ روپے بطور نذر پیش کئے جائیں گے۔نادرشاہ نے یہ درخواست منظور کرلی اوراس طرح مرزا مقیم اودھ کے صوبہ دار مقرر ہوئے۔[2]

ان کے عہد تک اودھ کے سیاسی معاملات میں انگریزوں کی مداخلت نہیں تھی ،اسی بنا پر نواب صفدر جنگ نے اپنی صوبہ داری کی تائید کے لئے نادرشاہ کے حضور درخواست گذاری تھی۔ان کی صوبہ داری میں کسی کوسرکشی اور بغاوت کی جرأت نہیں ہوئی۔اودھ کے دو جاگیرداروں نے بوجوہ سر اٹھایا جن میں راجہ تلوگی اورراجہ کٹیسر شامل تھے،لیکن صفدر جنگ نے ان کی ایسی سرکوبی کی کہ ان کے بعد کسی کوسرتابی کی ہمت نہیں ہوئی۔[3] صفدر جنگ پانچ سالوں تک اودھ کے انتظام وانصرام میں مصروف رہے۔مارچ ۱۷۴۴ء میں محمد شاہ نے انہیں دہلی بلوا کر میر آتش مقرر کردیا اور کشمیر کی صوبہ داری بھی ان کے سپرد کردی، جہاں صفدر جنگ نے شیر جنگ کو اپنا نائب بنا کر روانہ کیا۔صفدر جنگ کی لیاقت اور انتظام و انصرام کی صلاحیتوں پرتبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر صفدر حسین لکھتے ہیں:

---

[1] لکھنؤ کی تہذیبی میراث،ص ۴۴

[2] تاریخ لکھنؤ،محمد باقر شمس،ص ۲۰۶

[3] لکھنؤ کی تہذیبی میراث،ص ۴۵

’’صفدر جنگ بڑے شکیل اور وجیہ آدمی تھے۔ پندرہ سال کی عمر تک انہوں نے ایران کی اعلیٰ درسگاہوں میں تعلیم پائی اور پھر اودھ پہونچ کر درباری امور کی تربیت برہان الملک سے حاصل کی تھی جن کے زیر سایہ انہوں نے اودھ میں پندرہ سال تک نیابت کا کام انجام دیا... انہوں نے بہت سے فضلاء اور علماء کی بھی قدر دانی کی۔ چنانچہ مرزا علی نقی، سید زین العابدین طباطبائی، ملک العلما مولوی فضل حسین، شیخ محمد حسن، میر غلام نبی بلگرامی، سید محمد علی اورنگ آبادی اور شاہ باسط ان کے دامن دولت سے وابستہ اور فیض یاب رہے‘‘۔[1]

صفدر جنگ علم دوست اور ادب نواز انسان تھے۔ مذہبی فرائض کے پابند اور دیندار شخص تھے۔ ان کی فیاضی اور داد و دہش مشہور تھی۔ وہ سائل کا سوال منقطع ہونے سے پہلے ہی اسے پچاس اشرفیاں عطا کر دیتے تھے۔ انہوں نے بہتیرے نادار سیّدوں کو جاگیریں عطا کیں۔ جن کی زمینیں مقامی عاملوں نے ضبط کر لی تھیں انہیں ان کی املاک واپس کر دیں۔ مستحقین اور ضرورت مندوں کے وظائف مقرر کئے۔ ان کی طبیعت میں مذہبی اور مسلکی تعصب کے لئے جا نہیں تھی۔ ہندوؤں کے ساتھ بھی ان کا سلوک انتہائی مشفقانہ تھا۔ انہوں نے راجہ نول رائے کو اپنے نائب کی حیثیت سے اودھ میں مقرر رکھا۔ زمیں دار گیر گوشائیں ان کا سپہ سالار تھا۔ راجہ رام نرائن دیوان تھا اور راجہ لچھمی نرائن ان کی طرف سے دہلی دربار میں وکیل تھا۔ البتہ شان و شوکت عزیز تھی۔ طبیعتاً شاہ خرچ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے شجاع الدولہ کی شادی پر چھیالیس لاکھ سے زیادہ روپیہ پانی کی طرح بہا دیا۔[2]

نواب صفدر جنگ کی وفات کے بعد ان کے صاحب زادے مرزا جلال الدین حیدر، شجاع الدولہ کے خطاب کے ساتھ تخت نشین ہوئے۔ اس وقت ان کی عمر چوبیس سال

---

[1] لکھنؤ کی تہذیبی میراث۔ ص ۴۶

[2] سوانحات سلاطین اودھ، کمال الدین حیدر ج ۱، ص ۶۸

تھی۔شجاع الدولہ مدبر سیاست مدار، دلیر جنگجو اور فارغ البال طبیعت کے مالک تھے۔ فراغت کے دنوں میں وہ لکھنؤ میں سیر وشکار کے مشغلوں، حرم سرا کی دلچسپیوں اور مختلف تفریحوں میں محو رہتے لیکن اس دوران بھی وہ فوجی سرگرمیوں سے تغافل نہیں برتتے تھے۔[۱] عین جوانی اور سرخوشی کے عالم میں انہوں نے بنارس کے راجہ بلونت سنگھ کی بغاوت کو کچلا اور ۱۷۵۹ء میں مرہٹہ سردار گووند پنتھ کو چاند پور کے مقام پر عبرت ناک شکست دی۔ احمد شاہ ابدالی کے ہندوستان پر حملے کے وقت وہ پانی پت میں ابدالی سے جاملے اور مرہٹوں کی فوجی تنظیم پر کاری ضرب لگائی۔اس فتح کے بعد ابدالی نے انہیں دہلی سلطنت کا وزیر مقرر کر دیا اور تب 'نواب وزیر' کی حیثیت سے شجاع الدولہ کی نئی سیاسی زندگی کا آغاز ہوا۔ اس سے پہلے اودھ میں تمام نواب صوبہ دار کی حیثیت رکھتے تھے لیکن ابدالی کے حملے کے بعد اودھ میں 'نواب وزیر' ہونے لگے اور ان کے اختیارات میں بھی اضافہ ہوا۔شجاع الدولہ کے عہد میں انگریزوں کی عمل داری روز افزوں فروغ پارہی تھی، اس لئے انہوں نے انگریزوں کے خلاف لڑنے کے لئے کمر کسی۔لیکن عظیم آباد اور بکسر کی لڑائیوں میں انہیں شکست ملی جس کے بعد وہ بریلی اور فرخ آباد کی طرف چلے گئے۔وہاں پہونچ کر انہوں نے مرہٹوں سے مدد طلب کی اور ایک بار پھر کوڑہ جہان آباد کے مقام پر انگریزوں سے مقابلہ ہوا مگر فتح سے محروم رہے۔شکست کے بعد شجاع الدولہ انگریزوں سے معاہدہ کرنے پر مجبور ہو گئے جس کے بعد اودھ پر انگریزوں کی عمل داری کا آغاز ہوا۔۱۶/اگست ۱۷۶۵ء کو الٰہ آباد کا صلح نامہ مرتب ہوا جس کی رو سے یہ طے پایا کہ بیرونی حملوں کی صورت میں دونوں ایک دوسرے کی کمک کریں گے۔اس عہد نامے پر دستخط کے بعد انگریزوں نے اودھ کا علاقہ شجاع الدولہ کو واپس کر دیا۔البتہ کوڑہ شاہجہان آباد اور الٰہ آباد کے علاقے شاہ عالم کو سونپ دیئے گئے۔والیٔ بنارس راجہ بلونت سنگھ کی جاگیر اس شرط پر بحال رکھی گئی

---

[۱] لکھنؤ کی تہذیبی میراث۔ص ۴۷

کہ وہ شجاع الدولہ کو ٹیکس ادا کرتے رہیں۔ کمپنی نے شجاع الدولہ پر پچاس لاکھ روپیہ کا تاوان جنگ عائد کیا اور یہ طے پایا کہ رقم کی ادائیگی تک چنار گڑھ کا علاقہ کمپنی کے قبضے میں رہے۔ شجاع الدولہ کے پاس صلح نامہ کے شرائط پر دستخط کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا، اس لئے انہوں نے انگریزوں کے تمام شرائط تسلیم کر لئے۔ مورخین نے یہ بھی تحریر کیا ہے کہ شجاع الدولہ کو شکست کا یقین تھا اس لئے انہوں نے اپنے فرانسسی دوست مونسیور چینتل کو صلح کی سفارش کے لئے جنرل کارنیک کے پاس بھیج دیا تھا اور اس نے جنرل کو شجاع الدولہ کے حق میں صلح کے لئے رضامند بھی کر لیا تھا۔[1] چونکہ انگریز بھی شجاع الدولہ سے لڑنا نہیں چاہتے تھے اس لئے معاہدہ کی راہیں مزید استوار ہو گئیں۔ اس وقت کمپنی بہار، بنگال اور اڑیسہ کے نظم و نسق میں الجھی ہوئی تھی اس لئے وہ کسی نئے علاقے کی فتح میں دلچسپی نہیں رکھتی تھی۔ کمپنی چاہتی تھی کہ شجاع الدولہ کو اپنا ہم نوا اور حامی بنا کر شمال کی طرف سے ہونے والے حملوں کا سدّباب کرے، اس لئے جنرل کارنیک کو صلح کی پیشکش مناسب معلوم ہوئی۔ اس پر شجاع الدولہ نے بلا شرط خود کو جنرل کارنیک کے حوالے کر دیا تو کمپنی کو اپنے مقاصد کی حصولیابی مزید آسان نظر آئی۔ صلح نامہ کے شرائط میں شجاع الدولہ کے سیاسی اور سماجی وقار کو ملحوظ رکھا گیا اور کوئی ایسی شق معاہدے میں شامل نہیں تھی جس کی رو سے شجاع الدولہ کو شکست خوردہ ظاہر کیا جائے۔ لیکن معاہدے کے نفاذ کے بعد انگریزوں کی روز افزوں مداخلت نے صلح نامہ کے شرائط کو پس پشت ڈال دیا، اس کے باوجود شجاع الدولہ مناسب حکمت عملی کے ذریعہ اپنے سیاسی وقار اور سماجی ساکھ کا تحفظ کرتے رہے۔ ان کے عہد تک انگریز امور سلطنت میں مداخلت سے گریزاں رہے کیونکہ ان کے مطابق شجاع الدولہ متکبر انسان تھے جو ہر کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ بقول ڈاکٹر سریواستوا:

''اسی تمکنت اور متکبرانہ مزاج نے انہیں تباہی سے بچا لیا ورنہ میر جعفر، میر قاسم اور شاہ عالم

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: تاریخ لکھنؤ، محمد باقر شمس۔ ص ۲۴۷ تا ۲۵۰

کی طرح ان کا حشر بھی خراب ہوتا۔''[۱]

شجاع الدولہ کی طبیعت مذہب کی طرف زیادہ راغب نہیں تھی۔ البتہ ماہ محرم الحرام میں عزائے سید الشہداؑ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ ان کے عہد میں شیعوں اور سنیوں میں کوئی تفریق نہیں تھی۔ تمام مذہبی اور سماجی رسومات مشترکہ طور پر ادا ہوتی تھیں۔ حتیٰ کہ محرم الحرام بھی صوفیا کی طرز پر منایا جاتا تھا جس میں شیعی امتیاز موجود نہیں تھا۔ شجاع الدولہ طبعی طور پر حسن پرست اور محفل عیش وطرب کے آدمی تھے۔ قوت وطاقت اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ دونوں ہاتھوں سے گوسفند کا کلہ چیر ڈالتے تھے۔ ان پر امرد پرستی کے الزامات بھی عائد کئے گئے لیکن اس میں کوئی حقیقت نہیں ہے۔ چودھری سبط محمد نقوی اور محمد باقر شمسؔ نے ان الزامات کو لائق اعتنا نہیں سمجھا۔ البتہ شمسؔ نے لکھا ہے کہ: ''طوائفوں سے دلچسپی میں وہ سلاطین دہلی کے ہم مذاق تھے''۔[۲]

شجاع الدولہ کے بعد ان کے بڑے بیٹے مرزا امانی، آصف الدولہ کے خطاب کے ساتھ تخت نشین ہوئے۔ آصف الدولہ کو برسر اقتدار لانے میں انگریزوں کا بہت دخل تھا اس لئے وہ تاعمر ان کے مرہون احسان رہے۔ ان کی تخت نشینی کے بعد امور ریاست میں انگریزوں کا عمل دخل زیادہ ہوا، حتیٰ کہ تمام حکومتی معاملات انگریزوں کی صواب دید کے مطابق طے پاتے تھے۔ ان کے بھائی مرزا سعادت علی خاں جو شجاع الدولہ کی زندگی میں خیرآباد کے ناظم اور بریلی کے صوبہ دار رہ چکے تھے، زیادہ لائق و فائق انسان تھے مگر انگریزوں نے اقتدار کے حصول میں آصف الدولہ کی مدد کی، جس کے نتیجے میں وہ تخت پر متمکن ہوئے۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ آصف الدولہ بہو بیگم کے بطن سے تھے جو شجاع الدولہ کی محبوب زوجہ تھیں، ان کی ایما پر ہی شجاع الدولہ نے گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز کو خط لکھ کر آصف الدولہ کو اپنا جانشین تجویز کیا تھا، اس خط میں گورنر جنرل کو یقین دہانی کرائی گئی تھی کہ

---

[۱] بحوالہ لکھنؤ کی تہذیبی میراث۔ ص ۵۲

[۲] تاریخ لکھنؤ، محمد باقر شمس ص ۲۳۲ اور ۲۵۸ و ۲۶۸

اگر کمپنی کا رویّہ ٹھیک رہا تو آصف الدولہ ہمیشہ ان کے خیر خواہ اور مخلص رہیں گے۔[۱] انگریزوں نے شجاع الدولہ کے خط کو کوئی اہمیت نہیں دی اور پرانا معاہدہ یکسر مسترد کرتے ہوئے نئی شرائط کے ساتھ مسند اقتدار آصف الدولہ کے حوالے کر دی۔ صلح نامۂ الہٰ آباد میں انگریزوں اور نوابوں کے درمیان مساواتی نظریہ استوار تھا جسے انگریزوں نے ختم کر کے اپنی بالادستی کا اعلان کر دیا۔

آصف الدولہ تعلیم یافتہ نہیں تھے۔ ابتدائے جوانی میں ان کی طبیعت کبھی علم و ادب کی طرف مائل نہیں رہی۔ تخت نشینی کے بعد بھی وہ علم و ادب کی پرورش اور فروغ کی طرف زیادہ متوجہ نہیں ہوئے، ان کی عمر کا بیشتر حصہ انگریزوں کی خاطر نوازی میں صرف ہوا۔ حکومتی معاملات کی باگ ڈور مختار الدولہ مرتضیٰ خاں کو سونپ دی تھی، جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کی اجازت کے بغیر کوئی نواب سے ملاقات نہیں کر سکتا تھا۔ نواب کو اپنے وزیروں اور مشیروں پر اعتبار نہیں تھا اس لئے وہ تمام احکامات بذات خود صادر کرتے، اس بنیاد پر ان کے مخلص افراد بھی ان سے برگشتہ ہو گئے۔ اکثر انگریزوں سے جا ملے اور بعض جو انگریزوں کی ایما پر ان کے دربار میں موجود تھے، ہمیشہ نواب کو کمپنی کی وفاداری پر مائل کرتے رہتے۔ شجاع الدولہ اور ماں بہو بیگم ہمیشہ ان کے بدتر ہم نشینوں اور غلط صحبتوں سے نالاں رہے۔ اس بارے میں کئی بار نواب اور ان کی والدہ کے درمیان اختلاف بھی ہوا۔ اس پر یہ کہ نواب نشے کی لت کا شکار تھے اور اس لت نے انہیں تباہ کر دیا تھا۔ شمسؔ نے لکھا ہے کہ ان کے مزاج میں کھلنڈرا پن تھا۔ جانوروں کی شادیوں کا شوق تھا۔ ہاتھی کی شادی ہتھنی سے کی تو برات میں دو سو ہاتھی شامل تھے۔ بسنت اور ہولی کا جشن مناتے اور لاکھوں روپیہ خزانہ سے صرف ہوتا۔ ہر سال سید سالار مسعود غازی کا عرس دیکھنے بہرائچ تشریف لے جاتے۔ سفر میں خادموں کی فوج اور طوائفوں کی ٹولیاں ہمراہ ہوتیں۔ چھ لاکھ

---

[۱] لکھنؤ کی تہذیبی میراث۔ ص ۵۸

روپیہ سالانہ اس پر صرف ہوتا تھا۔ رقص و سرود کی محفلوں کا بھی انہیں بے حد شوق تھا۔ پانچ سو گانے والیاں صرف آصف الدولہ کے محل میں تھیں۔[۱] وہ تو بھلا ہو آیت اللہ سید دلدار علی غفران مآبؒ کا جن کے پند و نصائح کی بنیاد پر نواب نے تعیش پرستانہ مزاج سے توبہ کی اور غلط صحبتوں کو ترک کر کے مکتب امامیہ کی ترویج و اشاعت کی طرف توجہ کی۔ لکھنؤ منتقلی سے پہلے نواب آصف الدولہ بہ حیثیت فرماں روا کے کوئی اثر نہیں چھوڑ سکے اور اپنے اوقات کا بیشتر حصہ انگریزوں کی مصاحبت اور عامیانہ صحبتوں میں گذارتا تھا۔ بہو بیگم سے اختلاف کے بعد جب انہوں نے لکھنؤ کو اپنا مستقر بنایا تو ان کی طبیعت فرماں روائی اور رفاہی امور کی طرف ملتفت ہوئی۔ نواب کی خوش قسمتی تھی کہ انہیں حسن رضا خاں کی شکل میں ایک اچھا وزیر ملا جس نے انہیں علم و ادب کی طرف متوجہ کیا اور پہلی بار نواب کو خراب صحبتوں سے نکال کر علماء کی مجلسوں میں لے کر آئے۔ حضرت غفران مآبؒ جو حسن رضا خاں کی کوٹھی میں درس و تدریس اور پند و نصائح کی محفلیں گرم کئے رہتے تھے، پہلی بار نواب آصف الدولہ ان کی محفل میں شریک ہوئے۔ انہیں معلوم تھا کہ نواب کو بھنگ کی لت ہے اس لئے اس دن پوری تقریر حرمت سکرات پر کی، جس کا اثر یہ ہوا کہ نواب نے سر بزم نشے کی لت سے استغفار کیا اور تاحیات نشے کو ہاتھ نہیں لگایا۔ اس کے بعد نواب علم و ادب کی ترقی اور رفاہی امور کی طرف زیادہ متوجہ ہوئے اور لکھنؤ مختلف علوم و فنون کا گہوارہ بن گیا۔ پہلی بار ہندوستان کے گوشہ و کنار سے علما، افاضل، ادباء اور صاحبان علم و فن لکھنؤ آنے لگے۔ آصف الدولہ کی فیاضی نے صاحبان علم و فن کو لکھنؤ کی طرف ملتفت کیا۔ ان کی داد و دہش کی بنیاد پر گوشے گوشے سے ماہرین فن اور صاحبان علم و ہنر لکھنؤ سمٹ آئے۔ اس زمانے میں لکھنؤ کی آبادی میں بے تحاشا اضافہ ہوا اور درجنوں نئے محلے آباد ہوئے جن میں رکاب گنج، امانی گنج، بھوانی گنج، عنبر گنج، تحسین گنج، خیالی گنج، وزیر گنج، توپ دروازہ، حسین الدین خان کی چھاؤنی،

---

[۱] تاریخ لکھنؤ، محمد باقر شمس ص ۲۸۲ و ۲۹۳

نوازگنج، ترمنی گنج، حسن گنج، دولت گنج، نواب گنج، کشمیری محلہ، نگریا اور نخاس جیسے محلے شامل ہیں۔

آصف الدولہ پہلے پہل انگریزوں کی مصاحبت کو فخر سمجھتے تھے کیونکہ انہیں انگریزوں کی مدد سے اقتدار ملا تھا۔لیکن جب ان کی مداخلت حد سے تجاوز کر گئی تو نواب آزردہ خاطر رہنے لگے۔کئی بار انہوں نے سلطنت سے دستبردار ہونے کا ارادہ کیا لیکن وہ اس فیصلے کے نقصانات سے اچھی طرح واقف تھے، اس لئے انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ انگریزوں کے وفادار امراء اور رؤسا کو دربار میں جگہ نہیں دیں گے۔اس بنا پر انہوں نے حیدر بیگ نائب اور ٹکیت رائے دیوان کو برطرف کر دیا۔ان کی برطرفی نے انگریزوں کو برہم کر دیا اور وہ آصف الدولہ پر ان کی بحالی کے لئے دباؤ ڈالنے لگے مگر نواب اپنے فیصلے پر ثابت قدم رہے۔بالآخر ریذیڈنٹ کی سفارش پر علامہ تفضّل حسین خان کو اپنا نائب مقرر کر لیا، کیونکہ علامہ تفضّل حسین انگریزوں کے بہی خواہ اور ان کے فرماں بردار تھے۔راجہ جھاؤ لال جو نواب کے بے حد مخلص تھے، برطرف کر کے عظیم آباد بھیج دیئے گئے، جس کا افسوس تادم آخر نواب کو رہا۔انگریزوں کی بڑھتی ہوئی مداخلت اور اپنی بے بسی سے تنگ آ کر انہوں نے غذا میں بے اعتدالی شروع کر دی جس کا اثر ان کی صحت پر بھی ہوا۔اطباء شب و روز ان کی دیکھ ریکھ میں مصروف رہتے لیکن وہ ان کے مشوروں پر عمل نہیں کرتے تھے گویا وہ اپنی زندگی سے اُوب چکے تھے۔بالآخر ۲۸ ربیع الاول ۱۲۱۲ھ مطابق ۲۱ ستمبر ۱۷۹۷ء کو انتقال ہوا اور اپنے تعمیر کردہ امام باڑے میں مدفون ہوئے۔

آصف الدولہ کا عہد گوناگوں صفات کا حامل رہا ہے۔ایک طرف جہاں لکھنؤ شعر و ادب کے مرکز میں تبدیل ہو رہا تھا وہیں دوسری طرف علم و اجتہاد کی منزلیں بھی سر کی جا رہی تھیں۔آصف الدولہ کے وزیر اعظم نواب حسن رضا خاں کی کوششوں سے شیعہ عقیدے کو درباری مذہب کی حیثیت دی گئی تھی۔حضرت غفران مآبؒ کی سعیٔ جمیلہ سے اودھ کی علمی اور عقیدتی دنیا میں انقلاب برپا ہوا تھا۔تشنگان علم و ادب دور دراز کے علاقوں سے سفر کر کے

لکھنؤ آنے لگے تھے۔ آصف الدولہ کا باب سخاوت کھلا ہوا تھا اور ہر کوئی اس سے فیضاب ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر صفدر حسین لکھتے ہیں:

''نواب آصف الدولہ اور ان کے وزیر یعنی سرفراز الدولہ حسن رضا خاں نے لکھنؤ میں شیعہ عقیدے کو درباری مذہب کی حیثیت دے دی تھی۔ عدالتوں میں بیشتر مفتی اگرچہ غازی الدین حیدر کے عہد تک علمائے اہل سنت ہی سے تھے لیکن حسن رضا خاں نے ایک شیعہ عالم مرزا محمد عسکری کو پانچ سو روپے مشاہرے پر مفتی دربار مقرر کر دیا تھا اور انہیں سے احکام شرعیہ حاصل کئے جاتے تھے۔ مولانائے موصوف شیعوں کے اخباری فرقے سے تعلق رکھتے تھے یعنی اصولی شیعہ نہیں تھے۔ اس لئے انہیں نماز جمعہ و جماعت سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ جب مولانا دلدار علی نصیرآبادی اجازۂ اجتہاد عراق سے لے کر لکھنؤ آئے تو دربار میں ان کی بہت تعظیم و تکریم ہوئی۔''[۱]

نواب آصف الدولہ نے اپنی حیات میں وزیر علی کو اپنا ولی عہد نامزد کیا اور اس کی اطلاع کمپنی کو بھی دیدی گئی تھی۔ اس لئے ان کی موت کے بعد انگریزوں نے ناخواستہ وزیر علی کو مسند نشین کر دیا۔ وزیر علی کی مسند نشینی کے وقت سعادت علی خاں لکھنؤ میں نہیں تھے، اس لئے جب انہیں اس کی اطلاع ہوئی تو وہ انگریزوں سے آزردہ خاطر ہوئے کیونکہ بیس سال پہلے گورنر جنرل نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ آصف الدولہ کے بعد انہیں تخت دیا جائے گا۔ ان کے استاد علامہ تفضّل حسین خان جو آصف الدولہ کے نائب السلطنت تھے اور ریذیڈنسی کے وفادار علما میں شمار ہوتے تھے، وزیر علی کی تخت نشینی کے حق میں نہیں تھے لیکن وہ انگریزوں کی صریحی مخالفت بھی نہیں کر سکتے تھے، کیونکہ انگریزوں نے وزیر علی کو مجبوری کے عالم میں تخت پر بٹھلایا تھا ورنہ وہ بھی اس تاج پوشی کے حامی نہیں تھے۔ چونکہ پورا اودھ اور خاص طور پر اُمرا اور رؤساء وزیر علی کی ولی عہدی سے واقف تھے اس لئے انگریزوں نے

---

[۱] لکھنؤ کی تہذیبی میراث۔ ص ۲۱۶

انہیں تخت نشین کرنے میں مصلحت جانی مگر بہت جلد انہوں نے وزیر علی کے خلاف ماحول سازی شروع کر دی۔ انہیں وزیر علی سے کوئی امید نہیں تھی کیونکہ وہ اپنے باپ کی طرح انگریزوں سے برگشتہ تھے۔ لہٰذا انگریزوں نے علامہ تفضّل حسین خان کی مدد سے یہ ہنگامہ کھڑا کر دیا کہ وزیر علی آصف الدولہ کے صلبی بیٹے نہیں بلکہ متبنیٰ ہیں۔[۱] اس پر مختلف افراد سے گواہیاں دلوائی گئیں اور بالآخر وزیر علی کو معزول کر کے ان کی جگہ سعادت علی خاں کو تخت پر بٹھا دیا گیا۔ ان کی مسند نشینی کے کچھ ماہ بعد گورنر جنرل تبدیل ہو گیا اور لارڈ ولزلی مقرر ہو کر لکھنؤ آ گئے۔ انہوں نے سعادت علی خاں کی امیدوں پر پانی پھیر دیا اور جو معاہدہ ان کے اور کمپنی کے درمیان تھا اس کے خلاف عمل شروع کر دیا۔ لارڈ ولزلی نے اودھ پر اقتدار جمانے کی ہر ممکن کوشش کی اور نواب وزیر کی فوج کم کر کے انگریزی فوج میں اضافہ کا فیصلہ کیا۔ مال گذاری کے نظام میں بھی تبدیلیاں کیں، جن سے سعادت علی خان کو یہ احساس ہوا کہ انگریز ان کے مخلص نہیں بلکہ انہیں آلۂ کار کے طور پر استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ سعادت علی خاں نے لارڈ ولزلی کی حد درجہ مداخلت سے بددل ہو کر عہدے سے دستبردار ہونے کی دھمکی دی لیکن یہ حربہ بھی کارگر ثابت نہیں ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گورنر جنرل نے نواب وزیر کے علاقے میں اس قدر فوج بڑھا دی کہ حکومت ان کے اخراجات کے زیر بار آ گئی۔ گورنر جنرل نے اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ انہوں نے نواب سے اودھ کا نصف علاقہ مانگ لیا۔ سعادت علی خاں نے ہزار دلائل پیش کئے، پرانے عہد نامے دکھلائے مگر کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ بالآخر نواب کو انگریزوں کے مطالبے کے سامنے جھکنا پڑا۔ چنانچہ ۱۰ر نومبر ۱۸۰۱ء کو بنارس میں نئے معاہدے پر دستخط ہوئے اور سعادت علی خاں کچھ نہیں کر سکے۔[۲] وزیر علی جو انگریزوں کے عمل دخل سے خوش نہیں تھے اس اثنا میں روپوش رہے اور ان کی گرفتاری کا وارنٹ جاری رہا۔ وہ کئی بار حلیہ تبدیل کر کے اپنے باپ کی قبر پر فاتحہ خوانی کے لئے بھی

---

[۱] تاریخ لکھنؤ، محمد باقر شمس۔ ص ۳۲۴ تا ۳۲۵

[۲] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: تاریخ لکھنؤ، محمد باقر شمس ص ۳۲۹ تا ۳۳۵

آئے ،جس کی شہادت تاریخوں میں ملتی ہے۔ بالآخر انہیں بھی مکروفریب کے ذریعہ گرفتار کر کے کلکتہ بھیج دیا گیا جہاں تقریباً ۳۶ سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا۔

سعادت علی خاں انگریزوں کی بڑھتی ہوئی مداخلت سے خوش نہیں تھے مگر اب معاملات ان کے دائرۂ اختیار سے نکل چکے تھے۔ ان کے دربار میں ہر طرف ریذیڈنسی کے وفادار کرسی نشین تھے جو ہر بات کی خبر ریذیڈنٹ تک پہونچا دیتے تھے۔ میجر بیلی نے تو اودھ کے انتظامی امور میں اس قدر مداخلت کی کہ سعادت علی خاں کٹھ پتلی کی طرح ناچنے لگے۔ اس نے معمولی سے معمولی کاموں میں بھی نواب کو انگریزوں سے مشاورت کا پابند بنا دیا۔ بالآخر نئے گورنر جنرل لارڈ ہیسٹنگز نے انہیں اس مصیبت سے نجات دلائی اور یہ فیصلہ سنایا کہ جب ہم نے نواب سے معاہدے کے تحت ان کا آدھا ملک لے لیا ہے تو پھر ہمیں ان کے معمولی سے معمولی کاموں میں مداخلت نہیں کرنی چاہیے۔ اس پالیسی کے نفاذ کے چھ ماہ بعد سعادت علی خاں ۱۲/ جولائی ۱۸۱۳ء مطابق ۲۴ رجب ۱۲۲۹ھ کو انتقال کر گئے۔

سعادت علی خاں کی وفات کے بعد ریذیڈنٹ کی ایما پر غازی الدین حیدر کو مسند نشین کر دیا گیا۔ جبکہ مورخین نے شمس الدولہ کو زیادہ لائق و فائق بتلایا ہے کیونکہ غازی الدین حیدر کی طبیعت لہو ولعب کی طرف مائل تھی ،جبکہ شمس الدولہ دانشمند اور صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے۔ لیکن انگریز ان کی مسند نشینی کے حامی نہیں تھے کیونکہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ جو چپقلش سعادت علی خاں کے عہد میں ظاہر ہوئی تھی ،اس میں مزید اضافہ ہو۔ اس لئے انہوں نے غازی الدین حیدر کو مسند نشین کر دیا۔ سلطان العلما سید محمد نے تاج شاہی سر پر رکھا اور پہلا حکم سادات کی تنخواہ کا قلم سے صادر ہوا۔[1] غازی الدین حیدر کو یہ یقین تھا کہ انگریز ان کے کاموں میں زیادہ مداخلت نہیں کریں گے مگر چار ماہ بعد ہی وہ ریذیڈنٹ کی مداخلت بے جا سے اُکتا گئے۔ گورنر جنرل جو نہایت زیرک اور عیار فرماں روا تھا، غازی الدین حیدر

---

[1] تاریخ لکھنؤ، محمد باقر شمس ص ۳۸۰

کی پریشانیوں سے بخوبی واقف تھا۔اس نے ریذیڈنٹ کی مداخلت ختم کرنے کی یقین دہانی کرائی لیکن اس کے عوض میں نواب سے ایک کروڑ روپیہ کمپنی کے لئے طلب کیا۔ کیونکہ برما اور نیپال میں جنگ کی وجہ سے کمپنی خسارے میں تھی۔نواب کے پاس کوئی چارۂ کار نہیں تھا لہٰذا ایک کروڑ روپے کی خطیر رقم کمپنی کو دیدی گئی۔ چند ماہ بعد پھر کمپنی کو مالی امداد کی ضرورت ہوئی اور جنگ نیپال میں کمک کے لئے گورنر جنرل نے ایک بار پھر ایک کروڑ روپیہ کی رقم طلب کی۔ جنگ کے خاتمے کے بعد کمپنی نے ناقابل کاشت علاقہ نواب کو قرضے کی ادائیگی کی صورت میں واپس کیا اور دوسری رقم کو ورثاء اور متوسلین کے وثیقے کے طور پر خزانے میں محفوظ کرلیا۔اس دوران گورنر جنرل اور غازی الدین حیدر کے درمیان گاڑھی چھننے لگی۔ان کے درمیان کئی نئے معاہدے ہوئے اور تعلقات کو مزید بہتر بنانے کی کوشش کی گئی۔اسی دوران گورنر جنرل کی ایما پر غازی الدین حیدر نے نوابی کو بادشاہت میں بدلنے کا اعلان کر دیا۔کلکتہ کونسل نے بھی نواب کی اس خواہش کو منظور کرلیا اور جشن کی تیاریوں کے لئے دو کروڑ روپئے منظور ہوئے۔ بالآخر ۱۸/ذی الحجہ ۱۲۳۵ھ مطابق ۱۹/اکتوبر ۱۸۲۰ء کو نواب غازی الدین حیدر بادشاہ اودھ قرار پائے۔اس موقع پر ولی عہد بہادر نصیر الدین حیدر کو سلیمان جاہ اور معتمد الدولہ آغا میر کو وزیر اعظم کا خطاب عطا ہوا۔سبحان علی خاں نے نیا سکۂ شاہی پیش کر کے پانچ ہزار روپئے کا انعام پایا۔[1]

غازی الدین حیدر نے بادشاہت کے ابتدائی دور میں نہایت انہماک سے کام کیا اور ہر روز کاغذات کو ملاحظہ کرنے کے علاوہ عوام کی فلاح و بہبود کے لئے منصوبہ سازی کرتے۔ لیکن جب جگر کے ورم ،استسقاء اور ضعف معدہ جیسی بیماریوں میں مبتلا ہوکر وہ اطبا کے مشورے سے شراب پینے لگے تو وزیر اعظم آغا میر کا اقتدار بڑھ گیا۔نواب آغا میر دانشمند اور خدا ترس انسان تھے۔ان کی فیاضی کے قصے مشہور ہیں اور انہوں نے کبھی عمداً شریعت

---

[1] لکھنؤ کی تہذیبی میراث۔ص ۹۷

مخالف قدم نہیں اٹھایا۔ وہ انگریزوں کی بے جا مداخلت اور اودھ پر ان کے بڑھتے ہوئے دائرۂ اثر سے بھی خوش نہیں تھے، اس لئے وہ ہمیشہ انگریزوں کی نگاہوں کا کانٹا بنے رہے۔ ان کے خلاف نواب تفضّل حسین خاں نے انگریزوں کے کان بھرے اور اس متشرع وزیر اعظم کو وزارت سے بے دخل کر کے کانپور کی طرف جلا وطن کروادیا۔ آغا میر کا لکھنؤ سے جانا اور خان علامہ کا مسند وزارت پر آنا اودھ کے لئے کسی عذاب سے کم نہیں تھا۔ اس کے بعد اودھ کے معاملات کی باگ ڈور پوری طرح انگریزوں کے ہاتھوں میں چلی گئی۔

غازی الدین حیدر علم دوست اور ادب نواز بادشاہ تھے۔ ایجاد و اختراعات سے بھی انہیں خاص شغف تھا۔ کثرت شراب نوشی نے ان کی صحت خراب کر دی تھی جس کی بنیاد پر ۱۸/ اکتوبر ۱۸۲۷ء مطابق ۱۲۴۳ھ کو انتقال کیا اور امام باڑہ شاہ نجف میں آسودۂ خاک ہوئے۔ غازی الدین حیدر کے بعد ان کے صاحب زادے نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ قرار پائے۔ ان کے متعلق صفدر حسین کا بیان ملاحظہ کیجئے:

''غازی الدین حیدر نے عیش و عشرت کی جو روایات شروع کر دی تھیں ان کی تکمیل ان کے صاحب زادے نصیر الدین حیدر نے کر دی جو انگریزی لباس، انگریزی غذا، انگریزی ساز و سامان اور انگریز مصاحبین کا بھی نہایت وافر شوق رکھتے۔ شراب، ناچ، رنگ، جانوروں کی لڑائی کا تماشا، حسین عورتوں کی صحبت کا ذوق وغیرہ ایسے مشاغل تھے جن میں اس نوعمر بادشاہ کے اوقات بسر ہوتے تھے۔''[1]

سرورؔ نے نصیر الدین حیدر کے عہد کی جو تصویر کشی کی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ رقص و سرود کے شیدا اور اربابِ نشاط کے منظور نظر تھے۔[2] نجم الغنی لکھتے ہیں:

''ان کی لونڈیوں نے جو لباس پہن ڈالا وہ مغل اعظم کی ملکہ اور شہزادیوں کو نصیب

---

[1] لکھنؤ کی تہذیبی میراث۔ ص ۸۳

[2] فسانۂ عبرت، رجب علی بیگ سرورؔ، ص ۹ تا ۲۶

نہیں ہوا۔ کہاریوں اور مہریوں کا ایک ڈوپٹہ چار چار ہزار کی لاگت کا ہوتا تھا۔‘‘[۱]

نصیر الدین حیدر نے حکومتی نظم و نسق اور عوامی فلاح و بہبود کی طرف مطلق توجہ نہیں کی۔ ارباب نشاط کی محفلوں میں مست رہتے اور اخراجات پر بھی انہیں قابو نہیں تھا۔ داد و دہش میں بھی ان کا ہاتھ بہت کھلا ہوا تھا۔ ان کا ایک فرینچ حجّام تھا جس نے چند سالوں میں لاکھوں روپیہ پیدا کرلیا تھا۔ اس کی معرفت لاکھوں روپئے کی خرید و فروخت ہوتی تھی۔ رجب علی بیگ سرؔور نصیر الدین حیدر کے زمانے کی شان و شوکت کی خوب تعریف کرتے ہیں کیونکہ ان کے زمانے میں شراب و شباب پر کوئی سختی نہیں تھی۔ سرؔور کو انہی نوابوں اور علماء سے بیر تھا جن کے عہد میں انہیں اپنی طبیعت کی آسودگی کی آزادی نہیں ملی۔ خاص طور پر امجد علی شاہ سے انہیں خاص چڑھ پیدا ہوگئی تھی۔ نصیر الدین حیدر کی فضول خرچیوں کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے اپنے والد کے پس انداز کئے ہوئے دس کروڑ روپئے کی خطیر رقم کو چند ہی سال میں اُڑا دیا۔ ان کے آخر عمر تک خزانہ شاہی خالی ہوگیا۔ البتہ مورخین نے ان کی طبیعت کے تضاد کو بھی بیان کیا ہے۔ ایک طرف تو وہ انتہائی تعیش پرستانہ مزاج رکھتے تھے، دوسری طرف مذہبی جذبہ بھی بہت بڑھا ہوا تھا۔ محرم کے دنوں میں وہ مجلس و ماتم میں مصروف ہوجاتے اور عیش و عشرت کی تمام محفلیں موقوف کردی جاتیں۔ انگریزی لباس حتیٰ کہ انگریزی کھانا بھی ترک کردیتے تھے۔ ان ایام میں انگریز مصاحبین کو بھی ملنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ ایام عزا کے دوران دربار میں بھی ناغہ رہتا اور تمام ملکی اور مالی معاملات چہلم تک ملتوی رہتے۔ اس عہد میں بادشاہ اور علماء کے درمیان شدید اختلاف رہا اور بادشاہ نے کسی علمی اور مذہبی سرگرمی میں دلچسپی نہیں دکھلائی۔ خاص طور پر سلطان العلما سے ان کے تعلقات کشیدہ رہے اور آخر عمر تک بات نہیں بنی۔

نصیر الدین حیدر نے اپنے آخری ایام میں رفاہی اور تعمیراتی امور کی طرف بھی توجہ

---

[۱] تاریخ اودھ، نجم الغنی، ج ۴، ص ۳۷۷ تا ۳۷۸

کی۔ان کی ایما پر حکیم مہدی خاں نے دارالشفا قائم کیا جس کا انگریزی شعبہ ڈاکٹر اسٹیونسن کے ماتحت تھا اور یونانی شعبہ مرزا علی اکبر کے زیر نگرانی تھا۔اس کے مصارف کے لئے چھ لاکھ روپیہ انگریزی خزانے میں داخل کر دیا گیا تھا جس کا منافع اس شاہی شفا خانے پر خرچ ہوتا تھا۔دوسرے شاہی چھاپہ خانہ کا قیام عمل میں آیا جس کا انتظام آرچر صاحب کے سپرد کیا گیا۔ان کے عہد میں دریائے گومتی کے لئے یورپ سے آہنی پل منگوایا گیا جو نصب نہ ہونے کی وجہ سے زنگ آلود ہو گیا۔ملک کے محتاجوں اور پریشان حالوں کے لئے ایک محتاج خانہ بنوایا،اس کو خیرات خانہ کو نام دیا گیا تھا جو نخاس کی سڑک پر خالق بازار میں واقع تھا۔اس کے علاوہ رمنۂ موتی محل میں رصد خانہ سلطانی قائم ہوا۔اسی زمانے میں اودھ میں پہلا انگریزی اسکول تعمیر ہوا۔اگر نصیرالدین حیدر شراب و شباب اور فضول خرچیوں میں نہ پڑتے تو ایک اچھے بادشاہ ثابت ہو سکتے تھے مگر ان کی بے اعتدالیوں کی بنا پر ان کے عہد کو یاد کیا جاتا ہے۔

نصیرالدین حیدر نے دس سالوں تک اودھ پر حکومت کی۔ان کے انتقال کے بعد مسند کے دو دعوے دار کھڑے ہوئے۔ایک فریدوں بخت منّا جان تھے جنہیں بادشاہ بیگم کی حمایت حاصل تھی اور دوسری دعویداری نصیرالدولہ محمد علی شاہ کی تھی جو نصیرالدین حیدر کے چچا تھے،انہیں ریذیڈنٹ کی پشت پناہی حاصل تھی۔بادشاہ بیگم نے ریذیڈنٹ کی مرضی کے خلاف منّا جان کو تخت نشین کر دیا،جس نے انگریزوں کو برانگیختہ کر دیا۔انگریزوں نے منّا جان اور بادشاہ بیگم دونوں کو گرفتار کر کے قلعۂ چنار گڑھ بھیج دیا اور محمد علی شاہ کو مسند اقتدار پر بٹھلا دیا۔سلطان العلما سید محمد نے تاج شاہی سر پر رکھا اور توپوں سے سلامی پیش کی گئی۔[1] چونکہ محمد علی شاہ کی تخت نشینی میں انگریزوں کی غیر معمولی امداد شامل تھی لہٰذا اس بار پھر سات دفعات پر مشتمل نیا معاہدہ عمل میں آیا جس کی رو سے انگریزی عمل دخل میں مزید اضافہ ہوا۔

---

[1] تاریخ لکھنؤ،محمد باقر شمس ص ۴۵۰

اس معاہدے کی سب سے خطرناک شق یہ تھی کہ کمپنی ملک اودھ میں جہاں بدانتظامی اور لاقانونیت دیکھے گی ،تو تمام ریاست یا اس کے جس علاقے کو چاہے گی اپنے بندوبست میں لے لے گی۔محمد علی شاہ کی عمر تخت نشینی کے وقت ۶۳ سال تھی اور بعض عوارض کی بنیاد پر ان کے دست و پا قابو میں نہیں تھے ،اس کے باوجود انہوں نے ملکی نظم ونسق کو بہتر بنایا اور نصیرالدین حیدر کی بےاعتدالیوں سے جو لاقانونیت پیدا ہوگئی تھی اس میں اصلاحات کیں۔

محمد علی شاہ کو علم وادب سے گہرا شغف تھا اس لئے انہوں نے علما کی ایما پر آغا محمد اصفہانی سوداگر کے ذریعہ روضۂ حضرت عباس کی تعمیر نو اور نہر روضۂ حضرت حر کی درستی کے لئے خطیر رقم روانہ کی۔اس کے علاوہ ایک ہزار روپیہ ماہانہ ان زائرین کے لئے مختص کیا جو لکھنؤ سے تعلق رکھتے تھے اور عتبات عالیہ میں مقیم تھے۔یہ رقم فی کس پانچ روپیہ کے لحاظ سے ان میں تقسیم ہوتی تھی۔البتہ شمسؔ نے اس کی تردید کی ہے اور انہوں نے تحریر کیا ہے:

''سید حسین صاحب مجتہد العصر سید العلما (خلف غفران مآبؒ) نے نہر آصفی کے جابجا پٹ جانے اور زائرین ومجاورین کربلا ونجف کو پانی کی تکلیف سے مطلع کیا اور اس کی درستی کا تخمینہ ڈیڑھ لاکھ بتایا انہوں نے وہ رقم فوراً ان کے حوالے کی جو ریذیڈنٹ کے ذریعہ ہائی کمشنر بغداد کو بھیج دی گئی کہ وہ آقا سید ابراہیم صاحب ضوابط الاصول کو دیدیں۔''[1]

سید العلما نے آقا سید ابراہیم کو خط بھی تحریر کیا جس کا جواب انکی طرف سے دیا گیا تھا۔[2]

ان کی مذہبی رغبت کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ انہوں نے حسین آباد میں عالیشان امام باڑہ تعمیر کروایا اور اس کے قریب جامع مسجد کی بنیاد رکھی۔ان کے ملازمین کی تنخواہوں اور عمارتوں کے انتظام وانصرام کے لئے ۳۲ لاکھ پچاس ہزار روپیہ انگریزی خزانے میں جمع کروایا جس کا منافع چودہ ہزار روپیہ ہوتا تھا۔اس سے ملازمین کی تنخواہوں کے علاوہ عمارتوں کے انتظام وانصرام میں بھی مدد لی جاتی تھی۔اپنے محلات ،شاہزادگان ،متوسلین اور

---

[1] تاریخ لکھنؤ،شمس،ص ۴۵۱

[2] تاریخ لکھنؤ،شمس۔ص ۴۵۲ تا ۴۶۳

اعزہ واقارب کے اخراجات کے لئے سترہ لاکھ روپیہ انگریزی خزانہ میں جمع کروایا جس کے منافع سے ان کونسل درنسل وثیقہ جاری ہوا۔[۱] محمد علی شاہ نے چھ سال تک حکومت کی۔ آخر کار ۱۲۵۸ھ مطابق ۱۸۴۲ء کو انتقال کیا۔ نماز جنازہ سلطان العلما نے پڑھائی جس میں ریذیڈنٹ بھی شریک ہوئے۔[۲]

امجد علی شاہ سے پہلے کے فرماں رواؤں کے حالات قلم بند کرنے کا ایک مقصد یہ تھا کہ قارئین کو یہ معلوم ہو سکے کہ امجد علی شاہ سے پہلے تک نوابین اودھ کی اخلاقی، سماجی اور سیاسی صورت حال کیا تھی۔ امجد علی شاہ سے پہلے کسی نواب کو اس قدر متشرع اور مذہب امامیہ کا سرگرم مبلغ نہیں دیکھا گیا جبکہ محمد علی شاہ پیش روؤں سے قدرے بہتر اور مذہبی فرائض کے پابند تھے۔ محمد علی شاہ کی بیگم ملکۂ آفاق دیندار خاتون تھیں جس کا پرتو امجد علی شاہ میں نظر آتا ہے۔ ملکۂ آفاق سے پہلے کوئی دوسری خاتون ایسی نہیں گذری جس کی دینداری کا لکھنؤ میں شہرہ رہا ہو اور اس کی آغوش میں کسی متشرع شہزادے کی پرورش انجام پائی ہو۔ یہ شرف تنہا امجد علی شاہ کی والدہ ملکۂ آفاق کو حاصل ہے۔

امجد علی شاہ محمد علی شاہ کے فرزند ارجمند تھے جو ۱۲۵۸ھ مطابق ۱۸۴۲ء و ۴۳ء کو ۴۵ برس کے سن میں تخت پر بیٹھے۔[۳] یہ وہ پہلا بادشاہ ہے جسے شراب وشباب، محفل رقص وسرود، موسیقی ونغمہ، اور ابتذار کا کوئی شوق نہیں تھا۔ ایسا نہیں ہے کہ ان کے عہد میں اودھ اس قدر بدل گیا تھا کہ وہاں موسیقی، نغمہ سنجی، رقص وشراب اور طوائف بازاری کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی بلکہ حکومتی سطح پر شریعت مخالف سرگرمیوں کی اجازت نہیں تھی اور علیٰ الاعلان ایسا کرنے والوں کے لئے سخت سزائیں تجویز کی جاتی تھیں۔ اسی بنا پر وہ مورخین اور اوباش جوان محفلوں کی رونق بڑھاتے تھے، امجد علی شاہ کو کوستے نظر آتے ہیں اور انہیں اودھ کا کمزور ترین بادشاہ

---

[۱] لکھنؤ کی تہذیبی میراث۔ ص ۸۷

[۲] تاریخ لکھنؤ، شمس۔ ص ۴۶۰

[۳] سوانحات سلاطین اودھ جلد یکم ص ۳۶۱

قرار دیتے ہیں، ان میں کمال الدین حیدر، رجب علی بیگ سرورؔ اور نجم الغنی سرفہرست ہیں۔

امجد علی شاہ اودھ کا پہلا متشرع بادشاہ ہے جس نے علما اور افاضل کی صحبتوں سے کسب فیض کیا اور اپنا طرز حکومت اسلامی اصول وضوابط کے مطابق ترتیب دینے کی کوشش کی۔ وہ مذہبی احکامات پر سختی کے ساتھ عمل کر کے اور عدالتی معاملات میں بھی شریعت کو پیش نظر رکھتے تھے۔ تخت نشین ہوتے ہی انہیں یہ احساس ہوا کہ حکومت علما کا حق ہے کیونکہ وہ شریعت کے عالم اور امام کے نائب کی حیثیت رکھتے ہیں، اس لئے انہوں نے سلطنت کی زمام سلطان العلما سید محمد کو سونپنے کا فیصلہ کیا۔ سلطان العلما نے حکومت کی پیشکش تو قبول نہیں کی مگر ان سے یہ عہد لے لیا کہ حکومتی معاملات فقہ جعفری کے مطابق انجام پائیں گے۔ اس کے لئے محکمۂ مرافعہ شرعیہ کا قیام عمل میں آیا جس کی باگ ڈور سلطان العلما کے سپرد کی گئی۔ محکمۂ مرافعہ شرعیہ نے ہندوستان کی تاریخ میں نئے باب کا آغاز کیا جو اس سے پہلے کسی حکومت میں ممکن نہیں ہوا تھا۔ ہندوستان میں پہلی بار فقہ جعفری کو حکومتی سطح پر رواج ہوا اور تمام سرکاری اور قضاوتی امور فقہ امامیہ کے مطابق طے پانے لگے۔ اس سے پہلے کسی حکومت میں یہ امر ممکن نہیں ہوسکا تھا۔ بادشاہ نے دو مہریں بنوائیں۔ ایک اپنے لئے، دوسری سلطان العلما کے لئے۔ اس میں بھی اس نزاکت کو پیش نظر رکھا کہ سلطان العلما کی مہر کو بادشاہ کی مہر سے زیادہ ممتاز اور منفرد بنوایا۔ امجد علی شاہ شرعی معاملات میں اس قدر محتاط تھے کہ اگر وہ ریذیڈنٹ کی دعوت پر ان کی رہائش گاہ پر جاتے، تو ان کا رکاب دار ہمراہ ہوتا۔ دسترخوان پر سوائے چائے کے کچھ اور نوش نہیں کرتے تھے۔ ان کے سامنے جو کھانا رکھا جاتا وہ ان کے خانساماں کا تیار کردہ ہوتا تھا۔ محفل میں جب رقص وسرود کا آغاز ہونے لگتا، اس سے پہلے وہ اُٹھ جاتے۔ انہوں نے کبھی عمداً خلاف شرع کوئی کام انجام نہیں دیا۔ انہیں سلاطین، نوابین اور امراء کی طرح سیر وشکار کا کوئی شوق نہیں تھا لیکن فوجی زندگی کو پسند کرتے تھے۔ امور سلطنت میں بڑا انہماک تھا۔[۱] بعض مورخین نے انتقاد کرتے

---

[۱] لکھنؤ کی تہذیبی میراث۔ ص ۸۸

ہوئے لکھا ہے کہ امجد علی شاہ خالص مذہبی طبیعت کے انسان تھے۔انہیں ملکی نظم ونسق اور فنون لطیفہ سے کوئی شغف نہیں تھا جبکہ اس عہد کی تاریخیں اس دعوے کو مسترد کرتی ہیں۔ملکی اور مالی معاملات میں ان کے اوقات کو انگریزوں نے بھی بیان کیا ہے اوران کے معمول زندگی پر روشنی ڈالی ہے۔تہذیب وثقافت کی بہتری اور تمدنی ارتقا کی طرف بھی وہ متوجہ تھے۔وہ چاہتے تھے کہ لکھنؤ میں تمام رعایا کے مکانات رنگین کردیئے جائیں اوران پر نقش ونگار بنائے جائیں۔ان کے عہد میں امین آباد اور حضرت گنج کی تعمیر عمل میں آئی۔لکھنؤ اور کان پور کے درمیان ایک پختہ سڑک بنوائی جو پچاس میل لمبی تھی۔اس سڑک کو وزیرالسلطنت امین الدولہ کے نام موسوم کیا گیا۔رفاہی امور کے علاوہ انہوں نے علمی میدان میں بھی خدمات انجام دیں۔طلبا کی تعلیم و تدریس کے لئے مدرسۂ سلطانیہ قائم کیا جو سیدالعلماء سید حسین کے مشورے کا نتیجہ تھا۔اس مدرسے میں ہر طالب علم کو پانچ روپئے ماہانہ وظیفہ دیا جاتا تھا اور بیس طلبا پر ایک مدرس مقرر تھا۔انہوں نے رصد خانۂ سلطانی کی تکمیل بھی کروائی جس کا آغاز نصیرالدین حیدر کے زمانے میں ہوا تھا۔ان کے علاوہ متعدد رفاہی، فلاحی اور ثقافتی امور انجام دیئے جن کا ذکر مختلف مورخین نے کیا ہے۔

امجد علی شاہ کے عہد کا عظیم کارنامہ محکمۂ مرافعہ شرعیہ کا قیام ہے، جس کا ذکر ہم پہلے بھی کر چکے ہیں۔اس محکمہ کے قیام کے بعد حکومت فقہ جعفری کی پابند تھی اور تمام فیصلے علماء کے قلمدان سے صادر ہوتے تھے۔دیگر مسالک اور مذاہب کے لئے ان کی شریعت اور مذہبی آئین کے مطابق انتظام وانصرام کیا گیا تھا۔اہل سنت کے لئے سنّی قاضی اور ہنود کے لئے برہمن کو مقرر کیا گیا۔محکمۂ آب کاری پر خاص توجہ مرکوز کی گئی کیونکہ زیادہ تر اخلاقی بیماریوں کا مرکز یہی شعبہ تھا۔شراب اور افیون کی دوکانوں کو بند کر دیا گیا اور صرف انہی دوکانوں کو کھلا رکھنے کی اجازت دی گئی جو حکومت کے زیر نظر تھیں۔ان دوکانوں کو اطباء کی ضرورت کے پیش نظر کھلا رکھا گیا جہاں سے اطباء نسخوں میں شراب اور افیون کی ایک معین مقدار تجویز کرتے تھے،بغیر نسخے کے دوکانوں سے نشہ آور اشیا کو حاصل نہیں کیا جاسکتا تھا۔اگر ۱۸۵۷ء

کی جدوجہد آزادی کے بعد سلطنت اودھ کا انتزاع نہ ہوا ہوتا تو یہ محکمہ مزید تاریخی کارنامے سرانجام دے سکتا، جس کا افسوس سلطان العلما، سید العلما اور واجد علی شاہ تینوں کو تاعمر رہا۔

زیر نظر کتاب 'امجد علی شاہ' کی حیات اور خدمات پر مشتمل ہے لیکن چودھری صاحب نے پیش رونوابین کی زندگی کا بھی مختصر خاکہ تحریر کیا ہے تاکہ اودھ کی تاریخ کے خطوط مزید روشن ہوسکیں اور قاری امجد علی شاہ کی زندگی اور کارناموں کو پڑھنے سے پہلے صوبۂ اودھ کے ریاست اور پھر سلطنت بننے تک کی تاریخ کا بغور جائزہ لے سکے۔ انہوں نے برہان الملک سعادت خاں سے محمد علی شاہ تک کے حالات اور کوائف کو بہت اختصار لیکن تجزیاتی اور انتقادی نقطۂ نگاہ سے بیان کیا ہے، جس سے اودھ کے تاریخی التباسات کی گتھیاں سلجھتی نظر آتی ہیں۔ امجد علی شاہ کی شخصیت اور ان کے عہد کو اس سے پہلے کبھی کسی نے اس قدر تحقیقی اور تجزیاتی انداز میں پیش نہیں کیا کیونکہ مورخین انہیں اودھ کا سب سے کمزور اور نااہل بادشاہ قرار دیتے ہیں۔ چودھری صاحب نے اس کے اسباب وعلل پر بھی روشنی ڈالی ہے اور ثابت کیا ہے کہ امجد علی شاہ ایک قابل منتظم ومنصرم ہونے کے ساتھ اودھ کے پہلے متشرع بادشاہ بھی تھے۔ شریعت کی پابندی اور علما کی قدردانی نے انہیں مورخین کی نگاہوں میں مطعون بنادیا۔ اس سے مورخین نے یہ سمجھا کہ امجد علی شاہ برائے نام فرماں روا تھے جبکہ انہوں نے عدالتی امور کی زمام سلطان العلما کے سپرد کی تھی لیکن دیگر حکومتی معاملات ان کے ذریعہ ہی انجام پاتے تھے۔ اگر وہ تمام امور سلطنت کی ذمہ داری سلطان العلما کو سونپ دیتے تو یہ انگریز کبھی برداشت نہیں کرتے اور انہیں معزول کرکے ان کی جگہ کسی دوسرے کو بادشاہت کی کرسی پر بٹھلادیا جاتا، جیسا کہ ہم نے نواب آصف الدولہ کے بعد دیکھا کہ انگریزوں نے کس قدر عیاری اور مکاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے نواب وزیر علی کی جگہ ان کے چچا نواب سعادت علی خاں کو بنارس سے بلاکر مسند اقتدار پر بٹھلادیا اور کس طرح وزیر علی کو اپنے ہم نوا علما اور امرا کے ذریعہ متبنیٰ ثابت کردیا۔ اس لئے امجد علی شاہ کی سیاسی بصیرت سے یہ بعید تھا کہ وہ تمام حکومتی امور کی ذمہ داری علما کو سونپ دیتے۔ البتہ انہوں نے

سلطان العلما کے اختیارات میں کبھی مداخلت نہیں کی اور جب انہیں عدالت میں طلب کیا گیا تو انہوں نے اس کو اپنی اہانت نہیں سمجھا بلکہ انتہائی انکساری کے ساتھ سلطان العلما کی عدالت میں پیش ہوئے۔

چودھری صاحب نے ان تمام واقعات کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے جن کی روشنی میں نوابین اودھ کے کردار کو مسخ کر کے پیش کیا جاتا رہا ہے۔سب سے بڑا الزام یہ عائد کیا جاتا ہے کہ اودھ کے نواب انگریز پرست تھے، جبکہ حقائق اس دعوے کی تردید کرتے ہیں۔ ایسے تمام واقعات جن کی بنیاد پر نوابوں کو انگریز پرست ثابت کیا جاتا ہے، کمپنی کے مورخین کے بیان کردہ ہیں، جنہیں دوسری تاریخوں سے باآسانی رد کیا جاسکتا ہے۔خاص طور پر کمال الدین حیدر، مرزا ابوطالب اصفہانی، منشی نول کشور اور نجم الغنی جیسے مورخین نے نوابین اودھ کو انگریزوں کے نقطۂ نگاہ سے پیش کرنے کی کوشش کی۔ان کے بیان کردہ واقعات متضاد اور تاریخی عینیت سے عاری ہیں۔انگریزوں نے اپنے مورخین اور مصنّفین سے اودھ کے خلاف کام لیا لیکن اس میں نظم وضبط اور سلیقے کی کمی صاف نظر آتی ہے۔خاص طور پر کمال الدین حیدر اور مرزا ابوطالب اصفہانی نوابین اودھ کے خلاف لکھنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے۔

دوسرا الزام یہ ہے کہ نوابین اودھ نے دہلی سلطنت سے علاحدگی اختیار کر کے دہلی کی مرکزیت کو متاثر کیا تھا۔جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔دہلی کی مرکزیت تو اورنگ زیب کے بعد مائل بہ زوال تھی اور محمد شاہ کے عہد میں دہلی کا دائرۂ اختیار بہت محدود ہو چکا تھا۔اس لئے یہ کہنا کہ نوابین اودھ نے بادشاہت کا اعلان کر کے دہلی کی مرکزیت کو نقصان پہونچایا بے بنیاد الزام ہے۔دوسرے یہ کہ دہلی سلطنت سے علاحدگی کا منصوبہ نوابین کا نہیں تھا بلکہ اس کے پس پردہ انگریز کارفرما تھے۔انہوں نے اپنے فیصلے کو نوابین اودھ کے سر تھوپنے کی کوشش کی تاکہ دہلی سلطنت کی نگاہ میں ان کا اعتبار کمزور نہ ہوسکے۔اودھ کے تمام حکمرانوں نے ہمیشہ دہلی کے شاہزادوں اور متعلقہ افراد کا بے حد احترام کیا۔حتیٰ کہ اس عہد میں بھی کہ

جب ان کا رشتۂ انتظام دہلی سے منقطع ہو چکا تھا۔ دہلی میں مالی تنگدستی کا شکار بعض شاہزادوں نے لکھنؤ کا رخ کیا تو نوابوں نے انہیں سر آنکھوں پر بٹھایا اور ان کے لئے معقول وثیقہ کا بندوبست کیا۔ جب شاہزادوں کی سواری عام شاہراہوں سے گذرتی تھی تو نوابین کبھی ان کی بے احترامی نہیں کرتے، اگر کبھی آمنا سامنا ہو جاتا تو نواب ان کے احترام میں اپنی سواری کے ہاتھی کو بٹھلا دیتے تاکہ پہلے شاہزادوں کی سواری گذر جائے۔ اگر انہیں ان کی ہتک حرمت اور بے احترامی منظور ہوتی تو دہلی کے شاہزادوں کو کبھی اس قدر عزّت و تکریم سے نہیں نوازا جاتا۔ ایک بار کسی بنیاد پر ایک شاہزادے کا وثیقہ رک گیا تو ان کے دسترخوان پر بھنے ہوئے چنے آنے لگے۔ گویا کہ اودھ میں ان کے لئے جو وثیقے اور وظیفے متعین تھے، وہ ان کے رعب اور خوف کی بنیاد پر نہیں بلکہ ان کے احترام کے پیش نظر جاری کئے تھے۔ انہوں نے ہمیشہ بادشاہ اور شاہزادوں کی خدمت میں نذریں پیش کیں اور بیش قیمت تحائف بھجوائے۔ ان کی عطا کردہ خلعت کو فخر کے ساتھ زیب تن کرتے اور کبھی ان کی اہانت میں کوئی جملہ برداشت نہیں کرتے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نوابین اودھ نے کبھی دہلی سے ترک تعلق نہیں کیا لیکن انگریز دہلی اور اودھ کے مابین خوشگوار تعلقات دیکھنا نہیں چاہتے تھے، اس لئے انہوں نے ترک تعلق کر کے اودھ کے نوابوں کے سر تہمتیں منڈھ دیں، جس کا چودھری صاحب نے تاریخی دلائل کے ذریعہ ازالہ کیا ہے۔

چودھری صاحب نے زیر نظر کتاب میں ان افراد کو بھی نہیں بخشا جنہوں نے سلطنت اودھ کو کمزور کرنے میں انگریزوں کی وفاداری کا قلادہ گلے میں ڈال لیا تھا۔ خاص طور پر خان علامہ تفضّل حسین، تحسین علی خاں، حکیم مہدی، اور ان جیسے دیگر بااثر افراد کے کارناموں پر سخت تنقید کی ہے اور انہیں حکومت اودھ کا غدّار ثابت کیا ہے۔ گو کہ چودھری صاحب نے ان کے بارے میں بہت تفصیل سے نہیں لکھا لیکن وہ اپنی بات کو اختصار کے ساتھ بھی کہتے ہیں، تو اس کا لطف کم نہیں ہوتا اور قاری اس کم نویسی کے باوجود واقعات کے سیاق و سباق کو سمجھنے سے قاصر نہیں رہتا۔ خاص طور پر انہوں نے خان علامہ تفضّل حسین پر کڑے الفاظ

میں تنقید کی ہے اور لکھا ہے کہ اگر تفضّل حسین انگریزوں سے وفاداری کا مظاہرہ نہ کرتے تو انہیں زیادہ عزّت اور شہرت ملتی لیکن انہوں نے اپنے علمی وقار کو داؤں پر لگا کر عہدے کی ہوس کو ترجیح دی۔

امجد علی شاہ کے بارے میں جو تسامحات اور مغالطے تاریخ میں راہ پا گئے ہیں یا انہیں ایک منظم حکمت عملی کے تحت راہ دی گئی ہے، ان پر بھی چودھری صاحب نے ناقدانہ نگاہ ڈالی ہے۔ خاص طور پر جن مورخین نے یہ اعتراض کیا ہے کہ امجد علی شاہ کے عہد میں کوئی ثقافتی اور تہذیبی پیش رفت نہیں ہوئی، اس کا بخوبی تحقیقی جائزہ پیش کیا ہے۔ انہوں نے اس مسئلے پر بھی بخوبی بحث کی ہے کہ آیا امجد علی شاہ کی طبعی موت ہوئی تھی یا پھر انہیں زہر دیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ انہوں نے امجد علی شاہ پر ہونے والے اعتراضات کو مستند دلائل کے ساتھ مسترد کیا ہے جس کو آپ تفصیل کے ساتھ اس کتاب کے آخری باب میں ملاحظہ فرمائیں گے۔

آخر کلام میں یہ بھی واضح کر دیا جائے کہ اودھ کی اکثر تاریخیں انگریزوں کی ایما پر لکھی گئیں جن میں کمپنی کا مؤقف پیش کیا گیا ہے۔ نوابین اودھ نے تاریخ نویسی کا حکومتی سطح پر کوئی انتظام نہیں کیا تھا، جس کی بنیاد پر ان کا حکومتی نظریہ محدود رہا اور بیت السلطنت کی زندگی ہمارے سامنے نہیں آسکی۔ جن مورخین نے ان کے بارے میں خامہ فرسائی کی ہے، ان کی دو قسمیں ہیں۔ یا تو وہ انگریزوں کے ملازم تھے اس لئے انہوں نے اودھ کی تاریخ کو اپنے آقاؤں کے اشارے پر تحریر کیا۔ انگریزوں کا مقصد یہ تھا کہ عوام الناس کو نوابین اودھ سے اس قدر بدظن کر دیا جائے کہ جب وہ اودھ حکومت پر مسلط ہوں تو نوابوں کی حمایت میں کوئی مزاحمتی آواز تک بلند نہ ہو۔ جبکہ شجاع الدولہ اور آصف الدولہ کی زندگی میں وہ اپنے منصوبوں میں بہت کامیاب نہیں ہو سکے، لیکن ان کے مرنے کے بعد انہوں نے اپنے زرخرید مورخین کو اس طرف مائل کیا اور حسب منشا تاریخ سازی کا حکم دیا۔ دوسرا گروہ اُن اہل قلم اور مورخین کا تھا جو نوابین اودھ کے ہم مسلک نہیں تھے اور ان سے مسلکی عناد رکھتے تھے۔ ان میں براہ راست انگریزوں کے نمک خوار اور نوابوں کے دشمن بھی شامل تھے جیسے مرزا قتیلؔ، نجم الغنی اور

منشی نول کشور وغیرہ۔اس لئے اودھ کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے پہلے تمام مورخین کے بارے میں صحیح معلومات حاصل کرنا بھی ضروری ہے تا کہ غلط فہمیوں سے بچا جا سکے۔فی الوقت اودھ پر کوئی ایسی کتاب موجود نہیں ہے جس میں نوابین اودھ کی تاریخ کا صحیح اور غیر جانبدارانہ جائزہ پیش کیا گیا ہو۔اس لئے ایسی تاریخ کی اشد ضرورت ہے۔

عادل فراز
لکھنؤ
یکم جولائی ۲۰۲۴ء



برہان الملک سید محمد امین سعادت خاں

## (۱)

# اودھ، برہان الملک سے محمد علی شاہ تک

ہندوستان کی قدیم ناموری اور بیش قیمت وراثت کا گہوارہ ہندوؤں کی مقدس کتابوں اور قدیم شاعروں کے یہاں مدھیہ دیش کے نام سے یاد کیا جانے والا، سورج بنشی، چندر بنشی نسلوں کا وطن اودھ اپنے جنگی محلِ وقوع اور وافر وسائل کے باعث مغل سلطنت میں ایک خصوصی حیثیت کا مالک رہا ہے اور صدیوں اس نے ملک کی سیاسی وثقافتی زندگی میں بہت نمایاں و بلند کردار ادا کیا ہے۔ مغلیہ دور میں صوبۂ اودھ شمال مشرق میں دریائے گنڈک سے جنوب ومغرب میں گنگا تک، اور شمال میں نیپال کی ترائی سے جنوب میں سئی ندی تک پھیلا ہوا تھا۔ اس کی لمبائی سرکار گورکھ پور سے قنوج تک آئین اکبری ۱۳۵ کوس اور چوڑائی جنوبی پہاڑیوں سے سدھپور[۱] سرحد صوبہ الٰہ آباد تک ۱۱۵ کوس' بتاتی ہے۔

مغل اعظم اکبر کے عہد سے نوابی حکومت کے قیام تک اس کی سرحدوں میں علاوہ اس معمولی تبدیلی کے، جو فرخ سیر کے عہد میں ہوئی، جس میں مراد آباد کے قریب کے چند علاقے شامل کئے گئے، کوئی بڑی تبدیلی نہیں ہوئی۔ ایک آزاد سیاسی قوت کی شکل میں اودھ کا طلوع اٹھارہویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں، سعادت خاں برہان الملک کے زمانے میں ہوا۔ ایک آزاد موروثی ریاست کی برہان الملک کے بنیاد ڈالنے سے قبل صوبہ

---

[۱] ٹی، پی، چند: دی ایڈمنسٹریشن آف اودھ، ص۱، حاشیہ ۴ ''بقول مصنّف، اب سدھ پور کا پتہ نہیں چلتا۔ جیرٹ (آئین اکبری کے مترجم) نے بھی محل وقوع کی نشان دہی نہیں کی ہے۔''

اودھ پانچ سرکاروں[۱] میں منقسم تھا اور ناظم کے طور پر معین، صوبہ دار کے ذریعہ اس کا انتظام براہ راست شہنشاہ کے ہاتھ میں رہتا تھا۔"[۲]

برہان الملک نے بنارس، جونپور، غازی پور، اعظم گڑھ اور بلیا کی سرکاروں اور مرزا پور کے مشرقی حصّے کو شامل کر کے جو بعد میں صوبہ الہ آباد کا حصّہ بنا، صوبہ اودھ کی سرحدوں کی توسیع کی۔[۳]

یہ سعادت خاں برہان الملک جن کا نام محمد امین تھا، امام موسیٰ کاظمؑ کی نسل کے ایک خاندان کی فرد تھے جو نجف اشرف سے ہجرت کر کے نیشاپور (ایران) میں آباد ہو گیا تھا اور وہاں اس کے افراد نہایت ممتاز مناصب پر مامور ہوتے رہے۔ محمد امین کے والد میر محمد نصیر اپنے بڑے بیٹے میر محمد باقر کے ساتھ ۱۷۰۷ء کے اواخر میں ہندوستان چلے آئے، جو عہد شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر تک دونوں حکومتوں کے خوشگوار روابط کی وجہ سے ایرانیوں کا دوسرا وطن ہو رہا تھا۔ ایرانی اپنی شائستگی، علم و فضل اور ذہانت کے لئے بہت مشہور تھے۔ وہ دفتری کاروبار کے ماہر تھے۔ اس لئے ہندوستان کے دربار میں انھیں وزیر السلطنت اور بخشی الملک کے دفاتر میں بہت جلد جگہ مل جاتی تھی۔[۴] میر محمد نصیر پہلے بنگال آئے اور پٹنہ آ کر سکونت اختیار کر لی۔ میر محمد امین بھی اپنے بڑے بھائی کی ملاقات کے لئے عازم ہندوستان ہو گئے۔ مگر وہ ۱۷۰۸ء میں عظیم آباد پٹنہ ایسے وقت پہونچے کہ ان کے والد سفر آخرت اختیار کر چکے تھے۔[۵] پٹنہ سے دونوں بھائی تلاش معاش میں دلّی پہونچے۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ محی الدین اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے ساتھ نہ صرف مغلیہ خاندان کا

---

[۱] دی ایڈمنسٹریشن آف اودھ، ص ۱، حاشیہ ۴، یہ پانچ سرکاریں تھیں، اودھ، گورکھپور، بہرائچ، خیر آباد، لکھنؤ

[۲] وہی، ص ۱،

[۳] وہی، ص ۲

[۴] صفدر حسین لکھنؤ کی تہذیبی میراث ص ۵۱

[۵] ونود چند شرما: لکھنؤ گزیٹر نیا ایڈیشن ص ۳۷

دبدبہ بلکہ ملک کا سیاسی اتحاد اور تہذیبی یگانگت بھی جسے ہندوستان کے مسلم حکمرانوں بالخصوص مغلیہ خاندان نے بڑے ریاض سے حاصل کیا تھا، اب روبہ انتشار ہوچکے تھے۔ اندرونی شورشیں، سیاسی ہنگامے اور چھوٹی موٹی بغاوتیں تو اورنگ زیب کے سامنے ہی سر اٹھانے لگی تھیں اب تاج وتخت کے دعوے دار بھی تیغ بکف نکل آئے۔ ان حالات میں حوصلہ منداورمہم جو محمد امین کو اپنے جوہر ذات کے نمایاں کرنے کی مناسب فضاء، معقول گنجائش اور وسیع میدان ملا۔ بہرحال دلّی وارد ہونے کے بعد کی سرگزشت مورخین معمولی اختلاف کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ لکھنؤ گزیٹر (۱۹۵۹ ایڈیشن)[۱] کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ میر محمد امین نے سب سے پہلے ایک معمولی سے عامل کے یہاں ملازمت کی اور اس کے بعد سر بلند خاں، فوجدار کڑا مانک پور ملازمت میں آئے لیکن دوسرے مورخ سر بلند خان سے پہلے کسی اور عامل کے یہاں کی ملازمت کا ذکر نہیں کرتے۔ اسی طرح[۲] گزیٹر کا بیان ہے کہ سر بلند خاں کی ملازمت ترک کرنے کے بعد، فرخ سیر کے دربار میں جو ۱۷۱۳ء میں مسند نشین ہوا تھا، ایک منصب حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن ڈاکٹر صفدر حسین[۳] کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہنڈون اور بیانہ کی فوجداری سے پہلے جسے کمال الدین حیدر، میر زائر حسینی سند ہنڈون بیانہ ۸ لاکھ روپیہ تحصیل کی[۴] بتاتے ہیں۔ میر محمد امین کو شہزادوں کی جاگیر کا ٹھیکہ ملا اور پھر سعادت خاں کے خطاب اور ہنڈون بیانہ کی فوجداری سے سرفراز ہوئے۔ شیخ تصدق حسین کی رائے میں یہ دونوں باتیں جنھیں گزیٹر اور ڈاکٹر صفدر حسین نے الگ کرکے دیکھا ہے ایک ہی جگہ سے متعلق ہیں، لکھتے ہیں:

”۱۱۲۸ء میں شہزادوں کی جاگیر ہنڈون بیانہ کا ٹھیکہ ۱۸ لاکھ سالانہ پر لیا اور

---

[۱] وہی، ص ۳۷

[۲] وہی، ص ۳۷

[۳] لکھنؤ کی تہذیبی میراث ص ۵۱

[۴] سوانحات سلاطین اودھ ج ا ص ۳۲

۱۷؍اکتوبر ۱۷۱۹ء سے لیکر ۱۷۲۰ء تک فوجدار (عامل) بھی رہے۔''[۱]

اسی زمانہ میں حضرت محمد شاہ شہنشاہ دلّی کو سید برادران یعنی قطب الملک سید عبداللہ اور امیر الامراء سید حسین علی کے استیصال کی فکر ہوئی جنھوں نے انتشار اور افراتفری کی اس فضا میں بادشاہ گر کی حیثیت حاصل کر لی تھی۔ اس مہم میں میر محمد امین نے بھی حصّہ لیا اور محمد شاہ کی یہ کوشش چند تورانی اور بعض ایرانی امراء کی جدوجہد سے کامیاب ہوئی اور جب یہ وفادار اُمرا عنایات شہنشاہی سے نوازے گئے تو بقول ڈاکٹر صفدر حسین میر محمد امین (سعادت خاں) کو پنج ہزاری کا منصب ملا[۲] مولانا ابرار حسین فاروقی کہتے ہیں کہ ''دو ہفت ہزار ذات و ہفت ہزار سوار'' کا اعلیٰ ترین منصب ملا۔ فاروقی صاحب کے بیان سے مترشح ہوتا ہے کہ اس منصب کے ساتھ ہی ساتھ برہان الملک سعادت خاں کا خطاب اور اودھ کی صوبیداری بھی ملی[۳] ڈاکٹر صفدر حسین کا کہنا ہے کہ سعادت خاں کا خطاب ہنڈون و بیانہ کی فوجداری کے ساتھ عطا ہوا تھا[۴] شیخ تصدق حسین کا بیان ان سب سے مختلف ہے۔ ان کی رائے میں سید برادران کے زوال کے بعد آگرہ کے گورنر اور مہتمم خاصان شاہی ہوئے اور اسی موقع پر سعادت خاں کے خطاب سے سرفراز ہوئے[۵] لکھنؤ گزیٹر میں بھی یہی ہے کہ ۱۷۲۰ء میں سعادت خاں بہادر کا خطاب سید برادران کے استیصال کے عوض میں انعام ہوا[۶] اور اسی کے صحیح ہونے کا قرینہ بھی ہے۔

کم و بیش دو سال کے بعد جب راجہ گردھر ناگر کا مالوہ تبادلہ ہوا تو سعادت خاں اودھ میں ان کے قائم مقام ہوئے اور بقول تصدق حسین برہان الملک کے خطاب سے سرفراز

---

[۱] بیگمات اودھ، ص ۲۰
[۲] لکھنؤ کی تہذیبی میراث، ص، ۵۲
[۳] مراۃ احمدی، ص، ۶۲
[۴] لکھنؤ تہذیبی میراث، ص، ۵۱
[۵] بیگمات اودھ، ص ۲۰
[۶] لکھنؤ گزیٹر، ص، ۳۷

ہوئے اور کچھ عرصہ بعد وہ صرف اودھ کے صوبیدار ہو گئے۔[۱]

آگرہ اور اودھ کی صوبہ داری پر تقرر کے بعد بھی وہ دارالسلطنت کی سیاسی سرگرمیوں میں دلچسپی لیتے رہے مگر درباری سازشوں اور حاسد حریفوں کی جوڑ توڑ کے باعث رفتہ رفتہ دلّی سے دور اور اودھ میں مشغول ہوتے گئے۔

برہان الملک اودھ کی نظامت پر معین ہوئے تو نہ صرف صوبہ کے سرکش اور نافرمان، نیم آزاد زمیندار و جاگیردار حکومت کے لئے دردسر تھے بلکہ شیوخ لکھنؤ کی منظم طاقت کا بھی سامنا تھا، جن کے مورث شیخ عبدالرحیم کو اکبر اعظم نے ماہی مراتب کے اعزاز سے نوازا تھا[۲] اور ان لوگوں نے اپنے اظہار جرأت کے طور پر شیخین دروازہ پر ایک شمشیر برہنہ لٹکا رکھی تھی اور اب تک کے صوبیدار اور ان کے نائب اس تلوار کے نیچے سے سر جھکائے گزرتے تھے۔ برہان الملک نے اپنی حکمت عملی سے شیوخ لکھنؤ کے حریف، شیوخ کاکوری کا تعاون حاصل کر کے حالات پر قابو پایا اور ہاتھی پر سوار آتے ہوئے اس تلوار کو کاٹ کر زمین پر گرا دیا۔

لکھنؤ کی مہم سر ہونے کے بعد مفصلات کے سدھرنے میں زیادہ وقت نہیں لگا اور پھر تو انتظام ایسا سنبھالا کہ اودھ کی آمدنی جو پہلے ستّر لاکھ کی ہوتی تھی پہلے ہی سال ایک کروڑ سات لاکھ ہوئی اور آگے بڑھ کر دو کروڑ کے قریب پہنچی۔[۳]

برہان الملک اودھ کے انتظام کے ساتھ ساتھ مرکزی اقتدار کے تحفّظ کے لئے بھی سر بکف رہے۔ باجی راؤ پیشوا کی لاکھوں کی فوج کا مقابلہ چودہ ہزار کی فوج سے کیا اور غنیم کو پسپا کر کے دم لیا۔[۴] لیکن نادرشاہی حملہ کے وقت برہان الملک کے کردار کے بارے میں

---

[۱] لکھنؤ کی تہذیبی میراث، ص ۵۲

[۲] مراۃ احمدی، ص ۵۴

[۳] سوانحات، ج ۱، ص ۳۷ و ۳۹

[۴] وہی، ص ۳۹

شک وشبہ کا اظہار کیا جاتا ہے ان کی موت کی وجہ خودکشی بتانے والے بیشتر مورخ ہیں۔ ان میں سب سے شدید نکتہ چین ڈاکٹر صفدر حسین ہیں، کہتے ہیں:

''وہ کرنال کی جنگ میں اس توقع پر نادرشاہ سے جا ملے کہ ایسا کرنے سے انہیں زیادہ سے زیادہ مفاد حاصل ہو جائے گا انہوں نے محمد شاہ کو دھوکہ دے کر تاریکی میں رکھا اور فوجی تصادم نہ ہونے دیا۔''[۱]

ڈاکٹر صفدر حسین سادات بارہہ کی فرد ہیں جو اپنا گل سر سبد اب بھی انہیں سید برادران کو سمجھتے ہیں۔ اس لئے برہان الملک سے ان کو اگر عناد نہ بھی ہو تو ہمدردی تو ہو ہی نہیں سکتی، اس لئے ان کا بیان نظر احتیاط سے دیکھنا پڑے گا۔ لیکن برہان الملک کی جانشینی کے معاملے میں نادرشاہ کی حمایت صفدر جنگ کے حق میں ہونے سے اس رجحان کو الزام محض بھی قرار دینا مناسب نہ ہوگا اس واقعہ کی تفصیل ابھی آتی ہے لیکن کمال الدین حیدر دوسری روایت بیان کرتے ہیں

''خلاصہ بعد نماز مغربین یہ دونوں امیر اسیر (اسیر برہان الملک اور شیر جنگ) حاضر حضور شاہ ہوئے۔ حکم ہوا کہ معززین ولایت ہیں انہیں احترام سے رکھو۔''

نواب نے شاہ سے گستاخانہ عرض کیا کہ ''تین عرصے میں شاہ عالم پناہ رونق افروز ہندوستان ہوئے۔ بائیس صوبہ دار، صاحب فوج وسوار و پیادہ وتوپ خانہ ہیں۔ سوائے فوج شاہی کے حضور کو ان سے بہ سلامت پھر کر جانا مشکل پڑے گا۔

خیر یہاں تک جس طرح ہوا حضور خوب جانتے ہیں۔ اگر یہیں سے تصفیہ برادرانہ ہو جائے تو کیا قباحت ہے۔ کس واسطے کہ جنگ دوسر دارد۔ غلام کی عقل ناقص میں مراجعت بہتر ہے۔ شاہ نے بھی بغور وتامل اس صوابدید کو پسند کیا اور فی الحقیقت شاہ کو ہندوستان کا لینا بھی منظور نہ تھا وگرنہ شاید دوسری صورت ہوتی۔ خلاصہ مشہور ہے کہ مجموع

---

[۱] لکھنؤ کی تہذیبی میراث، ص ۵۴

دو کروڑ پر تصفیہ ہو چکا تھا۔ صبح کو آصف جاہ نظام الملک شرف ملازمت نادری کو آئے۔ نواب نے اپنا دوست خالص جان کر پوست کندہ سب احوال بیان کیا کہ ''تم بادشاہ سے جا کر یہ عرض حال کرو۔'' انھوں نے از راہ طمع نفسانی دنیا اپنا رسوخ و جانفشانی سے ظاہر کر کے بادشاہ سے عرض کیا کہ ''غلام نے بڑی جدوجہد سے شاہ کو اس قدر روپے پر راضی کیا ہے کہ وہ یہیں سے پھر جائیں گے۔'' بادشاہ بہت خوش ہوئے اور سمجھے کہ انھوں نے محض از راہ خیر خواہی یہ صورت ٹھہرائی ہے۔ بے تامل اس جلدوے خدمت میں اسی وقت منصب امیر الامرائی پر سرفراز کیا حالانکہ نواب برہان الملک خود متمنی اس منصب جلیلہ کے تھے کس واسطے کہ حسب دستور وزیر اعظم مستحق اس منصب کا ہوتا ہے بس یہی امران کی مایوسی اور ناگواری بلکہ بدنامی عوام کا باعث ہوا۔''[1]

**اس کے بعد کمال الدّین نادرشاہی سفاکیوں کا ذکر کرتے ہیں اور پھر لکھتے ہیں:**

''غرض ان وجوہات مذکورہ سے، جس طرح بیان ہوئے۔ محمد شاہ کو نواب برہان الملک سے اور ارکان دولت کے لگانے، بجھانے سے سوء ظن حاصل ہوا اور ہم صورتان بے باک کی طعن و تشنیع سوہان روح ہوئی بلکہ اپنا جینا ناگوار سمجھتے تھے اور نماز شب میں اپنے آبرو سے مرجانے کی دعا مانگتے تھے۔ آخر انکی دعا مستجاب ہوئی۔ بظاہر مرض الموت دبنل یا تپ محرق سے آخر ماہ ذی الحجہ ۱۱۵۰ھ ۱۷۳۷ء وقت شب انتقال کیا۔[2]

**مگر تاریخ انتقال لکھنؤ گزیٹر نے ۱۹/ مارچ ۱۷۳۹[3] بتائی ہے۔ صفدر حسین[4] اور دوسرے اہل قلم جن میں ''شجاع الدولہ'' کے مصنف ڈاکٹر آشر وادی[5] لال بھی ہیں اسی رائے کے**

---

[1] سوانحات سلاطین اودھ، ج۱، ص ۴۰

[2] سوانحات سلاطین اودھ، ج۱، ص ۴۲

[3] جدید ایڈیشن، ص ۳۸

[4] لکھنؤ کی تہذیبی میراث، ص ۵۴

[5] شجاع الدّولہ، ج۱، ص ۳

ہیں لہٰذا یہی تاریخ درست ہے۔آشروادی لال قمری تاریخ ۹رذی الحجہ ۱۱۵۱ بتاتے ہیں۔[۱]

ایک تیسری روایت بھی ہے کہ:

''چونکہ انھوں نے نادر شاسے سازش کرلی تھی جس کی وجہ سے بیش تر امراء دربار ناراض ہوگئے تھے اس لئے انھوں نے اُن کو زہر دیکر ختم کر دیا۔''[۲]

کمال الدّین حیدر کے بیان میں اضطراب ہے کہ وہ یہی نہیں جانتے کہ مرض الموت کیا تھا۔دنبل یا تپ محرقہ ! اس لئے ان کا بیان کیسے قبول کیا جائے۔زہر خورانی کی روایت اس لئے ضعیف ہے کہ امراء میں اگر ایسا ہی حب الوطنی اور حمیت قومی کا جوش ہوتا تو یہ نوبت ہی کاہے کو آتی۔پھر راز افشا ہونے پر مکافات نادری سے بے پرواہ رہنے کی ہمت تو اور بھی مستبعد ہے لہٰذا یہی ماننا چاہئے کہ حالات برہان الملک کی برداشت سے باہر ہوگئے تھے اور انھوں نے اپنے ہاتھوں جان دے کے نجات پائی۔یہی رجحان ڈاکٹر آشروادی لال کا بھی ہے۔خانوادہ فرماں روایان اودھ کے اس ہمت آزما بانی کے حسن انتظام کی عام طور پر ستائش کی گئی ہے۔صفدر حسین کہتے ہیں:

''ڈاکٹر آشروادی لال شریواستوا نے ہم عصر مورخین کی شہادت کے پیش نظر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ سترہویں صدی عیسوی کے ''ربع آخر سے اودھ کا انتظام کسی گورنر نے برہان الملک سے بہتر نہیں کیا۔''[۳]

## صفدر جنگ

مرزا محمد مقیم جو ابوالمنصور صفدر جنگ کے خطاب سے مزین ہو کے صفدر جنگ کے نام سے مشہور ہوئے، برہان الملک کے بھانجے اور داماد تھے۔برہان الملک کی جانشینی بھی

---

[۱] دی فرسٹ نوابس آف اودھ،ص،۲۷

[۲] ابرار حسین فاروقی مراۃ حمدی،ص،۶۳

[۳] لکھنؤ کی تہذیب میراث ص ۵۵

انہیں کے حصے میں آئی ہر چند کہ برہان الملک کے اور اعزّا خصوصاً ان کے بھتیجے نثار محمد خاں شیر جنگ موجود تھے لیکن اودھ کی صوبہ داری کو مستحکم دیکھ کے برہان الملک نے اپنے بھانجے مرزا مقیم کو نیشا پور سے بلا لیا اور کچھ عرصے بعد اپنی بڑی بیٹی صدر جہاں بیگم کے ساتھ منسوب کر کے دلی دربار سے اودھ کی نائب صوبہ داری ورابوالمنصور کا خطاب دلا دیا[1] کمال الدین حیدر کا کہنا ہے کہ مرزا مقیم کو خالہ کے ساتھ بلایا تھا جنہوں نے ماں کے انتقال کے بعد مرزا مقیم کی پرورش کی تھی[2] مقیم، برہان الملک کی استدعا پر ۱۷۲۴ء میں اودھ کے نائب ناظم مقرر ہوئے اور پندرہ سال یعنی ۱۷۳۹ء تک یہ خدمت بحسن وخوبی انجام دیتے رہے مگر ۱۷۳۹ء میں برہان الملک کی رحلت کے بعد جانشینی کے لئے انہیں اپنے ماموں زاد بھائی شیر جنگ کی مسابقت کا سامنا کرنا پڑا۔

لیکن برہان الملک کے وکیل لچھمی نارائن کی زبردست پیروی کی بدولت کامیابی انہیں کے حصے میں آئی۔ لچھمی نارائن نے نادر شاہ کے حضور میں یادداشت پیش کی جس میں صفدر جنگ کے حقوق کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا کہ اگر اس التجا کو شرف قبول بخشا جائے تو دو کروڑ روپیہ نذر پیش کیا جائے گا۔ نادر شاہ نے یہ درخواست منظور کر لی اور لچھمی نرائن کے ہمراہ دو سو قزلباش سوار اودھ بھیج دئے گئے جو چند روز بعد ایک کروڑ اسّی لاکھ نقد اور کچھ قیمتی اشیا جن میں ایک زبردست ہاتھی بھی تھا، لے کر واپس آ گئے۔ اس رقم میں بیس لاکھ روپیے دلّی میں سعادت خاں کی حویلی سے مزید شامل کر کے تمام دولت نادر شاہ کے خزانہ میں جمع کر دی گئی اور محمد شاہ کی طرف سے خلعت وزارت صفدر جنگ کو بھجوا دیا گیا[3] وہ اودھ کے انتظام میں بہت مستعدی ومہارت سے مصروف تھے کہ مارچ ۱۷۴۴ء میں انہیں دلّی میں، میر آتش

---

[1] وہی ص ۵۴

[2] سوانحات ج ا، ص ۲۰

[3] لکھنؤ کی تہذیبی میراث، ص ۵۵

مقرر کر دیا گیا۔ ساتھ ہی ساتھ کشمیر کی صوبہ داری بھی عنایت ہوئی[۱] وہاں صفدر جنگ نے شیر جنگ کو اپنا نائب بنا کر بھیج دیا۔

اس درمیان حضرت محمد شاہ نے ۲۵ / اپریل ۱۷۴۸ء کو رحلت کی۔ ان کے فرزند احمد شاہ نے مجاہد الدین احمد شاہ بہادر غازی کے لقب کے ساتھ تین دن بعد پانی پت کے تاریخی قصبے کے پاس جلوس سلطنت فرمایا[۲]

صفدر جنگ احمد شاہ ابدالی کے حملۂ پنجاب کو ناکام بنا کر ایک آنکھ کھو کے مگر ملک اور عزت بچا کر پرچم فتح و پیروزی لہراتے ہوئے واپس آئے تھے کہ راستہ میں یہ اطلاع ملی۔ مبارک باد نذر کی۔ ارشاد ہوا کہ "مجھ کو تخت نشینی اور آپ کو وزارت مبارک ہو"[۳] وزیر سلطنت قمر الدین خاں سوا مہینے پہلے ہی انتقال کر چکے تھے۔ احمد شاہ نے ۱۹ / جون ۱۷۴۸ء کو قلعہ معلیٰ میں ایک خصوصی دربار منعقد کر کے ہشت ہزار ذات و ہشت ہزار سوار کے منصب کے ساتھ صفدر جنگ کو خلعت وزارت سے سرفراز کیا[۴] اور اب صوبہ داری کی پگڑی میں وزارت کی کلغی بھی لگ گئی اور اودھ کے صوبہ دار نواب وزیر بھی ہو گئے۔

دربار میں حاضری کے زمانے میں صفدر جنگ کو ایک بڑے نقصان اور زبردست ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ ان کے مستعد، زیرک، بہادر اور نہایت وفادار نائب راجہ نول رائے کی بہ مقام خدا گنج ۱۳ / اگست ۱۷۵۰ء کو احمد خاں بنگش کی سپاہ کے ہاتھوں موت تھی[۵] اس کے بعد بنگش امراء کی طاقت میں ایسا اضافہ ہوا کہ جب ایک بڑی فوج کے ساتھ نواب وزیر نے ان کا مقابلہ کیا تب بھی شکست کا منھ دیکھ کر شاہجہاں آباد لوٹ جانا پڑا اور بنگش

---

[۱] وہی ص ۵۶

[۲] بیگمات اودھ ص ۲۶

[۳] وہی

[۴] شجاع الدولہ ج ۱، ص ۶

[۵] لکھنؤ گزیٹر (جدید اڈیشن) ص، ۳۸

اودھ پر چڑھ آئے اور اودھ کے بڑے حصّے پر مسلّط ہو گئے صفدر جنگ کو اودھ کی بازیابی میں شیوخ لکھنؤ سے بڑی مدد ملی جنھوں نے معز الدّین خاں کی سرکردگی میں بنگش افسران کی سخت گیری سے تنگ آ کر انھیں لکھنؤ سے نکال باہر کیا۔[1] بعد میں صفدر جنگ نے بنگش امراء کا زور توڑنے کے لئے مراٹھوں کی مدد سے فوجی کاروائی کی اور آخر میں سمجھوتہ ہو گیا۔[2]

اودھ پر دوبارہ قبضہ پا جانے کے بعد ان سازشوں سے نپٹنے کے لئے، جو دربار میں ان کے خلاف جاری تھیں صفدر جنگ ۲۶/مارچ ۱۷۵۳ء کو دہلی گئے۔[3] بقول کمال الدّین حیدر اب اپنی نیابت نواب محمد قلی خاں کو سونپی۔[4]

کمال الدّین حیدر کی کتاب جیسا کہ ہم آگے چل کر بسط کے ساتھ دیکھیں گے، انگریزوں کی اہتمام میں فساد انگیزی کی غرض سے لکھی گئی تھی وہ ہر سازش کی تہہ میں مخالفت مذہب کا عنصر ضرور تلاش کر لیتے ہیں۔ حالانکہ ہم ابھی سعادت خاں اور سیّد برادران کے قضیے میں دیکھ چکے ہیں کہ اقتدار و حکومت کا تصور مذہب کیسا! صلۂ رحم تک کو خاطر میں نہیں لاتا۔ یہی سبب ہے کہ ڈاکٹر صفدر حسین نے اپنی قابل قدر کتاب میں برہان الملک کے کردار کے لئے دغابازی اور نمک حرامی کی کریہہ لفظیں استعمال کی ہیں۔[5]

ابھی تک اجودھیا کو دار السلطنت کی حیثیت حاصِل تھی اسی مناسبت سے یہ صوبۂ اودھ کہلاتا تھا۔ برہان الملک نے اس سے دو تین میل کے فاصلے پر اپنے قیام کے لئے کچّی دیواریں کھنچوا کے بنگلہ بنا لیا تھا جو اسی نام سے مشہور بھی رہا۔ اُسے فیض آباد کا نام عہد صفدر جنگ کی دین ہے یہی فیض آباد بعد میں اودھ کی راجدھانی بنا۔

---

[1] وہی

[2] سوانحات سلاطین اودھ، ج۔۔ص ۴۸

[3] لکھنؤ گزیٹر (طبع جدید)، ص ۳۸

[4] سوانحات، ج ا، ص ۴۸

[5] لکھنؤ کی تہذیبی میراث، ص ۵۴

مولوی عبدالحلیم شرر، منشی محمد فیض بخش کے حوالے سے عہد صفدر جنگ میں فیض آباد کی کیفیت یوں بیان کرتے ہیں:

''جب نواب صفدر جنگ کا زمانہ شروع ہوا، تو یہ بستی فیض آباد مشہور ہوئی، یہ ہے بنیاد شہر فیض آباد کی جس نے اپنے بننے اور بگڑنے کی سرعت میں لکھنؤ کو بھی مات کر دیا۔ اب ان دنوں اس کچی چار دیواری کے گرد اکثر مغل سرداران فوج نے اپنی دلچسپی کے لئے باغ اور پرفضا فرحت بخش نزہت گاہیں بنائیں اور شہر کی رونق ترقی کرنے لگی اس کچّے حاطے کا پھاٹک دلّی دروازہ کہلاتا تھا جو مغرب کی طرف تھا۔ اس کے باہر دیوان آتمارام کے بیٹوں نے ایک شاندار بازار بنوایا اور اسی کے سلسلے میں رہنے کے لئے مکانات بھی تعمیر کرائے، اسی طرح اسماعیل خاں رسالدار نے بھی ایک بازار بنوایا اور چار دیواری کے اندر خواجہ سراؤں اور مختلف فوجی لوگوں نے بھی ایک بازار بنوایا اور چار دیواری کے اندر خواجہ سراؤں اور مختلف فوجی لوگوں کے بہت سے مکانات بھی تیار ہو گئے۔ [۱]

اب لکھنؤ کی ترقی میں آپ صفدر جنگ کا حصہ شرؔر ہی کے قلم سے دیکھیں:

''شہر سے تین میل کی مسافت پر انھوں نے قلعۂ جلال آباد تعمیر کرایا اور مچھی بھون کے اندر پنچ محلے کی جو قدیم عمارت تھی اسے بھی شیخ زادوں سے لے لیا اور اس کے عوض میں دوگاواں میں ۷۰۰ / ایکڑ زمین شیخ زادوں کو رہنے اور بسنے کے لئے عطا کی۔ جس سے اگرچہ شیخ زادوں پر ظلم ہوا مگر لکھنؤ کی آبادی کو وسعت اور ترقی حاصل ہوئی۔ مچھی بھون کو صفدر جنگ نے ازسرِ نو تعمیر کرایا اور اسے بہت درست کیا۔ [۲]

اب آپ ڈاکٹر صفدر حسین کے پرزور قلم سے صفدر جنگ کی شخصیت کا خاکہ ملاحظہ کریں:

''صفدر جنگ بڑے شکیل اور وجیہہ آدمی تھے۔ پندرہ سال کی عمر تک انھوں نے

---

[۱] گزشتہ لکھنؤ، ص ۴۳

[۲] وہی، ص، ۲۲

ایران کی اعلیٰ درسگاہوں میں تعلیم پائی تھی اور پھر اودھ پہنچ کر درباری امور کی تربیت برہان الملک سے حاصل کی تھی جن کے زیر سایہ انھوں نے اودھ میں پندرہ سال تک نیابت کا کام انجام دیا۔ مکتوبات منصوری میں صفدر جنگ کے خطوط اور فرمان دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ القاب و آداب کے رسمی طرز تحریر کے علاوہ کسی خط میں کہیں بھی فارسی کے مروجہ تکلفات کو دخل نہیں ہے۔ ان کی زبان سادہ اور رواں اور ان کا طرز تحریر نہایت واضح اور پر جوش ہے۔ صفدر جنگ کو ادب و شعر کا بڑا اچھا ذوق تھا۔ انھوں نے ایک شاعر سے اپنے دلّی کے قیام میں نہر فیض کی تعریف سن کر پانچ ہزار روپئے نقد، ایک ترکی گھوڑا مع مرصع ساز و یراق عطا کیا تھا۔ انھوں نے بہت سے فضلا و علماء کی قدردانی بھی کی چنانچہ مرزا علی نقی سید زین العابدین طباطبائی، ملک العلماء مولوی فضل حسین، شیخ محمد حسن، میر غلام نبی بلگرامی، سید محمد علی اورنگ آبادی اور شاہ باسط ان کے دامن دولت سے وابستہ اور فیضیاب رہے۔ مذہبی عصبیت ان میں بالکل نہ تھی، انھوں نے راجہ نول رائے کو اپنا نائب بنا کر اودھ میں چھوڑ رکھا تھا۔ اسی طرح راجندر گر گوشائیں ان کا ایک سپہ سالار تھا۔ راجہ رام نرائن دیوان تھا اور راجہ لچھمی نرائن ان کی طرف سے دلّی دربار میں وکیل تھا وہ بلا تخصیص مذہب و ملت اپنے دوستوں سے وفاداری برتتے تھے لیکن اس رواداری کے باوصف وہ سیاسی تعصب سے بالاتر نہ تھے اور اپنے مخالفین کو نیچا دکھانے ان کی جاگیریں ضبط کرانے اور ان کے مناصب توڑنے کی فکر میں لگے رہتے۔ انھیں شان و شوکت عزیز تھی، چنانچہ اسی جذبے کی تسکین کے لئے انھوں نے شجاع الدولہ کی شادی پر چھیالیس لاکھ روپیہ صرف کر دیا۔''[۱]

**اب آپ شررؔ کے قلم سے راجہ نول رائے کی صلاحیتوں کا ایک عکس ملاحظہ فرمائیں:**

نول رائے علم دوست، وقت کا پابند، جفاکش، بہادر اور بہت بڑا منتظم تھا اور اس

---

[۱] لکھنؤ کی تہذیبی میراث، ص، ۸۔۵۷

کے ساتھ اسے خدا نے اپنے آقا کی سی اولوالعزمی اور فیاضی دی تھی۔ اس نے ارادہ کیا کہ مچھی بھون کے سامنے دریا پر ایک پل تعمیر کرے۔ پایوں کی بنیاد ڈالنے کے لئے گہرے کنوئیں کھدوائے لیکن پائے بننا شروع نہیں ہوئے تھے کہ اپنے آقا کی طلب پر اسے احمد خاں بنگش کے مقابلے کے لئے جانا پڑا۔ اس مہم میں وہ بڑی زبردست فوج لے کے گیا مگر مارا گیا اور پل کا کام جو چھڑا تھا، ناتمام پڑا رہ گیا۔[1]

صفدر جنگ کی مساعی نے برگ و بار لانا ہی شروع کیا تھا کہ وہ مہلک مرض کا شکار ہو گئے۔ آپ یہ تفصیل شیخ تصدق حسین سے سُنیں:

''صفدر جنگ بہ سلسلۂ انتظام و انصرام صوبہ اودھ پاپر گھاٹ میں مقیم تھے کہ احمد شاہ بادشاہ دہلی نے بعض امرائے سلطنت ومخالفین سے تنگ آ کر ان کو خفیہ طور پر شقہ بھیج کر مع فوج طلب فرمایا۔ مگر بدقسمتی سے اس زمانے میں نواب کے ایک دنبل نکل آیا۔ جس کے اثر سے انھوں نے بتاریخ ۵/اکتوبر ۱۷۵۴ء مطابق ۱۸/ذی الحجہ ۱۲۶۷ھ و بقول امیر علی (۳) بمقام (پاپر گھاٹ) سلطان پور اس دار بے مدار سے کوس رحلت بجا دیا۔ نواب بیگم نے جو سفر وحضر میں نواب کے ہمراہ رہتی تھیں اس واقعہ کو اس خیال سے کہ مبادا کوئی فتنہ عالم غربت میں اُٹھ کھڑا ہو، کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیا اور دوسرے روز صبح کو لاش ہاتھی کی عماری میں رکھ کر سوار ہوئیں اور اسی روز فیض آباد پہونچ گئیں۔ جب محل سرا میں داخل ہوئیں تو یہ سانحہ سب پر آشکار ہوا۔ جنازہ بڑی دھوم سے اٹھایا گیا۔ لاش گلاب باڑی (فیض آباد) میں سونپی گئی، پھر دہلی بھیج کر درگاہ حضرت نظام الدین اولیا سے تھوڑے فاصلے پر سپرد خاک کی گئی۔ جس پر شجاع الدولہ نے تین لاکھ اور بقول دیگر بیس لاکھ روپئے کی لاگت سے ایک نہایت رفیع الشان سنگی مقبرہ معرفت سیدی بلال خاں تعمیر کرادیا جو مغلیہ طرز تعمیر کا ایک بہترین نمونہ تصور کیا جاتا ہے۔[2]

---

[1] گذشتہ لکھنؤ، ص، ۶۶-۷

[2] بیگمات اودھ، ص، ۲۷

''یہ صرف عالی شان مقبرہ ہی نہیں ہے بلکہ عالی شان اور خوش نما مدرسہ بھی ہے جس میں خوبصورت مسجد بھی ہے۔ یہ مدرسہ اور مقبرہ دہلی سے قطب صاحب کے راستے پر ۴/ میل کے فاصلے پر ہے۔اب وہاں ایک ہوائی اڈّہ بھی ہے۔[1]

# شجاع الدّولہ

مرزا جلال الدین حیدر، جوشجاع الدّولہ کے خطاب سے سولہ سترہ برس کی عمر میں ممتاز ہوئے ،صفدر جنگ کے اکلوتے بیٹے اور برہان الملک سعادت خاں بہادر کے سب سے بڑے نواسے تھے۔ پورے کنبے کے چہیتے ،مرزا جلال الدین حیدر کا بچپن ۸/سال کی عمر تک ان کے نانا سعادت خاں کی پرشفقت نگرانی اور قوت بخش دیکھ بھال میں گزرا۔[2]

اُن کی ولادت شاہجہان آباد دلّی میں یوم یکشنبہ ۲۲/رجب ۱۱۴۴ھ کو شہزادہ داراشکوہ کے محل میں ہوئی۔ یہ محل سعادت خاں کی رہائش کے لئے شہنشاہِ ہند نے عطا فرمایا تھا۔ ۲۲/رجب ۱۱۴۴ھ کو شمسی تاریخ ڈاکٹر سری واستوا کے[3] مطابق جنوری ۱۷۳۲ء کی انیسویں اور شیخ تصدّق حسین[4] کی رائے میں پندرہویں تاریخ تھی۔ مادۂ تاریخ ولادت اس شعر کے دوسرے مصرعہ سے برآمد ہوتا ہے ؎

ز دولت خانۂ نواب منصور
برآمد آفتاب از مطلع نور[5]

۱۱۴۴ھ

---

[1] مراۃٔ احمدی،ص،۶۷
[2] شجاع الدولہ ج ا ص،۱
[3] وہی
[4] بیگمات اودھ،ص ۲۳
[5] سوانحات سلاطین اودھ،ج،ا،ص ۵۰

مرزا جلال الدّین حیدر کی رسم مکتب نشینی کی تفصیل نہیں معلوم، لیکن ڈاکٹر آشر وادی لال شریواستوا کا قیاس ہے کہ: ''اس وقت ہندوؤں اور مسلمانوں میں یکساں مقبول ہندوستانی رواج کے مطابق'' پانچویں سال میں بسم اللہ ہوئی ہوگی۔ ڈاکٹر شری واستوا سیر المتاخرین کے حوالے سے بتاتے ہیں کہ ابتداء میں تین معلموں کا تقرر جلال الدین حیدر کی تعلیم کے لئے کیا گیا۔ پھر جب وہ بیس سال کی عمر کے ہوئے تو ایک مشہور ایرانی فاضل شیخ محمد حسین ان کی تعلیم کے لئے مقرر کئے گئے مگر وہ زیادہ دنوں تک نہ رہ سکے اور مذہبی تعلیم کی طرف سے شجاع الدولہ کی بے رغبتی دیکھ کے پٹنہ چلے گئے۔[1] ظاہر ہے کہ یہ روایت قابل اعتبار نہیں کیونکہ بیس سال کی عمر میں شجاع الدولہ لکھنؤ میں تھے ہی نہیں۔

ان کا قیام دلّی میں تھا جہاں وہ اپنے فرائض منصبی کے علاوہ اپنے والد نواب صفدر جنگ کے پرانے حریفوں، خصوصاً ان کے پسر متبنیٰؒ اور اپنے دستار بدل بھائی، بدنام غازی الدّین خاں عماد الملک کی مخالفانہ کاروائیوں کا سدّباب کر رہے تھے۔[2] اور بالفرض اگر وہاں سے ناکام ہو کے اودھ پہنچ گئے تھے تو یہاں کے معاملات میں مبتلا تھے اور باقاعدہ تعلیم کا وقت نکال سکنے کی نہ تو گنجائش تھی اور نہ ذہنی یکسوئی۔ سیر المتاخرین کے مصنّف نے انگریزوں کے ساتھ اپنی حلقہ بگوشی کا اعتراف کیا ہے جس کی تفصیل آئے گی اس لئے یہ روایت ناقابل یقین ہے۔

بہر کیف ڈاکٹر سریواستوا نے شجاع الدولہ کی ذہانت اور علمی حالت کو سراہا ہے۔ قدرے تغیر وتبدل کے ساتھ صفدر حسین کا کہنا بھی یہی ہے:

> ''ان کی تعلیم بہت اعلیٰ پیمانہ پر ہوئی تھی۔ فارسی زبان وادب پر پوری قدرت رکھتے تھے۔ ترکی اور عربی کی بھی اچھی قابلیت تھی۔ وہ مراٹھی اور ہندی سے بھی واقف تھے۔ اور ٹوٹی پھوٹی انگریزی بھی سمجھ لیتے تھے ان کا خط بہت پاکیزہ تھا اور فارسی میں

---

[1] شجاع الدولہ، ج ۱، ص ۲

[2] وہی، ص ۱۱

اندازِ تحریر بھی صاف، رواں اور پرمغز ہوتا تھا۔ان کی ریاضی کی استعداد ایسی تھی کہ سلطنت کے تمام حسابات کی خود ہی جانچ پڑتال کر لیتے تھے۔ ہر شخص کے ساتھ نہایت اخلاق اور ہمدردی سے پیش آتے تھے ان کے حسن اطوار، گفتگو کی نرمی اور اخلاقی جھکاؤ کی جارج فورسٹر نے بہت تعریف کی ہے اور صاحب معدن السعادت نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ ہر وہ شخص جو ان سے مل کر آتا یہی تاثر لیکر آتا تھا کہ نواب وزیر اس کے ساتھ بہت شفقت سے پیش آئے اور دوران ملاقات میں سب سے زیادہ اس پر مہربان رہے۔''[1]

اور اگر یہ بے رغبتی کی روایت درست بھی ہو تو یہ ایسی بات نہیں جو سمجھ میں نہ آسکے۔وہ ساز و آواز کے دلدادہ، فنون لطیفہ کے رسیا اور ان چیزوں میں علمی درک رکھتے تھے۔اور اس رجحان مزاج نے ان کو تعیش کی راہ پر ڈالا اس مذاق و مزاج کے فرمان روا کا فقہ اسلامی کی خشک تعلیم کی طرف رجحان ہونا یوں بھی ممکن نہ تھا۔ پھر تعیش ہی نہیں، سیر وشکار، جانوروں کی لڑائی، کنکوا، کبوتر، سپاہیانہ فنون، تیراکی یہ سب مل کے ان کے پاس کسی بھی علم کا سبق پڑھنے کا وقت کہاں چھوڑتے تھے۔لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ آزاد اور مذہب سے بیگانہ تھے۔ڈاکٹر صفدر حسین ان کی سیرت کے مطالعے سے جس نتیجے پر پہونچے ہیں، اسے ان لفظوں میں پیش کیا ہے:

''شجاع الدّولہ مذہب اثنائے عشری کے پابند تھے اور اس کے رسوم وفرائض پر نہایت خلوص سے کاربند رہتے تھے۔نماز پڑھنے اور روزہ رکھنے میں انہوں نے ہمیشہ باقاعدگی دکھائی۔فریضۂ پنجگانہ کے علاوہ وہ محرم کے رسوم بھی نہایت پابندی سے ادا کرتے تھے۔ پانی پت کی لڑائی سے کچھ مدت پہلے جب وہ احمد شاہ ابدالی کے ساتھ انوپ شہر میں خیمہ زن تھے تو عشرۂ محرم آگیا اور انھوں نے پورے رسوم عزاء وہیں ادا

---

[1] لکھنؤ کی تہذیبی میراث، ص، ۶۴

کئے۔ اسی طرح جب شاہ عالم الہ آباد سے دلّی کی طرف روانہ ہوئے اور انھوں نے نواب وزیر کو طلب کیا تو عشرۂ محرم شروع ہونے والا تھا۔ نواب وزیر نے تمام سامان عزا اور تعزیئے وغیرہ ساتھ لیئے اور سفر پر چل دیئے۔ وہ اور ان کے ساتھی دن میں سیاہ اور سبز کپڑے پہن کر چلتے تھے اور شب میں مجالسِ عزا منعقد کرتے تھے۔''[1]

یہ تعارفی باب کچھ ضرورت سے زیادہ پھیلتا جارہا ہے۔ اتنی جزئیاتی وضاحت کا متحمل نہیں اس لئے اب ہمیں امیر کی حیثیت سے شجاع الدّولہ کے خدمات پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے صوبہ داری اور وزارت اور ان کی تعمیری سرگرمیوں تک پہنچ جانا چاہیے وہ تعمیری سرگرمیاں جنھوں نے ہمارے فیض آباد کی تہذیب وترقی میں تاریخی کارنامہ انجام دیا۔

مرزا جلال الدّین حیدر کو تقریباً ساڑھے سولہ سال کی نوعمری میں ہی میر آتش کا بلند منصب اور شجاع الدولہ کا خطاب مل چکا تھا۔ یہ ١٦/ جولائی ١٧٤٨ء کا واقعہ ہے اس منصب کی بدولت شجاع الدولہ کو قلعہ معلیٰ میں رہائش اور شہنشاہ احمد شاہ کے تقرب کا موقع ملا۔[2]

ایک بار جب ٣/ اگست ١٧٥٠ء کو صفدر جنگ نے احمد خاں بنگش کے خلاف اپنی پہلی مہم پر روانگی کی اجازت پائی اور جب دوسری بار فروری ١٧٥١ء میں دو آبے کے پٹھانوں کے خلاف مہم پر صفدر جنگ روانہ ہوئے، پہلا موقع تو محض دو مہینہ کا مختصر وقفہ تھا لیکن دوسری بار ہونہار بیٹے نے فروری ١٧٥١ء سے مئی ١٧٥٢ء تک قائم مقام وزیر اعظم کی حیثیت سے کام کیا۔''[3]

لیکن یہ منصب برائے نام سارہا اصل اقتدار پرفن خواجہ سرا جاوید خاں کے ہاتھوں میں رہا جس نے شہنشاہ اور شاہ مادر ادھم بائی پر غیر معمولی اثرات رکھنے کی وجہ سے دربار میں

---

[1] لکھنؤ تہذیبی میراث، ص ٦٧

[2] شجاع الدولہ، ج۔۔ ص ٦

[3] شجاع الدولہ، ج ١، ص ٨

بڑی مقتدر جگہ حاصل کر لی تھی۔ ہر چند کہ شجاع الدولہ نے بھی ان سازشوں کا مقابلہ کیا اور اپنی دانشمند ماں کی تلقین سے دس ہزار فوج جمع کر لی اور اپنے دفاع کے لئے پامردی سے کھڑے ہو گئے۔ لیکن کہا جاتا ہے کہ صفدر جنگ نے اخلاقیات کی طرف سے آنکھیں بالکل بند کر کے خالص سیاسی اقدام کیا اور جاوید خاں کو اپنے گھر مدعو کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اور اس طرح ۶/ستمبر ۱۷۵۲ء کے اس واقعہ کے بعد، عارضی طور سے سہی، لیکن صفدر جنگ کو شہنشاہ اور دربار پر پورا قابو مل گیا اور جب ۲۹/ستمبر ۱۷۵۲ء کو عہدوں کی ازسرِنو تقسیم عمل میں آئی تو چار عہدے، احدی رسالے کی کمان، ارض مقرر کی داروغگی، گرز برداروں کی کمان اور جلوخانے کی افسری جو پہلے جاوید خاں کے پاس تھے، اب صفدر جنگ کو عطا ہوئے۔ تین مہینے بعد یکم جنوری ۱۷۵۳ء کو غسل خانہ کی داروغگی بھی عنایت ہوئی۔''[1] اور اب کھلے ہاتھوں کام کرنے کا موقع ملا۔ لیکن صفدر جنگ کے روز افزوں تسلّط نے مخالفوں اور حریفوں کی ایک فوج کھڑی کر دی اور وہ صفدر جنگ و شجاع الدّولہ کے زوال کے لئے سرگرم عمل ہو گئی اور عماد الملک کے تیزی سے بڑھتے ہوئے عروج نے صفدر جنگ اور شجاع الدولہ کو میدان سے بچ نکلنے پر مجبور کر دیا اور یہ لوگ اپنے صوبہ اودھ کی طرف لوٹ آئے۔

لکھنؤ پہنچ کر مغربی اودھ کے نظم و نسق کی اصلاح کا کام صفدر جنگ نے شجاع الدولہ کو سونپا اور خود مشرقی حصّے اور الٰہ آباد کی نگرانی کے لئے ۲۲/دسمبر ۱۷۵۳ء کو فیض آباد روانہ ہو گئے۔[2]

یہ سب مصروفتیں جاری تھیں کہ ۵/اکتوبر ۱۷۵۴ء کو صفدر جنگ کا تابناک چراغ حیات گل ہو گیا۔

شجاع الدولہ اپنے باپ کے اکلوتے بیٹے تھے اور تنہا وارث تھے مغلیہ حکومت میں یہ

---

[1] وہی، ص، ۸

[2] شجاع الدولہ، ج،۱

منصب موروثی ہوتے بھی تھے۔ کچھ صفدر جنگ اپنے زور بازو اور حکمت عملی کا مظاہر کر کے اپنا حق منوا چکے تھے اس لئے شجاع الدولہ کو باپ کی جانشینی کے لئے کسی دقت ومزاحمت کا سامنا نہیں ہوا۔ صفدر جنگ کی نعش ۱۱؍اکتوبر کو دہلی پہنچی اسی دن شام کو شہنشاہ عالم گیر ثانی نے وزیر عماد الملک سے مشورہ کرنے کے بعد دستخط خاص سے شجاع الدولہ کو تعزیت نامہ لکھا۔ جسے عماد الملک نے اپنے خط کے ساتھ شجاع الدولہ کے پاس بھیج دیا۔ ۲۵؍اکتوبر کو شہنشاہ نے خلعت شش پارچہ سرپیچ مروارید وغیرہ بطور تشریفات صوبہ داری اودھ روانہ کئے۔ اگر چہ شاہی خریطے یا فرمان تقرری میں الہ آباد کا کوئی ذکر نہ تھا۔ مگر بے سبب بدامنی سے بچنے کی نیت سے عماد الملک نے الہ آباد کا کوئی مناسب انتظام بھی نہیں کیا اس طرح الہ آباد کی صوبیداری بھی اودھ کی مانند ہی شجاع الدولہ کو میراث جدواب میں حاصل ہوگئی اور وزیر الممالک شجاع الدولہ ابوالمنصور خاں بہادر اسد جنگ کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔[۱]

شجاع الدّولہ کی، اگر چہ پوری زندگی جدوجہد اور کشمکش سے معمور ہے لیکن ان کی زندگی کا ہی نہیں ہندوستان کی تاریخ کا سب سے اہم واقعہ، میر قاسم، ناظم بنگالہ کے ساتھ بکسر کی لڑائی میں انگریزوں سے جنگ اور ان کے ہاتھوں شکست ہے۔ اس واقعہ نے اودھ کو تو برطانوی محکومیت کی طرف ڈھکیلا ہی، ملک گیر پیمانے پر بھی ہندوستان میں انگریزوں کو جمنے اور پھیلنے کا موقع دیا۔ یہاں کسی تفصیل کی تو بڑی گنجائش نہیں لیکن اودھ کے آیندہ فرمان رواؤں کے مشکلات ومسائل سمجھنے کے لئے بھی ضروری ہے اور شجاع الدولہ کی زندگی کی پوری جھلک دیکھنے کے لئے بھی آپ جستہ جستہ واقعات کی یاد مختلف اہل قلم کی کاوشوں کی مدد سے تازہ کریں۔ مولانا ابرار حسین فاروقی رقمطراز ہیں:

''شاہی حکم کی بنیاد پر بیر قاسم صوبہ دار بنگال کی مدد کے لئے جواس وقت انگریزوں

---

[۱] وزیر نامہ، ص، ۳۷

کے نرغے میں تھے اپنی فوج لے کر اس طرف (مارچ ۱۷۶۴ء میں بنارس سے [۱]) روانہ ہو گئے۔ اور بکسر پہنچ کر ۱۷۶۴ء، ۱۱۷۸ھ میں انگریزی فوجوں سے سخت مقابلہ ہوا جہاں ان کو شکست کا منھ دیکھنا پڑا۔'' [۲]

اب شاہ عالم کا رویّہ جن کے حکم سے شجاع الدّولہ نے ان کی رفاقت اور جنگ میں شرکت کی تھی۔ پنڈت سندر لال سے سنیئے:

''۱۵ ستمبر ۱۷۶۴ء کو بکسر میں دونوں طرف کی فوجوں میں نبرد آزمائی ہوئی۔ شاہ عالم کے دل و دماغ پر انگریزوں کی چالوں کا کافی اثر ہو چکا تھا۔

سیر المتاخرین کا مصنف جو اس کام میں انگریزوں کا خاص مددگار تھا۔ لکھتا ہے:

مگر شاہ عالم نے جو اندرونی طور پر وزیر و شجاع الدّولہ سے غیر مطمئن تھا۔ کئی طرح کے بہانے کر کے وقت ٹالنا مناسب جانا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ کچھ پہلے سے ہی انگریزوں سے مل جانے کی تدبیر سوچ چکا تھا۔ انگریز قوم اس مطلب کا کچھ پیام سلام اس کے پاس بھیج چکی تھی جس سے وہ ان سے مل جانے کا متمنّی ہو چکا تھا۔ اور ان کی مدد سے فائدہ اٹھانے کا ارادہ کر چکا تھا۔''

جب خود شہنشاہ ہند کی یہ حالت تھی، تب نہ جانے اور کتنے ہندوستانی سپہ سالاروں نے سرگرم یا سستی آمیز طور پر اس دشمن کا ساتھ دیا ہوگا نتیجہ یہ ہوا کہ دن بھر کے گھمسان میں قریب پانچ، چھ ہزار آدمی کام آئے اور بے یار و مددگار شجاع الدولہ کو اپنی فوج سمیت میدان سے ہٹ جانا پڑا جس میں کہا جاتا ہے اس کے ہزاروں سپاہی گنگا کے دلدل میں پھنس کر رہ گئے۔ [۳]

اس کے بعد شجاع الدّولہ کچھ جان بچاتے، کچھ انگریزوں سے لڑتے بھڑتے اپنا وقت

---

[۱] شجاع الدولہ، ج ۱، ص ۱۶۷

[۲] مراۃ احمدی، ص ۶۷

[۳] بھارت میں انگریزی راج، ج ۱۔ ص ۴۔ ۲۱۳

گزار رہے تھے۔ آخر میں مہاراجہ شتاب رائے کے مشورے و مداخلت سے کمپنی سے تاریخی سمجھوتہ کرلیا۔ ۱۶/اگست ۱۷۶۵ء کے اس صلح نامے کی جو الٰہ آباد میں مرتب ہوا، مختصر تفصیل یہ ہے کہ بیرونی حملے کی صورت میں ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔ الٰہ آباد کے آس پاس کا علاقہ شاہ عالم کو واپس کر دیا جائے۔ غازی پور کے آس پاس کا علاقہ کمپنی کو دیدیا جائے۔ انگریزوں کا وکیل شجاع الدولہ کے دربار میں رہا کرے مگر انتظام ملک میں مداخلت نہ کرے۔ پُرخلوص دوستی، دائمی امن اور مضبوط اتحاد[1] کے اس معاہدہ کے ساتھ پچاس لاکھ روپیہ تاوان جنگ بھی لگایا اور یہ طے ہوا کہ رسم رقم کی ادائی تک چنار گڑھ کا قلعہ کمپنی کے قبضے میں رہے گا۔[2] اور جب اس رقم کا بھگتان ہوگیا تب بھی کمپنی نے قلعہ واپس نہیں کیا۔[3]

اس معاہدے کے بعد فیض آباد واپس آ کر شجاع الدولہ نے ریاست کے انتظام اور فوج کی تنظیم پر پوری توجہ دی لیکن شجاع الدّولہ کی بڑھتی ہوئی طاقت نے بہت جلد کمپنی کو مشتبہ کر دیا۔ پھر شاہ عالم کے بعض درباریوں نے جن میں منیرالدولہ خاص طور پر سرگرم تھے، ان شکوک کو بہت ہوا دی۔ بالآخر کمپنی نے شجاع الدولہ کو مجبور کیا کہ پچھلے صلح نامے کی وضاحت کے لئے بعض فقرات تتمّہ کے طور پر بڑھا دیئے جائیں۔ یہ نیا معاہدہ ۲۹/نومبر ۱۷۶۸ء میں بنارس کے مقام پر ہوا۔ جس کے ذریعے شجاع الدّولہ پر پابندی لگائی گئی کہ ان کی باقاعدہ اور بے قاعدہ فوج کی تعداد پینتیس ۳۵ ہزار سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے۔[4]

اس کے بعد شجاع الدّولہ کی زندگی کے خاص واقعات میں مراٹھوں سے جنگ اور رام گھاٹ کے مقام براون کو شکست دینا تھا۔ پھر روہیلوں سے مقابلہ کر کے روہیل کھنڈ پر قبضہ

---

[1] لکھنؤ کی تہذیبی میراث، ص ۵۹

[2] لکھنؤ کی تہذیبی میراث، ص ۶۰

[3] واجد علی شاہ اور اودھ راجیہ کا پتن

[4] لکھنؤ کی تہذیبی میراث، ص ۶۱

کرلیا۔ ان دونوں مہموں کو شجاع الدولہ نے انگریزوں کی فوجی اعانت سے سر کیا۔ لیکن ان کامیابیوں کی خوشی منانے کا عمر مستعار نے زیادہ موقع نہیں دیا۔ ان کا ۲۶؍ جنوری ۱۷۷۵ء مطابق ۲۲؍ ذیقعدہ ۱۱۸۸ھ کو انتقال ہوگیا اور گلاب باڑی فیض آباد میں آخری آرام گاہ ملی۔ فیض آباد اور لکھنؤ کی آبادکاری میں شجاع الدّولہ کی دین پر نظر ڈالنے سے پہلے ہمیں ان کی والدہ اور خاص محل کے حالات کا سرسری مطالعہ کرلینا اس لئے ضروری ہے کہ شجاع الدّولہ کی زندگی پر ان خواتین کے اثرات کے ساتھ ہی اودھ کی عمومی حالت پر ان کے اثرات کو سمجھا جاسکے۔

شجاع الدّولہ کی ماں صدرالنساء بیگم جو صدر جہاں بیگم کے نام سے مشہور ہوئیں، برہان الملک کی بڑی صاحب زادی تھیں۔ ان کی ولادت ۱۱۲۲ھ کے قریب ہوئی تھی۔ جن کے بعد سے برہان الملک نے ترقی کی منزلیں اتنی جلد طے کیں کہ وہ ان کو بہت مبارک قدم خیال کرنے لگے، صدرالنساء کی شادی مرزا محمد مقیم اپنے بھانجے سے کی، یہ رشتہ بھی نہایت مبارک ثابت ہوا۔ نواب صدر جہاں بیگم کی شجاعت و ہمت نے صفدر جنگ اور شجاع الدولہ کو جو مدد پہونچائی اگر وہ نہ ہوتی تو نہیں کہا جاسکتا کہ ان کی زندگی اتنی ہی کامیاب وقابل قدر ہوتی! چند واقعات آپ شیخ تصدّق حسین سے سنیں:

''صفدر جنگ نے احمد خاں نواب بنگش پر یورش کی تو شومئ قسمت سے لڑائی بگڑ گئی۔ بندوق کی ایک گولی صفدر جنگ کی گردن پر لگی جس سے وہ بیہوش ہوکر ہاتھی کے ہودہ میں گر گئے۔ راجہ جگت نرائن برادر راجہ لچھمی نرائن دیوان صفدر جنگ نے بجائے فیل بان ہاتھی پر بیٹھ کر اس کو میدان کارزار سے نکال کر دہلی کی راہ لی۔ میدان سے صحیح سلامت واپسی پر نواب بیگم سجدۂ شکر بجالائیں اور بطور تشکر خزانہ کا منھ کھول دیا اور جن ملازمین نے آڑے وقت میں نواب کا ساتھ دیا تھا ان میں سے بعضوں کو خلعت اور بعضوں کو گراں بہا تحائف تقسیم کئے۔''[1]

---

[1] بیگمات اودھ، ص ۲۴

جاوید خاں کے مقابلے میں صف آرائی کے لئے شجاع الدولہ کو ماں کی ترغیب کا واقعہ ہم دیکھ چکے ہیں۔ صفدر جنگ کی وہ مہم جس میں انہوں نے اودھ بنگشوں سے پھر واپس لیا نواب بیگم کی تحریک اور ایثار کا ثمرہ ہے جنھوں نے صفدر جنگ سے کہا۔

''اگر روپیوں کی ضرورت ہو تو گیارہ لاکھ روپئے اور چار ہزار اشرفیاں میرے پاس موجود ہیں انہیں لے کر اپنا کام نکالو۔ یہ نوید جاں فزاء سن کر نواب کا دل باغ باغ ہو گیا۔ دوسرے ہی روز صبح کو راجہ ناگرمل، راجہ لچھمی نرائن، راجہ سورج مل، محمد اسماعیل خاں کابلی و چند دیگر ہوا خواہوں کو طلب کر کے بعد مشورہ سامان جنگ درست کیا اور حریف سے مقابلہ کر کے بصورت صلحنامہ اودھ پر دوبارہ قبضہ کیا۔''[۱]

شجاع الدولہ کی نسبت ایک کریہہ واقعہ مشہور ہے جسے اکثر لوگوں نے سپرد قلم کیا ہے اس واقعے کے اثرات نہایت خطرناک ثابت ہوتے اگر نواب بیگم کی شخصیت پناہ گاہ نہ بن جاتی۔ شیخ صاحب تحریر کرتے ہیں:

''شجاع الدّولہ ایک کھتری کی اٹھارہ سالہ پری جمال لڑکی کو کوٹھے پر دیکھ کے ایسے فریفتہ ہوئے کہ دامن صبر وقرار ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ امراؤ گری وانوپ گری دوناگوں کی معرفت لڑکی کو تاریکیٔ شب میں مکان سے اٹھوا منگوایا اور اپنی آتش ہوس بجھا کر کرن پھوٹنے سے قبل ہی پھر اس کو مکان بھجوا دیا۔ لڑکی کے اعزہ نے راجہ رام نرائن دیوان سے فریاد کی اور دس بارہ ہزار کھتریوں کی جماعت اسمٰعیل بیگ کابلی سپہ سالار کے پاس بھی گئی جو چاہتے تھے کہ نواب کے بجائے نواب محمد قلی خاں کو مسند نشیں کر کے خود صاحب اختیار ہو کر رہیں چنانچہ حسب قرارداد نواب کو پیغام بھیجا گیا کہ ہمت بہادر اور اس کے بھائی کو بھیج دیجئے۔ نواب نے جواب دیا کہ اپنے فعل کا ذمّہ دار میں خود ہوں نہ کہ ہمت بہادر ...... جب یہ خبر نواب بیگم کے کانوں تک پہنچی تو راجہ رام نرائن، اسمٰعیل بیگ خاں اور

---

[۱] بیگمات اودھ، ص ۲۵

دوسرے افسران مغلیہ کو در دولت پر بلوا کر کافی فہمائش کی...........اس کے بعد بغرض تالیف قلوب بعضوں کو خلعت اور باقی ماندہ کو پاندان عنایت کئے۔''[۱]

نواب بیگم اتنی بلند حوصلہ تھیں کہ ۱۷۶۴ء میں جب شجاع الدّولہ جنگ بکسر کو جانے لگے تو بیگم نے ان سے فرمایا کہ چاہے سب انگریزوں کو جڑ بنیاد سے نیست و نابود کر دینا مگر میری پالکی اٹھانے کو بارہ انگریز افسر ضرور لیتے آنا۔[۲]

مختارالدولہ کے بہکانے سے آصف الدولہ نے......اپنی دادی نواب بیگم پر بھی ہاتھ صاف کرنا چاہا......وہ فوراً تاڑ گئیں کہ یہ بیج مختارالدولہ کا بویا ہوا ہے۔ چنانچہ قرب و جوار کے زمیں داروں اور راجاؤں کے نام قطعیٔ حکم نامہ جاری کر دیا کہ کل صبح کو کمک کے لئے کمر بستہ ہو کے در دولت پر حاضر ہو۔مختارالدّولہ نے جب رنگ بیرنگ دیکھا تو صبح کو منھ اندھیرے پالکی پر سوار ہو کر فیض آباد سے کھسک گئے۔''[۳]

جب آخری بار مختارالدّولہ فیض آباد بھیجے گئے تو بذریعہ محرم علی خاں ناظر نواب بیگم کی خدمت میں یہ پیغام بھیجا کہ یہ کل روپیہ واسباب تو بہو بیگم صاحبہ نے اپنے لختِ جگر کو عطا کیا ہے۔اب بیگم صاحبہ کو جو ہم دونوں کی بزرگ ہیں اس موقع کی یادگار میں کچھ انعام دے کر فدوی کو بھی افتخار بخشنا چاہیے۔نواب بیگم بوجوہ مختارالدولہ کو اپنے خاندان کا سخت مخالف و معاند تصور کرتی تھیں مگر آصف الدّولہ سے مجبور تھیں۔ چنانچہ انہوں نے یہ جواب کہلا بھیجا کہ میرے خزانے میں اس وقت صرف چار پانچ لاکھ روپئے موجود ہیں جو میں نے زیارت مقامات مقدّسہ کے لئے جمع کئے ہیں مگر کل صبح کو ڈیوڑھی پر حاضر ہوں تو ان کو کچھ دے کر ان کی خوشی کر دوں گی۔ یہ جواب دے کر نواب بیگم نے اپنے خواجہ سراؤں کو طلب کر کے حکم دیا کہ تم لوگ مستعد رہنا کل صبح کو جب مختارالدولہ یہاں آئیں تو ان کو ڈیوڑھی میں بٹھا کر انعام

---

[۱] وہی، ص ۲۵

[۲] بیگمات اودھ، ص ۲۸

[۳] وہی، ص ۲۹

واکرام کی باتوں میں لگالینا۔ جب وہ گفتگو میں مشغول ہوجائیں تو سر پر بے بھاؤ کے لگانا اور مارتے مارتے کام تمام کردینا مگر مختارالدولہ کے گویندوں نے ان کو ان منصوبوں کی خبر کردی اور دوسرے دن صبح کو وہ پوشیدہ طور سے لکھنؤ چلے آئے۔"[۱]

اس باعظمت خاتون کا جسے مولوی فیض بخش کاکوروی نے بلحاظ پارسائی وتقویٰ وعبادت نہایت ممتاز درجہ کی خاتون پایا ہے، نیز لکھا ہے کہ:

حیا پروری، پاکبازی، فیاضی اور انصاف پسندی میں تو اس زمانے کی کوئی خاتون ان کی ہم پلّہ نہ تھیں۔ ۶ / جون ۱۷۹۶ء کو بحالت نماز ظہر انتقال ہوگیا۔ گلاب باڑی میں شجاع الدولہ کے برابر دفن کی گئیں۔

بنگلہ خراب شد۔ ۱۲۱۴ھ

مادہ تاریخ وفات ہے۔[۲]

نواب شجاع الدّولہ کی خاص محل امۃ الزہرا بیگم، موتمن الدولہ محمد اسحاق خاں صوبہ دار گجرات کی دختر نیک اختر تھیں۔ شادی کے بعد جناب عالیہ بہو بیگم صاحبہ خطاب ہوا۔ شادی کے بعد رخصت ہوکر فیض آباد آئیں اور یہیں کی ہوکے رہ گئیں۔ ان کی قربانیاں بھی اپنے شوہر کے ساتھ یادگار رہیں۔ جنگ بکسر میں انگریزوں سے شکست کھانے کے بعد زرتاوان کی ادائی کے لئے اپنا کل زرنقد اور جڑاؤ زیور حتیٰ کہ ناک کی نتھ تک نواب کے حوالے کردی جسے فروخت کرکے تاوان جنگ ادا کیا گیا اور نواب زندگی بھر بیگم کا احسان مانتے رہے۔ غالباً یہ احسان مندی بھی اس بات کی بڑی وجہ تھی کہ نواب شجاع الدولہ نے اپنے بعد کے لئے وارث وجانشین کی حیثیت سے آصف الدولہ کو نامزد کیا تھا۔ مگر انگریزوں نے ماں بیٹوں کے تعلّقات میں زہر بو کے دونوں کو خوب لوٹا۔ نواب بہو بیگم صاحبہ کا کافی اثاثہ جبر وتعدی کے ساتھ انگریزوں کے اشارے پر آصف الدولہ نے حاصل کیا۔ وارن ہسٹینگز کی

---

[۱] بیگمات اودھ، ص، ۳۰

[۲] بیگمات اودھ، ص ۳۲

روبکاری میں یہ معاملہ بھی شامل تھا۔کمال الدین حیدر کہتے ہیں:

''مشروحاً اس مقدمے کی تصریح روبکاری وارن ہسٹینگز گورنر جنرل بہادر سے جو لندن میں ہوئی۔ظاہر ہے اور اکثر کتب تواریخ انگریزی میں مندرج ہے حاصل مطلب یہ ہے کہ نواب گورنر جنرل کیوں اس امر ضبطی کے مانع ہوئے اسی روبکاری وغیرہ میں جتنا روپیہ ہندوستان سے ذاتی لے گئے تھے وہ سب حقوق وکلائے عدالت میں صرف ہوا۔''[۱]

آصف الدولہ اور ان کے نائب مختار الدولہ کی پشت پناہی کے باوجود انگریز ایسے حالات پیدا کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے کہ نواب بہو بیگم صاحب نے اپنا باقی ماندہ تمام سرمایہ علاقہ اور اثاثہ کا وثیقہ قائم کر کے کمپنی کی ودیعت میں وثیقہ نامہ مورخہ ۲۶/رجب ۱۲۲۸ھ مطابق ۲۵/جولائی ۱۸۱۳ء کی رو سے دیا اور جسے لارڈ مایرا نے اپنے تعہد نامے کے ذریعہ ۲۹/اکتوبر ۱۸۱۳ء کو قبول کیا۔

چنانچہ ان کے انتقال کے بعد تقریباً ایک کروڑ روپیہ کا اثاثہ انگریز کمپنی کی تحویل میں آیا۔جس میں دس ہزار سالانہ منافع کی جائداد بھی شامل تھی۔اس وثیقے کی غرض بہو بیگم نے اپنے رشتہ داروں،متوسلوں وغیرہ کی نسلاً بعد نسلٍ پرورش،اپنے مقبرہ کی تعمیر و تحفّظ اور امور خیر کو بتایا تھا۔بعد میں علاقہ ایک لاکھ چھیاسٹھ ہزار روپئے کے بدلے میں غازی الدین حیدر کو واپس کر دیا گیا اور کمپنی دس ہزار سالانہ اس مد میں صرف کرتی رہی لیکن اب شرح منافع گھٹ جانے سے یہ رقم چھ ہزار سے کچھ زائد رہ گئی ہے۔

مختلف تبدیلیوں کے بعد اب اس کا انتظام حاکم ضلع خود اپنی مقرر کردہ مشاورتی کمیٹی کے ذریعہ کرتے ہیں،لیکن فیض آباد کی مذہبی اور سماجی زندگی میں اب بھی اس کی وجہ سے بہت چہل پہل ہے۔خاندان پیش نماز،جس کے مورثِ اعلیٰ نواب بہو بیگم صاحبہ کی طلب پر فیض آباد آئے تھے،کے موجودہ سربراہ مولانا ابن حسن صاحب اب بھی امور مذہبی کے

---

[۱] سوانحات سلاطین،ج ۱،ص ۹۲

نگراں اور نماز جمعہ و جماعت کے ذمّہ دار ہیں۔

بہر کیف بہو بیگم صاحبہ کے اس اقدام کو اس وقت کے حالت کے سیاق میں جیسا بھی کہا یا سمجھا جائے لیکن آج ان کا مقبرہ فیض آباد کی زینت کا سبب ہے اور وثیقہ ان کی ترویح روح اور ایصال ثواب کا ذریعہ اور بندگان خدا کی اچھی خاصی تعداد کی روزی کا حیلہ ہے۔

آیئے اب فیض آباد پر ایک نظر ڈالیں۔صفدر حسین کہتے ہیں:

''شجاع الدولہ کو عمارات بنانے اور باغات لگانے کا بھی بڑا شوق تھا انہوں نے پانڈیچری سے ایک فرانسیسی معمار بلایا تھا جس نے اینٹوں کے ایک خوبصورت محل کا نمونہ بنایا تھا۔لیکن عمارت کی تعمیر شروع ہونے سے قبل انہیں مراٹھوں کے مقابلے کے لئے جانا پڑا اور پھر بعض وجوہ سے وہ تجویز ملتوی ہوگئی۔اس کے کچھ زمانے بعد انھوں نے بنگال گورنمنٹ کی معرفت سوئزرلینڈ کے ایک انجینئر میجر پولیر کی خدمات حاصل کیں اور اس کی نگرانی میں انھوں نے برہان الملک کے کچے قلعہ کی دیواریں دوبارہ تعمیر کرائیں اور ایک محل اور دومٹی کے قلعہ بنوائے۔تمام عمارتوں اور محلوں کو رنگین نقش کاری سے سجایا۔ قلعہ کے ایک طرف دریائے گھاگرا واقع تھا باقی تین اطراف میں دو دو میل تک میدان چھوڑ کر چاروں طرف خندق بنوادی۔اس میدان کے بیچ میں ان کے رشتہ داروں،فوجی افسروں اور عملہ کے ملازموں نے مکانات اور دیوان خانے تعمیر کرائے تھے۔ یہاں چونکہ ہر نسل اور ہر قوم کے سپاہیوں،شہریوں اور تاجروں کے آنے کا تانتا بندھ گیا،اس لئے بہت جلد یہ وسیع زمین تنگ نظر آنے لگی تھی۔ کچھ عرصے بعد تمام شہر کے چاروں طرف ایک فصیل بنوادی گئی جس کی چوڑائی درمیان میں دس گز اور منڈیر پر پانچ گز ہوگی۔اس شہرِ پناہ کے اوپر سرخ وردی میں باقاعدہ فوج اور سیاہ وردی میں بے قاعدہ فوج،دن رات متعین رہتی تھی۔شجاع الدّولہ نے شہر کی زیبائش کے خیال سے ترپولیا اور چوک بازار بھی بنایا۔یہ بازار قلعہ کے جنوبی دروازے سے الہ آباد کے ناکے تک چلا گیا تھا۔اور چوڑائی اتنی تھی کہ دس گاڑیاں بیک وقت آسانی سے گزر سکتی تھیں۔''

حصار شہر کے اندر ہی چار باغ جوابی انداز پر لگائے تھے۔ ان میں موتی باغ، چوک بازار کے وسط میں واقع تھا۔ لال باغ جو رقبہ میں تمام باغوں سے بڑا تھا اپنے پھولوں کے تنوع اور خوبصورتی کی وجہ سے تمام صوبے میں مشہور تھا۔ یہ اتنا دلکش باغ تھا کہ جب شاہ عالم الہ آباد سے فیض آباد آئے، تو انھوں نے اسی باغ میں قیام کیا۔ ان باغوں کے علاوہ آصف باغ اور بلند باغ لکھنؤ کی سمت حصار شہر کے اندر ہی تھے۔ انگوری باغ محل میں واقع تھا اور اس میں قلعہ کا ایک چوتھائی حصہ آ گیا تھا۔ ان باغات کی دیکھ بھال کے لئے ایک ہزار مالی ملازم تھے۔

شجاع الدولہ کے استحکام قوت کی شہرت کے ساتھ ساتھ شہر کی آبادی میں اضافہ بھی ہوتا جا رہا تھا۔ اور سامان تجارت بڑی کثرت اور تنوع کے ساتھ بازاروں میں موجود رہتا تھا۔ جب ملکی استحکام کا شہرہ نزدیک و دور پہونچا تو اطراف و جوانب سے ہزار ہا خاندان فیض آباد آ کر جمع ہونے لگے۔[۱]

**اب مولانا شررؔ کا بیان دیکھیں:**

''نواب شجاع الدولہ بہادر کو شہر کی درستی کا اس قدر شوق تھا کہ ہر صبح و شام سوار ہو کے سڑکوں اور مکانوں کا معائنہ کرتے۔ مزدور پھڑوے اور کدالیں لئے ہوئے ساتھ ہوتے۔ جہاں کسی مکان کو ٹیڑھا اور اپنی حد سے بڑھا ہوا پاتے یا کسی دوکاندار کو دیکھتے کہ اس نے سڑک کی زمین بالشت بھر بھی دبالی ہے، فوراً اسے کھدوا کے برابر سیدھا کرا دیتے۔''[۲]

**علمی مرکز کی حیثیت سے فیض آباد کی رونق بھی آپ شررؔ سے سنیں:**

''طالب علموں نے وطنوں کو خیر باد کہہ کے فیض آباد ہی کو اپنا مسکن بنالیا اور یہاں ہر زمانہ میں ڈھاکے، بنگالے، گجرات، مالوہ، حیدر آباد، شاہجہاں آباد، لاہور، پشاور، کابل،

---

[۱] لکھنؤ کی تہذیبی میراث، ص ۶۸

[۲] گزشتہ لکھنؤ، ص ۴۶-۴۷

کشمیر اور ملتان وغیرہ کے طالب علموں کا ایک بڑا بھاری گروہ موجود رہتا جو علماء کی درسگاہوں میں تعلیم پاتے اور اس چشمۂ علم سے جو فیض آباد میں جاری تھا، سیراب ہو ہو کے اپنے گھروں کو واپس جاتے۔"[1]

فیض آباد کی شجاع الدولہ کی تعمیرات میں گلاب باڑی کی اہمیت و رونق آج بھی برقرار ہے، اس کی تعمیر انھوں نے ۱۷۵۳ء میں کرائی تھی۔ جب انتقال کیا تو یہی ان کا مدفن بنی اور ۱۷۸۹ء میں مقبرہ تعمیر ہوا۔ اجودھیا اور فیض آباد کی وسط راہ میں ہونے کی وجہ سے اس میں رونق و چہل و پہل زیادہ ہے۔

پہلے تو بہو بیگم انتظام کرتی تھیں بعد میں سرکاری انتظام ہو گیا۔ موجودہ زمانہ میں عمارت محکمۂ آثار قدیمہ سے متعلق ہے۔ باغات سپرنٹنڈنٹ گورنمنٹ گارڈن کی نگرانی میں ہیں۔ مزار اور اس کے متعلق امُور مذہبی محکمۂ نزول کے ذمہ ہیں۔ اگرچہ محرم چہلم اور دوسری تقاریب مذہبی ہوتی رہتی ہیں مگر برائے نام۔ غالباً اس کے لئے کوئی شاہی وثیقہ یا ٹرسٹ نہیں ہے۔ سرکاری خرچ سے کام چلایا جا رہا ہے۔ یہاں کے نگراں بھی پیش نماز صاحب ہی ہوتے ہیں۔

شجاع الدولہ کو لکھنؤ کی آبادکاری کا موقع نہ ملا۔ وہ پایۂ تخت فیض آباد سے لکھنؤ منتقل کرنے کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ پیام اجل آپہونچا۔[2]

اودھ میں اردو شعر و ادب کی ترقی کی راہ بھی اسی عہد میں ہموار ہوئی جب نواب بہو بیگم کے بھائی نواب سالار جنگ کے ساتھ سراؔج الدین آرزوؔ خان علامہ نے فیض آباد کا رُخ کیا۔[3] میر انیسؔ کے جداعلیٰ میر ضاحکؔ بھی اس دور میں فیض آباد آئے اور پھر تو اردو کے اہل کمال نے فیض آباد و لکھنؤ کو گلزار بنا دیا اور اس گلزار پر بہار آصف الدولہ کے عہد میں آئی

---

[1] وہی، ص، ۵۱

[2] مراۃ احمدی، ص ۷۰

[3] ابواللیث صدیقی، لکھنؤ کا دبستان شاعری، ص ۷۸

جن کی طرف اب ہم کو رجوع کرنا چاہیے۔

## آصف الدّولہ

محمد یحییٰ عرف مرزا امانی، نواب شجاع الدولہ کی خاص محل امۃ الزّہرا بیگم عرف نواب بہو بیگم صاحبہ کے بطن سے ۱۱۶۱ھ کے اواخر میں پیدا ہوئے۔ مرزا امانی نواب صفدر جنگ کے سب سے بڑے پوتے تھے اور ان کی وفات سے کافی قبل پیدا ہوئے تھے، مرزا امانی کی پرورش بڑے ناز و نعم اور تعلیم و تربیت بڑے اہتمام سے ہوئی۔ محمد شاہی دربار کے تربیت یافتہ سید شرف الدّین ان کی تعلیم کے لئے بطور اتالیق رکھے گئے۔[۱]

ڈاکٹر شریواستوا ایک دوسرے اتالیق کا نام عصمت اللہ بتاتے ہیں۔[۲] ڈاکٹر صفدر حسین کی رائے میں مرزا امانی کو انتظام ملکی کا سلیقہ نہ تھا۔ ان کے برخلاف ان کے دوسرے بھائی مرزا اسعادت علی خاں، خیرآباد کے ناظم اور بریلی کے صوبیدار رہ چکے تھے۔[۳]

مگر ڈاکٹر صفدر یہ رائے قائم اور تبصرہ پیش کرتے وقت بعض حقائق کو نظر انداز کرتے ہیں۔ ڈاکٹر آشیر وادی لال نے ایسے کئی موقعوں کا تذکرہ کیا ہے جب مرزا امانی کو نہایت اہم ذمہ داریاں ان کے مدبر و فرزانہ والد نے سونپیں۔ ایک تو مرہٹہ، افغان جنگ میں مشغول رہنے اور خلعت وزارت پانے کے بعد جب اپنے اہل و عیال کو لکھنؤ بھیجا تو صوبوں کا انتظام مرزا امانی کو سونپا اور ان کا نگراں اور مشیر راجہ بینی بہادر کو مقرر کیا۔[۴] ان کو آصف الدولہ کا خطاب بھی مسند نشینی سے پہلے ہی مل گیا تھا اور اس امر میں وہ باپ کے خلف الصدق ثابت ہوئے تھے۔ یہ خطاب ان کو اس وقت ملا جب وہ بطور منصب دار، فہرست امراء میں

---

۱ لکھنؤ کی تہذیبی میراث، ص ۴۷

۲ شجاع الدولہ، ج ا، ص ۱۲۴

۳ لکھنؤ کی تہذیبی میراث، ص ۴۷

۴ شجاع الدولہ، جا، ص ۸۵

مندرج ہوئے اور میر آتش کے عہدے پر معین ہوئے۔[1]

اور پھر اس منصب کی ذمہ داریوں کے ساتھ ہی ساتھ ان کو دیوان خاص کی داروغگی بھی عطا ہوئی اور ان کے سابق اتالیق اس منصب کی ذمّہ داریوں میں مدد دینے کے لئے ان کے نائب مقرر ہوئے۔[2] یہ سب ذمّہ داریاں کسی حال میں خیرآباد کی نظامت اور بریلی کی صوبہ داری سے کم رتبہ نہ تھیں۔ بلاشبہ وہ بزم امراء میں اپنے نامور باپ سے بھی زیادہ کامیاب فرمانروا ثابت ہوئے۔لیکن میدان رزم میں اپنے فرس ہمت کو باپ کے نقش قدم کی تلاش وتتبع میں دوڑانے کی صلاحیت ان میں نہ تھی اس کے اور وجوہ بھی ہونگے،لیکن سب سے بڑی وجہ ان کی جسمانی بناوٹ کا نقص تھا۔ڈاکٹر صفدر ہی بتاتے ہیں:

”آصف الدولہ اپنے والد کے ہم صورت تھے لیکن ان کا جسم بڑا بے ڈول تھا۔کمر سے اوپر کا حصّہ خاصا لمبا تھا،کان، گردن، ٹھڈی بھاری تھی۔،انگلیاں چھوٹی اور موٹی تھیں مگر کمر کے نیچے کے اعضا بہت چھوٹے تھے اتنے چھوٹے کہ پاؤں رکاب تک نہ پہنچنے کی وجہ سے گھوڑے کی سواری نہیں کر سکتے تھے۔ وہ بیٹھے ہوئے اچھے جوان معلوم ہوتے تھے لیکن جب کھڑے ہوتے تو ان کا سر دوسروں کی کمر تک بھی نہ پہنچتا تھا۔“[3]

وہ اپنی اس کمزوری سے خود بھی واقف تھے اور ان سے زیادہ ان کا عیار حریف انگریز واقف تھا اور ان کا کیا سوال ہے ہمّت آزما اور اسم بامسمیٰ باپ کو ہی انگریزوں نے پھر اسلحہ خانہ کی طرف دیکھنے کا موقع کہاں دیا!

اس کے ثبوت کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں بس اتنا یاد کرلینا کافی ہے کہ آصف الدوّلہ کی جانشینی کی استدعا قلعہ معلیٰ سے نہیں فورٹ ولیم سے کی گئی تھی۔ہم ابھی یہ دیکھ چکے ہیں کہ شجاع الدولہ نے دوبارہ فوجی تنظیم کی جب کوشش شروع کی تو انھیں معاہدہ

---

[1] وہی،ص، ۱۱۷

[2] وہی،ص، ۱۲۶

[3] لکھنؤ کی تہذیبی میراث،ص ۶۰

الٰہ آباد کا ایک تتمہ بنارس میں لکھنا پڑا اور یہ تسلیم کرنا پڑا کہ وہ پینتیس ہزار سے زائد کل با قاعدہ و بے قاعدہ فوج نہیں رکھیں گے۔ اس لئے روز افزوں انگریزی تسلط کا تعلق فرماں روا کی اہلیت اور نا اہلیت سے بہت زیادہ نہیں ہے۔ پھر آصف الدولہ اور سعادت علی خاں کے مزاجوں کا فرق ایسا نہیں ہے کہ جسے نظر انداز کر کے صحیح نتائج پر پہونچا جا سکے۔ مہاراجہ جھاؤ لال کے اخراج کا ایک ہی واقعہ تھا۔ جس کے بعد آصف الدولہ ریاست سے نہیں، اپنی جان سے عاجز آ گئے۔ سعادت علی خاں کی کوئی گت بیلی نے نہیں چھوڑی۔ مگر لارڈ مایرا کے لئے ڈالی بھیجنے کے سوا ان سے کچھ بھی کرتے دھرتے نہ بنا۔ سعادت علی خاں کی تمام بیدار مغزی، ہوشیاری، نظم ونسق کی چوکسی کے باوصف، محل میں ریذیڈنٹ کی اتنی گھس بیٹھ تھی کہ انہیں زہر کا پیالہ دے دیا گیا۔ اس لئے کوئی رائے قائم کرنے سے قبل انگریزوں کی حکمت عملی اور شاطرانہ چالوں اور درباری اُمراو حکام کی ایمان فروشی کو فراموش کرنا خلاف انصاف ہے۔ بہر حال یہ مبحث بہت طولانی بحث، معروضی مطالعہ اور طہارت ذہن ونظر چاہتا ہے اور فرد واحد کے بس کا کام نہیں۔ ہندوستان کے سیاق وسباق میں آزاد تاریخ نویسی کا جذبہ اُبھر رہا ہے اور اس کی چھوٹ اودھ پر بھی پڑے بغیر نہ رہے گی۔ اس لئے اب آیئے آصف الدولہ کی سرگزشت کو دیکھیں۔

شجاع الدولہ نے گورنر جنرل وارن ہسٹینگز کو خط لکھ کر آصف الدولہ کی جانشینی کا اعلان کر دیا تھا۔ انہوں نے بتا دیا تھا کہ ''اگر کمپنی کا رویہ ٹھیک رہا تو آصف الدّولہ ہمیشہ کمپنی کا خیر خواہ اور مخلص رہے گا۔''[۱] مگر انگریز اب ایسے خالی خولی وعدوں پر کہاں بس کرنے والا تھا۔ اس لئے آصف الدّولہ مسند نشین تو ہوئے مگر اس شرط پر کہ ''ایک بریگیڈ جبریہ اودھ میں چھوڑی گئی جس کا صرفہ ۲۶ لاکھ روپیہ ماہوار نواب کے ذمہ عاید ہوا۔''[۲]

یہ تو کھلی لوٹ تھی در پردہ چوٹ یہ دی گئی کہ نواب کو ماں اور دادی کے اثاثے پر قبضہ

---

[۱] لکھنؤ کی تہذیبی میراث، ص، ۷۱

[۲] وہی، ص ۷۴

کرنے کے لئے اُکسا کے کھلّم کھلا لڑاؤ اور راج کرو، کی تلوار تیز کر لی گئی۔ اسی اختلاف کا شاخسانہ تھا کہ آصف الدّولہ کو فیض آباد سے ہجرت کر کے لکھنؤ بسانا پڑا۔

آصف الدّولہ کے دور کے یہ دو تاریخی اہمیت کے حامل واقعے ثابت ہوئے کہ انگریزی فوج کا قیام اودھ کے خرچ پر اور دربار و محل میں کھلم کھلا اختلاف اور اس کے انجام کار فیض آباد کا انحطاط اور لکھنؤ کی ترقی۔ تیسری بات یہ ہوئی کہ تشیع کو بطور مسلک اپنی جگہ بنانے اور میدان میں آنے کے لئے پہلے پہل سازگار فضا اسی دور میں ملی۔ اسی دربار کے ایک امیر حسن رضا خاں کے جذبۂ دینی کی بناء پر مولوی سید دلدار علی (غفران مآب ۱۲۳۵ھ۔ ۱۱۶۶ھ) کو عراق جا کر اجازۂ اجتہاد حاصل کرنے کا موقع ملا اور پھر انھیں کی قدر شناسی کی بدولت دربار وزارت کے توجہات حاصل ہوئے۔''[1]

یہی وہ تخم ریزی تھی جس نے تاریخ نگاروں کے ایک حلقے کو آصف الدولہ کا چہرہ مسخ کرنے کی ترغیب دی اور جب امجد علی شاہ کے دور میں اس شجر پر بہار جانفزا آئی تو ان کے فضیحت کرنے کی کوشش کھل کے کی گئی۔

آصف الدولہ کے ہی دور میں دو امیروں مہاراجہ جھاؤ لال اور بالک رام نے انگریزوں کو ہندوستان سے نکال باہر کرنے کا سوچا سمجھا منصوبہ بنایا۔ اس منصوبہ کی ناکامی اور انگریزوں کے جبر و تعدی سے مجبور ہو کے جھاؤ لال کے اخراج کا حکم دینے کے بعد آصف الدولہ نے اپنے دور زندگی کو مختصر کرنے کی تدبیریں خود ہی شروع کر دیں۔ مہاراجہ پر الزام یہ تھا کہ ان لوگوں نے زماں شاہ ابدالی، سندھیا نواب محمد علی خاں والی ارکاٹ اور راجپوتانہ کے امراء سے انگریزوں کے خلاف سازش کی۔ تفصیل کمال الدّین حیدر بیان کرتے ہیں:

''اصل قصّہ بھی بہت بڑا ہے کہ کون کون اس کا بانی مبانی تھا۔ اور کیوں کر یہ راز مخفی حکام عالی شان پر کھل گیا۔ چنانچہ اسی ذیل میں نواب شمس الدولہ بھی گرفتار ہوئے اور کئی

---

[1] محمد باقر شمس لکھنؤ۔ ہندوستان میں شیعیت کی تاریخ، ج ۱، ص ۱۰

اشخاص اس کی گواہی میں گئے۔مثل مرزا ابراہیم خاں ومرزا ابوالقاسم خاں وغیرہ۔خلاصہ بعد ثبوت اسناد خطوط مرسلہ وروبکاری رائے بالک رام محرر خطوط، صاحب ریذیڈنٹ نے ازراہ مصلحت بزبان شیریں جناب عالی سے کہا کہ دشمن سرکار جناب عالی ہمارا دشمن اور دوست حضور ہمارا دوست،کس واسطے کہ یہ امر ابتدا سے داخل عہد نامہ سرکاریں منضبط ہو چکا ہے۔جناب عالی نے اس کی تصدیق فرمائی۔عرض کی جھاؤلال و بالک رام نے چاہا کہ سراسر خیر خواہی جناب عالی کریں اور ہماری سراسر بدخواہی جس سے ہماری بنیاد ریاست ہندوستان میں خلل پڑتا ہے۔یہ خطوط ان کے شاہد حال ہیں۔لہٰذا حضور ایسے شخص کو ہمارے سپرد کریں کہ وہ ہمارے ملک میں جا کر رہے۔ہم باعزت رکھیں گے ............جناب عالی نے معقول ہو کر اسے قبول فرمایا اور بظاہر کوئی چارہ علاج باقی نہ رہا تھا، جسے فرماتے سراسر مجبور ہوئے۔''[۱]

آپ یہاں ابوطالب اصفہانی کا بیان بھی دیکھیں، وہ انگریزی مفاد کا ہوشیار وکیل اور بہتر ترجمان ہے تاکہ تفضّل حسین خان علامہ کی اس انگریزی بھگتی کا صحیح اندازہ ہو جائے، جس کے اصل جوہر وزیر علی خاں آصف جاہ کی تباہی اور سعادت علی خاں کی مسند نشینی میں آئے۔ابوطالب کہتا ہے:

''لیکن گورنر نے جان لیا کہ الماس خاں کو نائب بنانا ایسا ہی ہے جیسے دنبہ کو بھیڑیئے کے سپرد کرنا۔لہٰذا اس کو قبول نہیں کیا اور تفضّل حسین خاں کے لئے درخواست کی ...... گورنر نے اس کام کے طے ہونے اور سالانہ رقم میں چھ لاکھ اضافہ کرنے کے بعد نئے ترک سواروں کی کمپنی کی دیکھ بھال کی اور جھاؤلال کو عظیم آباد کی طرف نکال دیا وہ خود اپنے مستقر کی طرف روانہ ہوا۔''[۲]

مہاراجہ کے اخراج، خان علامہ کے تقرر اور چھ لاکھ سالانہ کے اضافہ کے بعد نواب

---

۱ سوانحات، ج ۱، ص ۱۳۲

۲ تاریخ آصفی مترجمہ ڈاکٹر ثروت علی، ص ۱۳۹

آصف الدّولہ پر کیا بیتی اس کو کمال الدین حیدر بتاتے ہیں:

''غرض جناب عالی نے مہاراج کے جانے سے بمقتضائے غیرت و بے اختیاری و مجبوری ایسا غم و غصّہ کھایا کہ عوارض روحانی میں مبتلا ہوئے اور خود اسباب عارضۂ مہلک کے اختیار کئے کہ جس میں اطبائے حاذق مجبور ہو جائیں مستسقی ہوئے۔ چنانچہ ایک دن حکیم شفائی خاں سے پوچھا کہ وہ کون عارضۂ خاص ہے جس میں حکیم لاعلاج ہو جائے۔ عرض کی کھانا کھانے کے بعد نہانا اور اس کی مداومت کرنا۔ جناب عالی نے ہر روز بعد خاصۂ طعام کے نہانا دریا کا اختیار کیا اور پرہیز سے ہاتھ اٹھایا۔''[1]

یہ سانحہ مارچ ۱۷۹۷ء کا ہے اور ستمبر ۱۷۹۷ء کی ۲۰ر تاریخ کو چھ مہینے کوفت و کاہش جھیل کر آصف الدولہ نے رحمت ورضوان الٰہی میں پناہ پائی۔ تاریخ وفات ملا محمد خطا شوستری نے قرآنی جملے سے بہ اندک تغیر برآمد کی۔

ھاھنا روحٌ وریحانٌ وجناتُ النعیم[2]

ہندی میں تاریخ اس طرح کہی گئی ہے۔

ایک ہزار آٹھ سو سمّت کا پرمان ۔۔۔ سن بارہ سو بارہ ہجری جانت سکل جہان
ربیع الاوّل اٹھائیس اور جمعہ مدھیان ۔۔۔ سدی پریوا، کنوار کی آصف تجویزان[3]

آصف الدولہ کی تعمیری، دینی، علمی وادبی سرگرمیاں بے پناہ ہیں۔ اُن کی تفصیل کی جگہ کِسی کتاب کے تعارفی باب میں نہیں نکل سکتی۔ یہ کارنامے مستقل تصنیف کا موضوع ہیں۔ لیکن آصف الدولہ کی فیاضی، عمارات وغیرہ کی ستائش میں سب اہل قلم متفق اللّہجہ ہیں اور سب نے ان کی تاریخی امام باڑے وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ ہم صرف ان کی دینی اور عملی وادبی خدمات کا نہایت مختصر خاکہ پیش کر رہے ہیں۔ سید عبداللطیف شوستری اپنے سفرنامے

---

[1] سوانحات، ج ۱، ص ۱۳۳

[2] لکھنؤ کی تہذیبی میراث، ص ۶۷

[3] سوانحات، ج ۱، ص ۱۲۰

تحفۃ العالم میں رقمطراز ہیں جسے ہم ڈاکٹر صفدر حسین کے شکریئے کے ساتھ پیش کرتے ہیں:

''عتبات عرش درجات میں انھوں نے زوّاروں کے قیام کے لئے ایک اعلیٰ کارواں سرا بنوائی تھی جس میں ہمیشہ ایک جم غفیر رہتا تھا۔اورروز ورود سے ہر شخص کے مرتبے کے مطابق کچھ نہ کچھ مقرر ہو جاتا تھا اور جب وہ واپس جاتا تھا تو جو کچھ اس کے مقسوم میں ہوتا مل جاتا تھا۔آصف الدولہ کے کارہائے خیر میں دریائے فرات سے نجف اشرف تک پانی کی نہر نکلوانا ایسا کام [1] ہے جس کے لئے انہیں قیامت تک سند افتخار مل گئی ہے۔ یہ کام بڑے بڑے صاحب قدرت سلاطین بھی سرانجام نہ دے سکے تھے۔ ان کے مکان کے ساز وسامان، وضع وقطع اور سج دھج کا اگر شمہ بھی بیان کیا جائے تو پڑھنے اور دیکھنے والوں کے اطناب وملال کا باعث ہوگا۔بس مختصراً یہ سمجھئے کہ ان کے کتب خانے میں تین لاکھ منتخب کتابیں میں نے دیکھی تھیں جو نہایت پاکیزہ خط میں لکھی ہوئی تھیں اور ہر سو کتاب پر ایک گماشتہ مقرر تھا۔ اکثر کتابوں کی میں نے بتدریج سیر کی، مختلف فنون واصناف پر عربی، فارسی اور انگریزی میں کتابیں تھیں۔نظم ونثر کی کتابیں، تاریخیں اور دواوین بے شمار تھے۔ ان کے علاوہ خوش نما قطعات جو اوّلین اور آخرین خوش نویسوں کے ہاتھ کے لکھے ہوئے تھے اور ایران وہند، روم اور افرنگ کے مصوروں کی بنائی ہوئی تصویریں اتنی تعداد میں تھیں کہ ان کے دیکھے سے تمام عمر فراغت نہ مل سکے۔علمی کتابوں میں سے بہت سی جلدیں میری نظر سے گزریں۔میں نے دیکھا کہ شرائع ، مدارک ،مسالک مفاتیح اور کشکول میں بہت سی کتابیں اور بعض مجلدات بحار الانوار تو خود مصنفین کے قلم سے لکھی ہوئی تھیں۔اس لئے میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ تخریب سلطنت کے بعد سلاطین تیموریہ کا کتب خانہ جس کسی کے بھی ہاتھ لگا ہوگا اس کے خزائن اور دفائن

---

[1] مرزا جعفر علی فصیح جنھیں اس نہر سے سیراب ہونے کا شرف ملا تھا کہتے ہیں۔

ہم نے نہ سنا تھا یہ سلف سے کبھی اب تک
برسات تو ہو ہند میں سیل آئے نجف تک

اورسامان طلاء وجواہر اس کتب خانہ کے عشرعشیر بھی نہ ہوگا۔[۱]

**پروفیسر احتشام حسین نے آصف الدولہ کی ادبی خدمات کے بارے میں یہ مختصر تبصرہ کیا ہے:**

''آصف الدولہ خود ایک اچھے شاعر تھے اور ان کا دیوان قابل دید ہے۔ انھوں نے دلّی کے مشہور شاعر میر سوزؔ کو اپنا استاد بھی بنالیا تھا۔[۲] آصف الدولہ کے عہد میں سوداؔ، میرؔ، انشاؔء، جرأتؔ، مصحفیؔ سب موجود تھے[۳] اور دربار سے سب کی قدردانی ہی نہیں ناز برداری بھی ہوتی تھی۔''

**آصف الدّولہ کی دینی خدمات کا تذکرہ اس ذکر کے بغیر تمام نہیں کیا جا سکتا کہ انھیں کے زمانے میں ملا محمد علی پادشاہ کی تحریک[۴] اور سلسلہ چشتیہ کے شیخ طریقت خواجہ علی اکبر مودودی کی ترغیب سے[۵] ۱۲۰۰ھ میں لکھنؤ اور فیض آباد میں شیعوں کی نماز جمعہ و جماعت قائم ہوئی۔ لکھنؤ میں مولوی سیّد دلدار علی (غفران مآب) نے اور فیض آباد میں ان کے شاگرد مولوی عبد العلی دیوکٹھوی (۱۲۴۳ھ۔۱۱۶۲ھ) نے امامت کی۔ مولوی عبد العلی صاحب ملا پادشاہ کے بھی شاگرد تھے۔ یہ کام اتنے حسن نیت سے کیا گیا کہ آج تک یہ سلسلۂ امامت انھیں حضرات کی نسل میں ہے۔ مسجد آصفی کے مستقل امام جمعہ آج بھی مولانا الحاج سید کلب عابد ہیں۔[۶] فیض آباد کا ذکر آپ ملاحظہ کر چکے ہیں۔**

---

۱. لکھنؤ کی تہذیبی میراث، ص ۶۴ تا ۶۵

۲. اردو ساہتیہ کا آلوچناتمک اتہاس، ص ۹۱

۳. ڈاکٹر ابواللیث صدیقی۔ لکھنؤ کا دبستان شاعری، ص ۵۷

۴. شیعیت کی تاریخ، ص

۵. محمد رضا انصاری فرنگی محل بانی درس نظامی، ص ۱۲۹

۶. آج کل آپ مسلم یونیورسٹی میں شیعہ دینیات کے ناظم ہیں اور امامت جمعہ کیلئے اپنا جانشین فرمایا ہے۔ ان کے انتقال کے بعد مولانا کلب جواد نقوی امام جمعہ ہوئے۔ البتہ مولانا ڈاکٹر سید کلب صادق صاحب طاب ثراہ نے بھی جمعہ پڑھایا۔ مولانا کلب جواد نقوی کی عدم صحتیابی کی بنیاد پر اب مولانا رضا حیدر زیدی اور مولانا سرتاج حیدر صاحب جمعہ پڑھاتے ہیں۔ درمیان میں مولانا جعفر صاحب مرحوم نے بھی امامت کے فرائض انجام دیئے۔

# وزیر علی آصف جاہ

آصف الدّولہ کے جانشین مرزا وزیر علی، آصف جاہ کے لقب کے ساتھ تخت نشین ہوئے۔ اِن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ آصف الدولہ کے پسر صلبی نہ تھے لیکن خود نواب آصف الدولہ نے ان کو اپنا فرزند ثابت کرنے کا کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں فرمایا ان کی نگہداشت واعزاز میں جو کچھ کیا اس کی مثال نایاب ہے۔ وزیر علی کی شادی میں بیس لاکھ سے زیادہ خرچ کیا۔ برات کے جلوس میں نوشہ کے تخت رواں کے آگے آگے پاپیادہ چلے۔ جب سوار ہونے کی درخواست کی گئی تو فرمایا کہ میری خواہش ہے کہ میں ملازموں کی طرح وزیر علی کی سواری کے آگے چلوں۔ [1]

ان کی جانشینی کے لئے سر جان شور گورنر جنرل سے طے بھی کر لیا تھا۔ اس لئے نواب بہو بیگم صاحبہ اور تفضّل حسین خان علامہ کے اتفاق رائے سے مسند نشین بھی کر دیا گیا۔ چونکہ انگریزوں نے نواب آصف الدولہ کے چھوٹے بھائی نواب سعادت علی خاں سے بھی وعدہ کر رکھا تھا اور بیس سال تک اس دم دلاسے میں رکھا کہ ان کو آصف الدولہ کے بعد موقع دیا جائے گا۔ [2] اس کے علاوہ تفضّل حسین خاں ان کے استاد اور انگریزوں کے بڑے معتمد آلۂ کار تھے۔ اس لئے حیرت ہوتی ہے کہ یہ مہربانی نواب آصف جاہ کے ساتھ کیوں اور کیسے؟ مگر یہ حیرت دور ہونے میں کمال الدین حیدر کے بیانات سے بڑی مدد ملتی ہے وہ بتاتے ہیں کہ ''ادھر بھی فوج کثیر جاں نثاری پر تھی۔'' اگرچہ ساتھ ہی ساتھ طنز بھی کرتے ہیں۔ اس زمانے کی مردم سپاہ کو البتہ بہت تمیز تھی۔ اپنے تئیں جانثاران ریاست سمجھتے تھے۔ [3]

فوج وعوام میں نواب کی مقبولیت کا ذکر کمال الدین حیدر کو بار بار کرنا پڑا ہے۔ ایک

---

[1] تاریخ آصفی، ص، ۱۲۱

[2] لکھنؤ کی تہذیبی میراث، ص ۸۲

[3] سوانحات، ج ا ر ص ۱۳۳

فوجی افسر نورالاسلام منتظر لکھنوی کے کلام سے بھی اس کا اندازہ ہوتا ہے اس کا اقتباس ابھی پیش خدمت ہوگا۔نواب وزیر علی کی یہی مقبولیت تھی جس کے باعث ریزیڈنٹ اور تفضّل حسین خاں میں اس کا دم نہ تھا کہ وہ محروم کر سکتے۔اس کام کے لئے گورنر جنرل کی ضرورت تھی اوران کے آنے پر ہی یہ تمنّائے دیرینہ برآنے کی سبیل ہوسکی۔

ادھرنواب کی جوانمردی،قوت عمل اوراندرونی معاملات میں کمپنی کی مداخلت کی مخالفت زبردست شخصیت اورجذبۂ آزادی۔نواب شاہ زمان ابدالی سے ربط ضبط،افغان فوج کی بھرتی[۲] کی خبریں ریزیڈنٹ اورخاں علامہ سے ملتی رہی ہوں گی جس کوکمال الدّین حیدر بیان کرتے ہیں:[۱]

''خلاصہ جب ارکان دولت نے یہ حال دیکھاہر شخص اپنی آبرواور مال سے خائف ہوگیا۔الاعوام،سپاہ،جاہل انجام کارفقط شجاعت وسخاوت اورنام نامی جناب عالی جان کر گرویدہ تھے۔''[۳]

کمال الدین حیدرآصف جاہ کے کردار کی ''ناہمواری'' کا ذکر کرتے ہیں اور پھر بتاتے ہیں:

''گورنر جنرل تحریرات ریزیڈنٹ اورعرائض خان علامہ سے سمجھے کہ مبادا کوئی فساد عظیم برپا نہ ہوکس واسطے کہ سب فوج حاکم وقت سے موافق ہے اصلاح کرنا ضرور ہے۔''[۴]

لیکن اصل وجہ یہ تھی کہ بورڈ آف ڈائرکٹرس نے گورنر جنرل کو ہدایت کی تھی کہ اودھ

---

[۱] ایڈمنسٹریشن آف اودھ،ص،۵

[۲] لکھنؤ گزیٹر،ص،۴۳

[۳] سوانحات ج،ا،ص،۱۳۰

[۴] وہی،ص ۱۳۴

میں امدادی فوج کی تعداد میں اضافہ کیا جائے۔[۱] اس مسئلہ پر ان کو نواب وزیر سے گفتگو کرنی تھی اس لئے سر جان شور لکھنؤ پہونچے۔ استقبال و اعزاز سب کچھ ہوا مگر اصل معاملہ میں نواب وزیر نے سرِ تسلیم خم کر دینے سے انکار کر دیا عوام اور فوج کی جو حالت تھی اس کو دیکھتے ہوئے کوئی قدم اٹھانا، بھڑ کا چھتّہ چھیڑنا تھا اس لئے فضا کو ہموار کرنے میں وقت اور تدبیریں صرف کی گئیں۔ تفضّل حسین خان اور ان کے رفقا تھے ہی۔ بدقسمتی سے نواب بہو بیگم صاحبہ کو بھی پوتے کی طرف سے برگشتہ کر دیا گیا۔ چنانچہ اس مطلب کا ایک محضر تیار ہوا کہ ''وزیر علی آصف الدّولہ کے فرزند نہیں ہیں۔''[۲]

اس محضر شہادت پر نواب بہو بیگم کی بھی مہر لگی اور اس کے بعد راستہ کافی صاف تھا۔ پھر بھی آصف جاہ پر ہاتھ ڈالنے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ بی بی پور کی کوٹھی میں طلب کر کے بحیلہ و عیاری قید کیا جا سکا۔ کمال الدین حیدر گورنر جنرل کو خراج عقیدت نذر کرتے ہیں:

''غرض وہ شب بھی عجب اضطراب و پریشانی میں تمام لشکر پر گزری مگر گورنر جنرل نے کس خوبی سے انتظام کیا کہ باوجود اس کثرت فوج اور موافق ہونے حاکم وقت سے کسی نے سر نہ ہلایا۔''[۳]

کمال الدّین حیدر کا بار بار موافقت فوج کا حوالہ دینا معمولی بات نہیں ہے۔ اگر فرنروازیانِ اودھ کی حمایت میں ان کے قلم سے ایک لفظ بھی نکل جائے تو پھر گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے۔

ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری نے اپنے مجموعہ مضامین ''تحقیقی نوادر'' میں ولیم تھامس بیل کی مفتاح التواریخ سے ایک قطعہ تاریخ کا ایک شعر نقل کیا ہے جس سے اس تہلکے کے خاص کردار کون لوگ تھے ان کی تفصیل معلوم ہوتی ہے۔

---

۱ لکھنؤ گزیٹر طبع جدید، ص، ۴۳

۲ تہذیبی میراث، ص ۸۳

۳ سوانحات، ج، ۱، ص، ۱۳۵

سات حرفوں نے کیا خانہ خراب
تین تے اور دو الف یک حے و بے

تین (ت) تفضّل حسین خاں، تحسین علی خاں، ٹکیت رائے (دو ۲/الف) الماس علی خاں اور اشرف علی خاں۔ یہ ذات اشرف آصف جاہ کے خسر بھی تھے۔ ایک (ح) حسن رضا خاں۔ (ب) نواب بہو بیگم صاحبہ۔[۱]

نور الاسلام منتظر نے جو توپ خانے میں افسر تھے ان لوگوں کی خوب خبر لی ہے۔ افسوس ہے کہ نور الاسلام منتظر جو فوج اور عوام کی سچی ترجمانی کر رہے تھے اپنے جذبات کو بے قابو ہونے سے نہ بچا سکے اور کہیں کہیں وہ مغلظات پر اتر آئے ہیں۔ اس لئے پورا مخمس سپرد قلم نہیں کیا جا سکتا۔ پھر بھی اس عوامی ردعمل کی بڑی تاریخی اہمیت ہے، اس لئے چند بند ملاحظہ فرمائیے۔ تفصیل کے لئے شائقین تحقیقی نوادر کی طرف رجوع فرما سکتے ہیں۔ سب سے زیادہ اور اچھی خبر خان علامہ کی لی گئی ہے۔ انھیں سے خطاب کر کے نظم شروع ہوتی ہے:

یوں نائب وزیر بنا او نمک حرام — یوں جا فرنگیوں سے ملا او نمک حرام
آئی ذرا نہ تجھ کو حیا او نمک حرام — آقا سے اپنے کیا یہ کیا او نمک حرام
نازل ہو تجھ پہ قہر خدا او نمک حرام

اس کے بعد کئی اور بند ہیں جس میں کافی فحش زبانی کے ساتھ خطاب کیا گیا ہے پھر ان کے علم و عمل کے تباین کو ظاہر کرتے ہوئے کہا گیا ہے ؎

لعنت خدا کی، اس ترے فضل و کمال پر — لایا بلا یہ صاحب جاہ و جلال پر
ہنستے ہیں اہل حال ترے قیل و قال پر — آیا نہ رحم تجھ کو خلائق کے حال پر
کرتا ہے کوئی ایسی خطا او نمک حرام

اس بند میں ان کا کبھی بھلا نہ ہونے کی پیشین گوئی کی گئی ہے جسے حالات نے بہت جلد

---

[۱] تحقیقی نوادر، ص، ۳۴، حاشیہ ۱

درست ثابت کیا:

لعنت خدا کی تجھ پہ ہے اے مایۂ فساد چاہے ہے، تو کہ خانۂ خاوند ہو بیاد
کہتا ہوں راست میں، یہ مری بات رکھیو یاد ابن زیاد سے بھی کیا کچھ ستم زیاد
تیرا کبھی نہ ہوگا بھلا او نمک حرام

منتظر کے اس بند سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ اگر بہو بیگم کا قدم درمیان نہ ہوتا تو فوج اس چیرہ دستی کی خاموش تماشائی نہ رہتی۔ پہلے مصرع میں سرجان شور کی طرف کتنا لطیف اشارہ ہے:

اک دو گھڑی میں دے تو مٹا دیتے سر شور پر کیا کریں کہ خاطر بیگم بھی تھی ضرور
شہرہ نمک حلالوں کا پہونچا جو دور دور ورنہ یہ جان مارلے کرتے کوئی قصور
تو اپنے جی میں خوب جلا اُو نمک حرام

ذیل کے بند میں ان کے ماضی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

اک خلق جانتی ہے تجھے ہے وہی نہ تو تیرے دماغ میں یہ سمائی ہے کیسی بو
کوسوں ہی دوڑتا تھا، تو ہاتھی کے روبرو ہوتا تھا جب سوار شجاع جہاں کبھو
کیا دن وہ اپنے بھول گیا او نمک حرام

اب راجہ ٹکیت رائے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، یہ بھی ممکن ہے کہ گذشتہ بند بھی راجہ سے ہی متعلق ہوں:

کس نے کہا تھا، تجھ کو یہ راجہ ٹکیت رائے سب گھر وزیر ہند کا کھاجا ٹکیت رائے
یوں نام تیرا شہر میں باجا ٹکیت رائے راجا ٹکیت رائے مراجا ٹکیت رائے
اس نام پر بھی تو نہ موا او نمک حرام

اب ذیل کے ان دو بند میں الماس علی، جواہر علی خان اور تحسین علی خاں، خواجہ سراؤں کا ذکر ہے:

الماس ہے، پہ دشمن ہر سبزہ رنگ ہے گر خوب دیکھئے تو جواہر بھی سنگ ہے

پتھر کا آدمی ہے عجب رنگ ڈھنگ ہے ہر ایک جوہری تری قیمت میں دنگ ہے
ہے تو غلام بیش بہا او نمک حرام
تحسیں تجھے تو کرتی ہے نفریں تمام خلق اس بھاگنے سے جان گئی ہے غلام خلق
لیوے ہے صبح دم جو تیرا اٹھ کے نام خلق لعنت کرے ہے تیرے تئیں صبح و شام خلق
خاوندوں سے یہ مکرو دغا او نمک حرام

آخر کے چند بند ملاحظہ فرمایئے جن میں نواب وزیر کی مقبولیت انگریزوں کی بدکرداری اور کشمیری و افغان کردار کی طرف اشارہ ہے۔

لازم نہ تھا تمھیں تو یہ اے کابلی بچو کشمیریٔ لعین کا یوں اڑ کے ساتھ دو
اک اور غول باندھ کے شامل بجنگ ہو باایں نمک حلالی، تمہارے تو باپ کو
کہتے تھے یاں کے شاہ و گدااو نمک حرام
اس ماہ کا ستارا، جو گردش میں آ گیا اک ابر غم جہان پہ اک بار چھا گیا
نکلا تھا ماہ عید سویوں منھ چھپا گیا اے کاشمیری تو نہ زمیں میں سما گیا
اک آسماں نہ ٹوٹ پڑا او نمک حرام
نواب وہ کہ خلق ہے جس میں محمدی اس کی نکوئی اور نصاریٰ کی یہ بدی
لائی ہے رنگ اک نیا، یہ تیرھویں صدی کیا دیکھیں ان کے حق میں کرے قہرا یزدی
ہے جن کو یہ خطاب ملا او نمک حرام[1]

نواب وزیر معزول کر کے بنارس لے جائے گئے مگر ان کا جوش آزادی وہاں بھی کم نہ ہوا۔ آخر میں ان سے کلکتہ جا کے قیام کرنے کے لئے کہا گیا۔ ریذیڈنٹ فرزیڈرک ولیم چیری نے اسی مطلب کی گفتگو میں تلخ کلامی کی۔ نواب نے اسے اور دوسرے دو انگریزوں کو موت کے گھاٹ اتار کے[2] خود صحرا نوردی اختیار کی۔ اس دوران انھوں نے

---

[1] تحقیقی نوادر، ص ۳۵
[2] وزیر نامہ، ص ۵۰

ہمت آزمائی کی عجیب وغریب صلاحیت کا ثبوت دیا۔انگریزوں اورنواب سعادت علی خاں کی فوجیں،تلاش وتعاقب میں لگی رہیں مگروہ ہاتھ نہ لگ سکے۔اگرچہ اس درمیان میں فیض آباد بھی آئے۔لکھنؤ بھی گئے۔لکھنؤ میں آصف الدّولہ کی قبر پر مشہور آصفی امامباڑے میں ان کی حاضری کی عکاسی ڈاکٹر نیّر مسعود نے اس طرح کی ہے:

''نواب کی وفات کے کچھ عرصے بعد ایک دن اس عظیم الشان ، سجے ہوئے، خاموش امام باڑے میں ایک نوجوان بیراگی فقیر، بدن پر بھبوت ملے، ہاتھ میں طوطے کا پنجرہ لئے داخل ہوتا ہے۔نواب کی قبر کے پاس دیر تک چپ کھڑا رہتا ہے اور اسی خاموشی سے واپس چلا جاتا ہے،اس کے بعد اسے کوئی نہیں دیکھتا۔یہ نواب کا بیٹا وزیر علی تھا۔جس کو انگریزوں نے اودھ کے تخت پر نہیں بیٹھنے دیا اور وہ جنگ پر آمادہ ہوگیا۔اس وقت وہ ایک انگریز افسر کو قتل کر کے فرار ہے اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزند شکاری کتوں کی طرح اس کے تعاقب میں ہیں۔''[1]

آخر میں یہ تعاقب کامیاب ہوا۔جس دغا ودغل سے وہ بی بی پور کی کوٹھی میں بلائے گئے تھے اسی طرح صلح سمجھوتہ کی بات کے بہانے کمپنی کے فرزندوں سے ملاقات کے لئے پھر اکٹھا کئے گئے۔اس کارنامے کا سہرا مہاراجہ جے پور کے سر ہے۔تفصیل کمال الدین حیدر سے سنئیے:

''منشی مرزا باقر میر منشی ریذیڈنسی لکھنؤ جو کرنل کالنس صاحب اور جان منٹن صاحب کے تھے وہ کہتے تھے کہ میں کرنل کالنس صاحب کے ساتھ تھا۔انھیں کی پلٹن وزیر علی خاں کے تعاقب میں جاتی تھی۔خلاصہ کرنل نے راجہ کو بہ طمع زرسرخ راضی کیا۔راجہ نے پہلے وزیر علی خاں کو فہمائش کی کہ اگر آپ کے خاطر خواہ ہمارے واسطے سے تصفیہ سرکار سے ہوجائے تو غالب ہے اس خاک چھاننے اور بیابان مرگ ہونے اور صحرانوردی سے

[1] نظامی جنتری، ۱۳۹۴ھ مطابق ۱۹۷۴ء مطبوعہ نظامی پریس لکھنؤ

بہتر ہو وزیر علی خاں اجل گرفتہ راضی ہوئے۔ رفقائے خاص نے بھی سمجھایا کہ راجہ کی صلاح نیک ہے۔''

غرض ایک دن منشی مذکور باخفائی پہرے اپنے ساتھ لے گئے۔ تلنگون کو سمجھا دیا کہ تم کمین میں رہو۔ جب میری آواز بلند ہو دفعتاً آ کر ان کو پکڑ لینا۔ غرض وزیر علی خاں تنہا چلے آئے۔ خلوت ہوئی راجہ، منشی کا مقابلہ کر کے آپ اٹھ گیا۔ وزیر علی خاں پر غضب ہو کر چلا چلا کر شکایت سرکار کرنے لگے آخر اس چلانے سے حلق خشک ہو گیا۔ پانی پینے کو مانگا۔ منشی نے صراحی ہاتھ میں دیدی۔ جب صراحی منہ سے لگا کر پانی پینے لگے۔ منشی برابر بیٹھے تھے۔ (جھپ وکذا) قرولی کمر سے گھسیٹ لی۔ تلنگے اسی تاک میں تھے دفعتاً دوڑ پڑے گرفتار کر لیا۔''[1]

رفقاء تو موقع پا کے بچ نکلے مگر سامان ضبط ہوا۔ کلکتے لے جا کر نظر بند کئے گئے۔ ایک بنگلے میں رہتے تھے۔ جس کی غلام گردش میں سلاخ آہنی تھیں، کوئی ہندستانی نجانے پاتا تھا۔[2]

سترہ سال تین ماہ اور چار روز تک ایک قیدی کی زندگی گزار کر ۳۶ برس کے سن میں جون/۱۸۱۷ء مطابق شعبان ۱۲۳۲ھ میں بہ عارضہ تپ انتقال کیا۔ عبرت کا مقام دیکھئے کہ جس شخص کی شادی میں چھتیس لاکھ روپیہ[3] صرف ہوں اسے بدقت تیس روپئے کا کفن ملے۔[4]

لوح قبر پر تاریخ وفات درج ہے:

---

[1] سوانحات ج ۱ ص ۱۴۰

[2] ہی ص ۲-۱۴۱

[3] ابو طالب اصفہانی لندنی نے جو معاصر تاریخ نگار ہے شادی کا خرچ بیس لاکھ بتایا ہے۔ زیادہ قابل اعتماد روایت ہے۔ دیکھیں تاریخ آصفی ص ۱۲۱

[4] تحقیقی نوادر ص ۱۳۵

وزیر ہند وزیر علی آصف جاہ　　چو سوئے خلد بریں رفتہ زیں سرائے غرور
زدیم غوطہ بدر یائے فکر تا آریم　　بدست گوہر تاریخ فوت آن مغفور
بگوشم آمدہ ناگہ بہ شور شیون و شین　　ثوائے وائے دریغا زجن وانس وطیور[۵]

اس طرح اولوالعزم، باہمت وحوصلہ آزما شخصیت کا دردناک انجام ہوا۔ یہ تو نہیں عرض کیا جا سکتا کہ، جگرداروں نے بنیاد جہان جاوداں رکھدی مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ وزیر علی آصف جاہ نے اپنے ولولہ وعزم سے ؎

'دل کو ہسار میں محفوظ اپنی داستاں رکھ دی'

# سعادت علی خاں

سعادت علی خاں عرف مرزا منگلی، شجاع الدولہ کی کسی خواص کے بطن سے ۱۱۶۷ھ میں پیدا ہوئے۔ نواب آصف الدولہ سے تو کم وبیش چھ سال چھوٹے مگر ان کے علاوہ نہ صرف اپنے دو حقیقی بھائیوں مرزا جنگلی اور مرزا مینڈو بلکہ شجاع الدولہ کی خورد محل سے کثیر التعداد اولاد میں سب سے بڑے تھے۔

آصف جاہ کی بہ جبر وستم معزولی اور گرفتاری کے بعد انگریزوں کی پرورش ونوازش سے ۳۰؍شعبان ۱۲۱۲ھ مطابق ۲۱؍جنوری ۱۷۹۸ء کو اودھ کی مسند وزارت پر قابض ہوئے۔ چونکہ یہ آصف الدولہ کے بعد سب سے بڑے فرزند بلکہ جسمانی اعتبار سے تندرست اور ذہنی اعتبار سے تیز طرار تھے۔ اس لئے بھی باپ کے زیر تربیت دربار دہلی میں ان کے مددگار رہے۔[۲] اس کے بعد خیر آباد کی نظامت، بریلی کی صوبہ داری وغیرہ کی خدمت انجام دیں۔ تقریباً چار سال تک نجف خاں کی رفاقت میں رہے اور میدان رزم کا اچھا تجربہ حاصل کیا۔ ہنڈیاؤں اور بیانہ کا انتظام سنبھالنے کی وجہ سے نظم ونسق کا اچھا وقوف

---

[۱] تحقیقی نوادر، ص ۳۵

[۲] وزیر نامہ، ص، ۵۲

ہو گیا تھا۔[۱]

یہ سب گن نہ ہوتے تو جن شرائط کے ساتھ انگریزوں نے مسند وزارت بخشی تھی اس کا سرانجام ہی ممکن نہ ہوتا۔ نواب شجاع الدولہ کے وقت وفات بیس ہزار فوج کے ساتھ بریلی میں تھے۔ تفضّل حسین خاں استاد و اتالیق تھے۔ نواب آصف الدولہ کو ان کی جاہ پسندی سے خطرہ تھا اس لئے ان کو بریلی سے واپس بلالیا۔ انھوں نے بہت ہاتھ پاؤں مارے، مرتضیٰ خاں بڑیچ اور اس نواح کے دوسرے سرداروں سے استمزاج کیا۔ جب کسی سے مدد کی توقع نہ پائی تو نواب وزیر کے دربار میں چلے گئے۔[۲]

ظاہر ہے کہ ان کے لئے انگریزوں اور نواب وزیر سے کون لڑائی مول لیتا۔ جانتے تھے کہ اس حسن خدمت کے صلے میں ملک بنارس، جونپور، غازی پور، جمع سالانہ ۲۲/لاکھ[۳] کا انگریزوں سے سودا پٹا ہے اس لئے کوئی سردار حمایت پر آمادہ نہ ہوا اور ان سے توقع بھی کسی کو کیا رہی ہوگی۔

یہ بریلی سے واپس آئے تو نواب آصف الدّولہ نے تین لاکھ سالانہ[۴] کا وظیفہ مقرر کر دیا اور سعادت علی خاں بنارس میں مقیم رہ کے کلکتے کے چکر لگا کے اپنے مستقبل کی فکروں میں لگے رہے اور وقت آنے پر کامیاب بھی ہوئے۔

جب وزیر الممالک یمین الدولہ ناظم الملک نواب سعادت علی خاں بہادر انگریزوں کی بساط سیاست پر جم گئے تو بچے کھچے اودھ میں سے آدھا علاقہ انگریزوں کی نذر کرنا پڑا۔ جس کی سالانہ جمع ایک کروڑ تیس لاکھ سے بھی زیادہ تھی۔ اس موقع پر کمال الدّین حیدر کی وکالت قابل دید ہے۔ پہلے نواب بہو بیگم صاحبہ پر الزام عاید کرتے ہیں کہ اس علاقے کو

---

[۱] لکھنؤ کی تہذیبی میراث، ص، ۸۳

[۲] تاریخ آصفی، ص، ۳۸

[۳] سوانحات، ج، ۱۔ص، ۹۵

[۴] وہی، ص، ۱۶۴

بچانے میں انھوں نے سعادت علی خاں کی خواہش رد کردی۔ کہتے ہیں:

''جناب عالی نے بعد نذر جناب عالیہ سے عرض کیا کہ غلام سے ایک قصور ہو گیا ہے، در باب تحریر عہد میثاق جدید، مگر فقط آپ کی مداخلت سے وہ ہٹ سکتا ہے مجھ سے بہ مجبوری ہوا ہے۔ آپ کو یہ کہنا چاہیے کہ یہ ریاست میرے خاوند اور بیٹے کی ہے۔ مجھے اس کی مسند نشینی کا اختیار ہے۔ دوسرے کو نہیں ہے۔ جواہر علی خاں نواب ناظر نے سمجھایا کہ نواب گورنر جنرل سے آپ سے بگڑ جائے گی اور یہ مرزا سعادت علی ہیں ان کا حال آپ خوب جانتی ہیں۔ جناب عالی مجبور ہوئے۔''[۱]

لیکن محسوس ہوا کہ یہ صفائی کافی نہیں ہوئی۔ اس لئے اب حساب کتاب پیش کر کے یہ بات سمجھانا چاہتے ہیں کہ نصف علاقہ دے دینے سے ریاست کو کوئی مالی نقصان نہیں ہوا۔ فرماتے ہیں:

''یہ سب مجرا لے کر نصف ملک تفویض حکام انگلشیہ ہوا، جس کی جمع ایک کروڑ تیس لاکھ ہوتے ہیں۔ پس اس صورت میں سوائے حکومت کے نقصان ایک حبہ کا نہیں ہوا، کس واسطہ کی ۶ آنے ملک سے جاتی تھی اور سود اقساط اس کے سوا ہو جاتا تھا۔ عوض نقدی کے، ملک دیا اور ۲ آنے میں یہ رقومات مذکور لئے۔ عقلاء کے نزدیک تو اسی قدر ملک ہے جو عہد دولت نواب آصف الدّولہ میں تھا۔ بلکہ جاگیر بہو بیگم صاحبہ گونڈہ اور پچھّم راٹھ اب بڑھ گئے اور علاقہ کھیری گڑھ کروڑ روپئے کے سود میں زیادہ ہوا۔ عوام کو البتہ تاسف ہوتا ہے اور اصل حساب اور حرکت عقلی کو اکثر نہیں پہونچتے۔''[۲]

یہاں کمال الدین حیدر وکالت سے بڑھ کے عیاری تک پہنچ گئے ہیں۔ سعادت علی خاں کے ہاتھوں تنصیف ملک کا ذکر کرتے وقت ان علاقوں کو اتنی چالاکی سے شامل ریاست کر دیتے ہیں جو باپ کے بعد غازی الدّین حیدر شاہ نے حاصل کئے۔ کھیری گڑھ کا

---

[۱] سوانحات، ج ۱، ص ۱۵۱

[۲] سوانحات، ج ۱، ص ۱۵۷

ناقابل زراعت علاقہ ۵ فیصدی سالانہ نقد سود کے بدلے غازی الدّین حیدر کے سر تھوپا گیا۔ نواب بہو بیگم کی جاگیر کو ایک لاکھ چیاسٹھ ہزار کمپنی کو دے کر حاصل کیا۔ مگر کمال الدین اس طرح بیان کرتے ہیں کہ جیسے یہ سب تنصیف ملک کے وقت ہی ہاتھ آ گئے تھے۔ لیکن اپنی اس وکالت سے خود کمال الدین حیدر کو تسکین نہیں ہوتی جب عمال کی کورنمکی کا قصّہ چھیڑا تو فرمانے لگے کہ:

''بعض اہلکاران کورنمک نے مثل الماس علی خاں بخوف حاکم سے حقیقت حال جمع خام کا کاغذ نہ دیا ورنہ اس توفیر میں ملک توفیر بچ جاتا۔''[۱]

بہر حال ان تمام توجیہات وغیرہ کے بعد بھی کمال الدین حیدر اس حقیقت کو چھپانے پر قادر نہ ہو سکے کہ ان علاقوں کو کسی نہ کسی شکل میں انگریزوں سے معاملت کر کے واپس لینے کے لئے نواب سعادت علی خاں سرمایہ جمع کر رہے تھے۔ کمال الدّین حیدر کہتے ہیں:

''خلاصہ ثقات یا جو محرم راز تھے کہتے تھے کہ مجموعۂ ممالک مفوضہ و مقبوضہ و مفتوحہ جو متعلق تعہد سرکار کمپنی ہے۔ اس کا تعہد سی سالہ سرکار شاہی سے لوں گا اور اقساط پیشگی داخل سرکار کروں گا۔''[۲]

مگر نصب العین کے حصول میں کامیابی نہ ہو سکی۔ سرکاری باضابطہ لوٹ کھسوٹ کے علاوہ ریذیڈنٹ بیلی کی چیرہ دستیاں سوئے پر سو درے کا مصداق تھیں۔ جب لارڈ مایرا کے اوائلِ عہد میں، نواب کے حسن تدبیر کی بدولت نہ صرف حالات کے ہموار ہو جانے کے امکانات روشن ہو گئے تھے بلکہ بیلی کا بھی شکنجۂ عقوبت میں کسا جانا یقینی سا لگ رہا تھا انہوں نے اپنے مرض کا تریاق زہر کی صورت میں تلاش کیا اور نواب کو موت کے گھاٹ اتار کے اپنا بیڑہ پار لگایا۔[۳] ہر چند کہ نواب سعادت علی خاں کو بڑی زبردست چپقلش کا سامنا رہا

---

[۱] وہی، ص ۳

[۲] وہی، ص، ۱۸۲

[۳] سوانحات، ج، ا۔ص، ۱۹۹

پھر بھی اودھ کی ترقی اور لکھنؤ کے نکھار میں ان کی دین معمولی نہیں ہے۔

جنرل مارٹن کی کوٹھی کی خریداری، لال بارہ دری، دلکشا، حیات بخش منور بخش، خورشید منزل، چوپڑ کا اصطبل انہیں کے ذوق تعمیر کی یادگاریں ہیں مگر یہ یورپی طرزِ تعمیر اختیار کر لیئے جانے کے باعث کسی تاریخی وقعت یا سیاحوں کے لئے جذب وکشش کا باعث نہ بن سکیں۔

تجارتی مرکز کی حیثیت سے سعادت گنج، رکاب گنج، جنگلی گنج، مقبول گنج، مولوی گنج، گولا گنج، رستوگی ٹولہ بھی اپنے وجود میں انہیں کے حسن انتظام کی پیداوار ہیں۔

مقدس عمارات میں درگاہ حضرت عباس کی نئی تعمیر اور گنبد، تال کٹورے کی کربلا کے ابتدائی نقوش، چہلم کی تعزیہ داری بھی نواب ہی کے حسن عقیدت کے آثار ہیں۔ اپنی پوری کفایت شعاری اور رجز رسی کے باوجود اہل فضل وکمال کی بزرگ داشت کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ اوران صفات میں ان کا مقام کسی پیشین یا پسیں فرمانروائے اودھ سے فروتر نہیں۔

نواب سعادت علی خاں کی مردم شناسی اور تدبّر کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے، خان علامہ کے ساتھ ان کے سلوک کا ذکر کرنا ناگزیر ہے۔ اور یہ داستان آپ کمال الدّین حیدر سے ہی سنیں:

''از بس کہ بسبب معاملہ وزیر علی خاں سب کا حال بطون خیر خواہی و بدخواہی کھل چکا تھا۔ ہر ایک کو حکمت عملی اور دام عنایت سے سرانجام کیا۔ چنانچہ پہلے خان علامہ تفضّل حسین خاں اپنے استاد کامل کو بسر شتۂ سفارت قدیم روانہ کلکتہ فرمایا۔ خط سند کو ارشاد کیا (کہ) تم سے پہلے معرفت صاحب ریذیڈنٹ، حضور گورنر جنرل پہونچے گا کہ نسبت زمان سابق تم سے بہت عزت واحترام سے پیش آئیں گے۔ خان علامہ اس مضمون ریاضی کو کچھ نہ سمجھے اور نہ کوئی عذر کر سکے مگر با اطمینان وثوق، خیر خواہی، صاحبان عالی پر نظر کر کے منزلت آخرت اختیار کی۔ بعد قیام چند روز وعدم رسی سند، ناکام حالت یاس میں پھرے کہ فی الحقیقت میرا حق استادی ادا ہوا۔ جیسا میں جانتا تھا۔ حکام نے معقول کیا کہ خاں صاحب آپ پہلے نہ سمجھے کہ یہ مقدمہ خانگی ہے، ہم جناب عالی سے سفارش بھی نہیں کر سکتے۔ غرض

ناکام وہاں سے پھرے۔ از بسکہ صاحب غیرت و صاحب فکر تھے۔ غم و غصّہ سے تپ محرق ہوئی۔ جب ہزاری باغ (بہار) میں پہونچے (۱۵ر شوال[۱] ۱۲۱۵ھ مطابق ۱۷۹۹ء میں انتقال کیا۔ سلام اللہ خاں چچازاد بھائی ساتھ تھے وہیں دفن کیا۔''[۲]

افسوس کہ حرص و ہوا و ہوس کی بے ثمری نے ایسے علامہ اجل کو کہ ابوالفضل اور سعد اللہ خاں شاہجہانی کا ہم پلہ تھا ایسے ناگوار انجام کو پہونچایا۔ امارت و نیابت کی حرص نہ ہوتی تو ان کا فضل و کمال اہل نظر سے قیام قیامت تک خراج عقیدت وصول کرتا رہتا۔

نواب سعادت علی خاں نے زہر خورانی کے اثر سے دوشنبہ، ۲۳ر رجب ۱۲۲۹ھ مطابق ۱۱ر جولائی ۱۸۱۴ء کو بوقت شب انتقال کیا لائق فرزند نے اپنے اس مکان میں دفن کیا جس میں ولی عہدی کے زمانے میں مقیم تھے اور ایک شاندار مقبرہ تعمیر کرایا۔ مقبرہ اب اپنی اصلی حالت پر باقی نہیں ہے۔ پھر بھی اپنی بلند بنیادی کی کہانی کہہ رہا ہے اور قیصر باغ کے ماحول میں بخوبی کھپا ہوا ہے۔

# غازی الدین حیدر

غازی الدین حیدر کی ولادت ۱۱ر جمادی الآخر ۱۱۸۸ھ مطابق ۲۴ر اگست ۱۷۷۴ء یوم پنجشنبہ کو ہوئی۔ غازی الدّین حیدر نواب سعادت علی خاں کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔ بچپن میں نواب آصف الدّولہ نے اپنی تربیت میں لینا چاہا[۳] مگر باپ خود اپنی فکر میں تھے اسے کہاں قبول فرماتے۔ مگر ساتھ رکھ کر بیٹے کی تعلیم و تربیت کا معقول انتظام کیا۔ وہ فلسفہ، لسانیات اور ادب کا بہت اچھا ذوق رکھتے تھے۔''[۴]

---

[۱] تحقیقی نوادر، ص، ۳۵

[۲] سوانحات، ج ۱ر ص، ۱۵۲

[۳] سوانحات، ج، ۱، ص، ۹۵

[۴] لکھنؤ کی تہذیبی میراث، ص ۹۲

۲۲؍سال کی عمر میں منجم الملک مبشر خاں بہادر کی صاحبزادی سے شادی ہوئی لیکن باپ کا تقرب زیادہ ان کے چھوٹے بھائی شمس الدولہ نواب احمد علی خاں کو حاصل تھا۔ امور سلطنت کی تربیت بھی انھیں کو ملی تھی اس لئے خیال یہی کیا جاتا تھا کہ باپ کے جانشین وہی ہوں گے۔ لیکن درباریوں اور ریذیڈنسی کے اتحاد عمل سے قرعہ فال غازی الدّین حیدر کے نام نکلا اور وہ مسند نشین وزارت ہوئے۔

غازی الدین حیدر کے عہد میں مسند وزارت تخت سلطنت سے بدلا اور مرکز سے برائے نام رشتہ بھی منقطع ہوگیا۔ اس کے اسباب میں نظر کرنا بہت ضروری ہے لیکن اس کے لئے بعض دوسرے حالات کا دیکھنا بھی ضروری ہے۔ جیسا کہ ہم ابھی دیکھ چکے ہیں کہ سعادت علی خاں خواہاں تھے کہ بادشاہ انگلستان کو نذرانہ پیش کر کے کچھ علاقوں کا ٹھیکہ حاصل کرلیں۔[۱] اس مد میں کافی بڑی رقم جمع بھی ہوچکی تھی۔ یہ بات انگریزوں کے علم میں تھی نیپال اور برما کی لڑائیوں کی وجہ سے کمپنی پیسے پیسے کی محتاج ہو رہی تھی۔ ریذیڈنٹ بیلی سے جان بچانے کے خیال سے نواب سعادت علی خاں اپنے مصاحب گوراوزلی کے مشورے سے چھ لاکھ روپئے بھیج کر لارڈ مائرا سے پیشگی سودا کر چکے تھے۔[۲] اس لئے گورنر جنرل کا ظاہری سلوک دلداری و دلدہی کا تھا۔ لیکن در پردہ کارروائیاں حسب مصلحت و مقتضائے طبیعت تھیں۔ غازی الدّین حیدر سے کئی قسطوں میں کروروں روپیہ قرض لیا گیا۔ اس زمانے میں گورنر جنرل کی نیاز مندی حد سے بڑھی ہوئی تھی۔ مگر کمپنی کی کھوکھلی حالت دیکھ کر نواب سخت رویہ اپنا رہے تھے۔ نیپال کی جنگ کے سبب سے اودھ میں تیزی دکھانے کی گنجائش نہ تھی۔ اس لئے انگریز پھونک پھونک کر قدم رکھ رہے تھے مگر دلوں کے پیچ جوں کے توں تھے۔ انگریزوں کی دوغلی چال کا ثبوت بیلی ریذیڈنٹ کے نام ۱۲؍نومبر ۱۸۱۴ء کے خط کے اس اقتباس سے ملتا ہے:

---

[۱] وزیر نامہ، ص ۵۷

[۲] سوانحات، ج ۱، ص ۱۹۸

''معاہدہ میں نواب کے اس حق کے تحفظ سے کہ اس کے ماتحت علاقوں کے معاملوں میں نواب کے مشورے کے بغیر برٹش سرکار کوئی مداخلت نہ کرے گی یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ہر طرح سے آزاد ہوگا۔ مگر اسے یہ حق صرف اس لئے دیا گیا تھا کہ اچھی ریاست کو ہڑپنے کے لئے ہماری طرف سے اب تک جو قدم اٹھائے گئے تھے انھیں ہم انصاف پسندانہ ثابت کرسکیں۔ عوام کے سامنے ہمیں انھیں ایک آزاد شہزادے کی طرح اعزاز دینا ہے۔ حقیقت میں وہ برٹش سرکار کے ماتحت ہیں۔ جہاں تک اوپر والی بات ہے نواب پر ذاتی طور سے کچھ دھیان دے دینے میں نہ تو کوئی زحمت ہے اور نہ کوئی نقصان ہی۔ ہاں! تھوڑا فائدہ ضرور ہے۔''[1]

دکھلاوے کی اسی پالیسی کا ایک بڑا شاہ کار بادشاہت کا خطاب بھی ہے۔ باتیں تو طرح طرح کی کہی اور لکھی گئی ہیں۔ لیکن کسی مورخ نے کوئی مستند ثبوت نہیں دیا ہے کہ غازی الدین حیدر یا ان کے اسلاف نے اس رتبے کے لئے کوئی کوشش یا خواہش کی ہو۔ بلکہ آصف الدولہ اور سعادت علی خاں نے شاہزادگان دہلی کی جو تواضع اور تعظیم کی اس کی مثال اودھ کے باہر کمیاب ہے۔ نواب سعادت علی خاں اور ان کے بیٹے نواب غازی الدین حیدر خاں تا قیام بادشاہت بطریق صوبہ دار پیش آیا کئے۔ یعنی شہزادہ کو نذر دیتے تھے اور خلعت پہنتے تھے۔ اور جب کبھی شارع عام پر شہزادہ موصوف و مرزا سلیمان شکوہ اور نواب موصوف کی سواریوں میں مڈبھیڑ ہوجاتی تھی تو نواب کی سواری کا ہاتھی از راہ ادب محکومی بٹھا دیا جاتا تھا اور شہزادہ کا ہاتھی اسی آن بان سے نکل جاتا تھا۔[2]

یقینی طور پر شہزادے اسی تعظیم و تکریم کے مستحق تھے۔ لیکن فی الواقع وہ اودھ کے وظیفے پر بسر کررہے تھے۔ دہلی سے لکھنؤ اچھے دن گزارنے کے لئے آئے تھے۔ ایک بار وظیفہ بند ہوگیا تھا تو ایک دن دسترخوان پر صرف بھنے ہوئے چنے آئے تھے اس لئے یہ خیال کہ

---

[1] اودھ کی لوٹ، ص ۴۳

[2] بیگمات اودھ، ص ۹۴

غازی الدّین حیدر بادشاہت کے طالب تھے یا بادشاہت کے بعد مساویانہ ملاقات کے طالب تھے محض قیاس آرائی ہے۔ واقعات کا معروضی تجزیہ ان نتائج تک نہیں پہونچا تا۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں فرماتے ہیں:

''لارڈ ہسٹینگز نے نواب اودھ کو شہ دی کہ وہ اپنے لئے بادشاہ کا لفظ استعمال کرے تا کہ اس طرح اکبر شاہ ثانی کی اہمیت کم ہو جائے چنانچہ نواب اودھ نے اپنے بادشاہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ بادشاہ خاک تھے۔ انگریزوں کے پٹھو تھے۔ جرأت نے اپنے ایک قطعہ میں اودھ کے نوابوں کی خودمختاری کی پول اس طرح کھولی ہے ؎

کہیے نہ انھیں امیر، اب اور نہ وزیر
انگریزوں کے ہاتھ، یہ قفس میں ہیں اسیر
جو کچھ وہ پڑھائیں، یہ منھ سے بولیں
بنگالے کے مینا ہیں یہ پورب کے امیر[1]

طنزیہ انداز اظہار کسی کو ناگوار ہوسکتا ہے۔ لیکن جرأتؔ کا قطعہ صورت حال کا صحیح عکاس ہے۔ایک موقع اور ملاحظہ فرمالیجئے تب خود غازی الدّین حیدر کا اپنا اعتراف دیکھیں۔ ہوا یہ کہ غازی الدّین حیدر کی طرف سے شہزادہ کی خدمت میں پیامِ ملاقات مساوی نہیں بھیجا گیا۔ ریذیڈنٹ نے بھیجا۔ شہزادہ نے گول جواب دیا۔ ''بہت اچھا'' اگر میں ملاقات کروں گا اسی طریق سے پیش آؤں گا۔''[2] ریذیڈنٹ نے (غازی الدین حیدر شاہ نے نہیں کہلا بھیجا۔ ''فدوی کو حکم قطعیٔ صدر سے آیا ہے۔ کل شاہ اودھ، اور فدوی ملاقات حضور کو آئیں گے اور حضور کے ارشاد سے معلوم ہوا کہ کبھی ملاقات نہ ہوگی۔''[3] ان حالات میں کیسے مانا جائے کہ یہ سب شاہ اودھ کے اشارے پر ہو رہا تھا۔

---

[1] غالبؔ اور آہنگ غالبؔ، ص ۱۶

[2] سوانحات، ج ۱، ص ۲۸۰

[3] وہی

اب یہاں پر ہمیں غازی الدّین حیدر شاہ کا اعتراف بھی دیکھ لینا چاہیے اس کے راوی بھی کمال الدین حیدر ہی ہیں جنھیں کسی حال میں بادشاہ کا ہمدرد تصور نہیں کیا جا سکتا۔ کہتے ہیں:

''ایک دن جناب عالی نے از راہِ مشورت ظفر الدولہ کپتان فتح علی خاں سے باب بادشاہت میں پوچھا کہ تمہارے نزدیک یہ امر کیسا ہے پہلے انھوں نے عذر کیا۔ جب اصرار حد سے زیادہ ہوا فرمایا۔ عرض کی اس خاندان کے واسطے شاہجہان آباد میں جیسا مشہور ہے حضور خوب جانتے ہیں اور زیادہ مشہور ہوگا۔ فرمایا میں تمہیں صاحب فہم جانتا تھا۔ مگر تم سنو میرے اور بھائی بھی ہیں۔ اگر وہ اس سے کم تر پر راضی ہو جائیں تو یہ وزارت بھی مجھ سے جاتی رہے گی۔ اس جہت سے مجھے چار و ناچار قبول کرنا پڑا اور یہ جو تم کہتے ہو، ظاہر ہے میں بھی جانتا ہوں۔''[1]

جن ارباب قلم نے بادشاہ کی خواہش و کوشش کا بار بار حوالہ دیا ہے۔ انھوں نے اس بیان کو نظر انداز کیا ہے اور اس کی کوئی وجہ نہیں بتائی ہے۔

ان جبری و قہری حالات میں نواب غازی الدّین حیدر خاں نے لقب بادشاہت اور تاج پوشی ۱۸/ذی الحجہ ۱۲۳۴ھ مطابق ۱۹/اکتوبر ۱۸۲۰ء کو اختیار فرمائی۔ شیخ ناسخ نے تاریخ کہی ؎

پئے سالِ ہمایوں جلوسش
بگو ناسخ کہ ظل اللہ گردید

غازی الدین حیدر نے نوابی اور بادشاہی دونوں ادوار میں انگریزوں کو قرضے بہت دیئے لیکن ایک کروڑ کا وہ قرض جو انھوں نے ۱۷/اگست ۱۸۲۵ء مطابق یکم محرم ۱۲۴۱ھ کو بطور قرض موبد بہ تقرر سود فیصد سالانہ ۵ روپیہ[2] دیا وہی ایک ایسا قرض ہے۔ جو آج تک کام آ رہا ہے۔ یہ قرض چار بیگمات کے گزارہ کے لئے دیا گیا تھا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ امام باڑہ نجف کے اخراجات کے لئے بھی رقم اس میں سے معین کی تھی۔ روضۂ شاہ نجف کی تعمیر

---

[1] وہی، ص، ۲۴۴

[2] شیخ تصدّق حسین مضمون ماہنامہ ''الواعظ'' بابت جون، ۱۹۴۶ء، ص، ۴۱

۱۲۳۲ھ میں انھوں نے موتی محل سے تھوڑے فاصلہ پر سکندر باغ کی بغل میں کرایا تھا۔ یہ حسین و پائدار تعمیر جو بادشاہ کا مدفن بھی بنی لکھنؤ میں اب بھی درست حالت میں ہے اور زیارت گاہ خاص و عام ہے۔ اس عمارت کی تاریخی اہمیت یہ بھی ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں یہ اہم مورچہ بنی تھی۔

روضۂ شاہ نجف کے علاوہ غازی الدّین حیدر شاہ کی اہم تعمیرات یہ ہیں: موتی محل میں شاہ منزل، اور مبارک منزل، ولایتی باغ، قدم رسول، ان کے وزیر معتمدالدولہ آغا میر نے بھی ایک عالیشان حویلی، کربلا اور سرائے کی تعمیر کی تھی۔ چھوٹی لائن کا سٹی اسٹیشن آغا میر کی ڈیوڑھی کے نام سے منسوب ہے۔

غازی الدّین حیدر خود بھی بہت ذی علم اور کثیر المطالعہ شخص تھے۔ ایک انگریز سیّاح بشپ ہیبر نے ان کی وسعت معلومات کی تعریف کی ہے۔[1] ان کے علمی مذاق کے باعث ان کے دور حکومت میں علمی سرگرمیوں کو بڑا فروغ ہوا۔ مدرسہ علوم مشرقی کا قیام، چھاپے خانوں کا رواج، کتابوں کی اشاعت وغیرہ کے لئے اس دور کو یاد کیا جاتا ہے۔ اس دور کی کتابوں میں تاج اللّغات بھی ہے۔ بادشاہ نے دو سال کی مسلسل محنت سے علم لغت پر ایک مبسوط کتاب ہفت قلزم ترتیب دی تھی جس کا دیباچہ مولوی قبول محمد نے لکھا تھا۔[2] ان کی ذہنی اپج اور ایجادات و اختراعات کو بھی ستائشی الفاظ سے یاد کیا۔

اس خوش مذاق حسین انسان اور خوش نصیب بادشاہ کا انتقال ۲۷ ربیع الاوّل ۱۲۴۳ھ مطابق ۱۸/اکتوبر ۱۸۲۷ء بروز دیوالی شب شنبہ کو ہوا۔ امام باڑہ شاہ نجف میں آسودۂ خاک ہوئے کسی شاعر نے حسب ذیل مادۂ تاریخ تلاش کیا۔

گشت تاریخ مصرعۂ استاد
اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

---

[1] لکھنؤ کی تہذیبی میراث، ص ۹۸

[2] وہی

# نصیرالدین حیدر شاہ

نصیرالدین عرف مرزا علی حیدر ۲۲ ر جمادی الاوّل ۱۲۱۸ھ مطابق ۱۸۰۳ء کو غازی الدین حیدر کی محل خاص نواب بادشاہ بیگم کی خواص خاص صبح دولت مخاطب بہ ممتاز محل سے پیدا ہوئے۔ ماں کے انتقال کی وجہ سے نواب بادشاہ بیگم کے ظلِّ عاطفت میں پرورش اور تعلیم وتربیت پائی۔

جب باپ کے انتقال کے بعد ۲۸ ر ربیع الاوّل ۱۲۴۳ھ مطابق ۱۹ را کتوبر ۱۸۲۷ء کو تخت نشین ہوئے تو ابوالنصر قطب الدّین سلیمان جاہ شاہجہاں نصیرالدین حیدر بادشاہ غازی کا لقب اختیار کیا۔[1] معلوم ہوتا ہے کہ آگے چل کر بادشاہ نے اپنے القاب میں نائب مہدی کا بھی اضافہ کرلیا تھا۔ کیونکہ دوسرا سکہ جب نظم ہوا تو اس میں یہ لقب موجود ہے۔

سکہ زد برسیم وزر از فضل حق ظل الہٰ
نائب مہدی نصیرالدّین حیدر بادشاہ[2]

پرورش بادشاہ بیگم کی اسی شاہانہ مزاج کی حامل ملکہ کے لاڈ پیار میں ہو رہی تھی۔ والد ماجد یعنی بادشاہ سلامت بے پرواہ تھے۔ اس لئے آزادی ملی اور مزاج آزادروی کی طرف مائل ہوا۔ پھر شباب وشراب رقص وسرود کی طرف مائل ہوا۔ اسی کے ساتھ انگریزی لباس، انگریزی غذائیں، انگریزی سامان، انگریزی مصاحب گویا قصر شاہی پر انگریزیت کا پورا تسلّط ہو گیا۔ لیکن بااین ہمہ مذہب کی طرف سے بے پروائی نہ تھی۔ مذہبیت سے بھی سرشار تھے۔ ڈاکٹر صفدر حسین شباب لکھنؤ کا اقتباس نقل کرتے ہیں:

"وہ اپنے مذہبی رسوم کے ادا کرنے میں بڑے شغف وانہماک سے کام لیتے تھے۔ محرم کے زمانے میں اپنے اعزا واقارب ہی کے مجمع میں رہتے تھے۔ شراب پینا،

---

[1] وزیرنامہ، ص، ۶۶

[2] وہی، ص، ۶۷

دعوتیں دینا اور عیش وعشرت کی محفلوں میں شریک رہنا موقوف ہوجاتا اور انگریزی مذاق کی جتنی باتیں انہیں پسند تھیں وہ بھی چھوڑ دیتے تھے۔''[1]

مرزا رجب علی بیگ سرورؔ ان سے بہت زیادہ ناخوش نہیں ہیں اس لئے نصیرالدین حیدر میں انھیں کچھ خوبیاں بھی نظر آ گئیں جسے وہ اپنے مخصوص مبالغہ آمیز داستانی رنگ میں بیان کرتے ہیں:

''اس عیش پسندی پر عشرۂ محرّم میں یہ حال تھا کہ راہ چلتوں کو مسکرانا محال تھا۔ روز و شب غم اہل بیت میں رونا، اربعین تک زمین پر سونا، لباس آبی یا سیاہ، ہر دم لب پر نالۂ و آہ، ہزار ہا روپیہ اور جہان کی نعمت مرثیہ خوان اور سیّد محتاج آب و نان پاتے تھے۔''[2]

درحقیقت نصیرالدین حیدر شاہ کا دور اودھ کی تعمیر وترقی کا دور تھا۔ سب سے بڑا کام جو اس عہد رفاہ مہد میں ہو رہا تھا وہ گنگا سے ایک نہر نکال کے گومتی میں ملانا تھا۔ آبپاشی کی سہولت اور زراعت کی آبیاری تو ہوتی ہی، اودھ کے باشندوں کے ایک حصّے کو گنگا جل بھی اپنی ہی سرزمین پر مہیا ہوجاتا۔ ترقی و یکجہتی کی آفرینش کرنے والے ایسے کارنامے انگریز کب برداشت کرسکتے تھے۔ جب لاکھوں کے خرچ سے تقریباً ۵۰ میل نہر کی کھودائی ہو چکی تو ریذیڈنٹ پر ایک بیک یہ راز فاش ہوا کہ چونکہ گنگا کمپنی کے علاقے سے ہوکر گذرتی ہے، لہٰذا سارا سرحدی علاقہ کمپنی کا ہے۔ برڈ لکھتے ہیں:

''اگر ریذیڈنٹ کی بات سچ بھی تھی تو اس کا فریضہ تھا کہ کام شروع ہونے کے پہلے ہی ساری کیفیت سے بادشاہ کو آگاہ کردیتا۔ لیکن ریذیڈنٹ نے ایسا نہیں کیا۔ اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ریذیڈنٹ کا مقصد ہی یہ تھا کہ وہ بادشاہ کے اقتصادی ذرایع کو بے دست و پا کردے جس سے بادشاہ پوری طرح ان کے بس میں ہوجائے اور ملک کی

---

[1] لکھنؤ کی تہذیبی میراث، ص ۱۰۱

[2] فسانہ عبرت، ص ۱۶

ترقی رک جائے۔"[۱]

اس کے علاوہ دو شفا خانے قائم کئے ایک انگریزی دوسرا یونانی۔ان کے لئے کمپنی کے نوٹ خریدے اور آج بھی یہ دونوں اسپتال جاری اور خدمت خلق میں مشغول ہیں۔اسی طرح ایک محتاج خانہ بھی قائم کیا۔رصد خانہ سلطانی کی داغ بیل پڑی۔ریذیڈنٹ کے اہتمام سے ایک انگریزی درسگاہ کی بنا ہوئی اور اس کے طلباء کے وظائف کے لئے تین ہزار ماہوار کی گراں قدر رقم منظور ہوئی۔

ڈالی گنج میں نصیر الدین حیدر کی کربلا ان کے ذوق تعمیر اور حسن عقیدت کی یادگار ہے۔ لکھنؤ کا شیعہ کالج اسی کربلا کی زمین پر ہے اور کربلا کی مرمت وغیرہ کالج ہی کے ذمے ہے۔غالباً بادشاہ کو اس کے لئے کوئی رقم ودیعت کرنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔

اس عہد میں منتظم الدّولہ حکیم مہدی علی خاں قابل ذکر وزیر ہیں۔ یہ انگریزوں کے بڑے معتمد تھے۔اسی دور میں اودھ پر قبضہ کر لینے کا سوال زیر غور تھا۔اس پر کسی وجہ سے عمل نہیں ہوسکا۔اس لئے تبدیلی کا وہی نسخہ استعمال ہوا جو سعادت علی خاں کے لئے استعمال ہوا تھا۔سلیمن صاحب معترف ہیں کہ "بادشاہ کو دھنیا اور دیوی کہاریوں کی مدد سے زہر دیا گیا تھا۔کیونکہ عوام چاہتے تھے کہ جلدی برطانوی راج ہو جائے۔"[۲] (ظاہر ہے کہ عوام کی اس خواہش کا عرفان اور نفاذ ریذیڈنسی سے بہتر کسی اور کے ہاتھوں ممکن نہ تھا!)

۳۵ سال اس جہان فانی میں بسر کرنے اور دس سال تک اودھ کی ترقی و آبادکاری کی مساعی میں بحیثیت فرماں روا مشغول رہنے کے بعد اس رنگا رنگ شخصیت کے مالک بادشاہ کا بقول رجب علی بیگ سرورؔ تیسری ربیع الآخر ۱۲۵۳ھ مطابق ۷/ جولائی، ۱۸۳۷ء جمعہ کو چار گھڑی رات گئے انتقال ہو گیا۔کربلائے خود تعمیر کردہ میں سپرد خاک ہوئے۔[۳]

---

[۱] اودھ کی لوٹ، ص ۱۳۱

[۲] واجد علی شاہ اور اودھ راج کا پتن، ص ۴۶

[۳] سوانحات سلاطین اودھ، ج ۱، ص ۳۲۶

# منّا جان، پھر محمد علی شاہ

ہم ابھی دیکھ چکے ہیں کہ نصیر الدین حیدر کو معزول کرنے اور اودھ کو کمپنی کی عملداری سے ملحق کرنے کا سوال زیر غور تھا۔ ۱۸۳۳ء میں محکمۂ داخلہ نے عارضی طور پر انتظام ہاتھ میں لے لینے کی ہدایت بھی گورنر جنرل کو کر دی تھی۔ [۱] مگر یا تو اس وجہ سے کہ لارڈ ولیم بینٹنگ گورنر جنرلی سے سبکدوش ہونے والے تھے یا اودھ کے باشندوں کے رخ سے سہم [۲] کر انہوں نے تاکید و تہدید کافی سمجھی عملی اقدام نہ کر سکے۔ اس لئے ریذیڈنٹ جان لو نے مقامی طور پر انتظام کر لیا اور نصیر الدین حیدر کو راستے سے ہٹا کے کارآمد جانشین تلاش کر لیا گیا۔

ظاہر ہے کہ اگر تخت مستحق کو ملتا تو اس سے من مانی شرطیں منوانا آسان کیا شاید ممکن ہی نہ ہوتا سلطنت کے اصلی وارث فریدوں بخت مرزا رفیع الدین عرف محمد مہدی منّا جان فرزند نصیر الدین شاہ کو محروم اور غازی الدین حیدر کے نواسے محسن الدولہ اور ان کے بھتیجوں یعنی نواب شمس الدولہ کے فرزندوں کو نظر انداز کر کے، نصیر الدین حیدر کے چچا اور غازی الدین حیدر کے چھوٹے بھائی نواب نصیر الدولہ محمد علی خاں سے سودا پٹایا گیا جو ۶۳ سال کے بوڑھے گٹھیا کے مرض کے باعث نشست و برخواست سے مجبور، ہاتھ میں رعشہ اور اتنا کہ کھانا تک اپنے ہاتھ سے نہ کھا سکتے تھے۔ [۳] ان سے بہتر انگریزی شرائط کے آگے سر تسلیم خم کرنے کے لئے اور کون مل سکتا تھا۔ چنانچہ ایک طرف کشتۂ ظلم کی لاش منتظر غسل و کفن پڑی تھی۔ دوسری طرف منّا جان اپنی دادی کی مردانہ وار حمایت سے تخت نشینی اختیار کر چکے تھے۔ شاطران فرنگ تیسری طرف نصیر الدولہ سے سودا پٹا رہے تھے۔ برڈ بیان کرتے ہیں:

”اس وقت رات کے ایک بجے ہوں گے جب ریذیڈنٹ نے اپنے رفیق کار

---

[۱] دی ایڈمنسٹریشن آف اودھ، ص ۸

[۲] واجد علی شاہ، ص ۵۰

[۳] بیگمات اودھ، ص ۱۷۴

لیفٹیننٹ شیکسپیئر کو میر منشی التفات حسین خاں بہادر اور مولوی غلام یحییٰ خاں (جو دربار کے وکیل تھے) کے ساتھ نواب نصیرالدّولہ کے گھر پر بھیجا۔ وہ فارسی والے مذکورہ اقرارنامے کو اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ انھوں نے جان بوجھ کر تھوڑی دیر اور لگادی۔ نواب ان لوگوں کی اس خلاف توقع آمد سے مبہوت سارہ گیا۔ لیفٹیننٹ شیکسپیئر نے وہ اقرارنامہ پڑھ کر سنایا جس پر نواب کی دستخط مانگے گئے تھے۔ نواب بڑی خوشی سے کسی طرح کی ہچک کے بغیر اس پر دستخط کے لئے تیار ہوگیا۔ اس کی ہر شرط کے ساتھ اس نے اپنی پوری رضامندی ظاہر کی۔''[۱]

یہ واقعہ برڈ نے برطانوی دارالعوام کی طرف سے ۱۸۳۸ء میں شائع کئے گئے اودھ پیپرس سے لیا ہے، اس لئے اس میں برطانوی مفاد کی رنگ آمیزی ہے۔ ''ہاؤ ٹو میک اینڈ ہاؤ ٹو بریک اے ٹریٹی'' کے مصنّف کا بیان ہے کہ نواب نصیرالدولہ نے جواب میں لکھا کہ اگرچہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے لئے ہر طرح سے قربانی کرنے کے لئے وہ بہت متمنی ہے اور اس کے لئے ہمیشہ تیار ہے لیکن اس اقرارنامے پر دستخط کرنے سے وہ معذور ہے کیونکہ اسے ایسا لگتا ہے کہ وہ دستخط کر کے اپنی اولاد سے ان کا حکومت کرنے کا حق چھین رہا ہے۔

یہ اقرارنامہ جو ۱۸۳۷ء کے معاہدے کے نام سے معروف ہے اتنا رسوا کن تھا کہ گورنر جزل لارڈ آکلینڈ نے لکھا ہے:

''میں یہ ضرور کہنا چاہتا ہوں کے نئے حکمراں سے اس اقرارنامے پر اگر دستخط نہ لیا جاتا تو مجھے زیادہ خوشی ہوتی......''[۲]

اس واقعہ کو بعد میں توڑا مروڑا بھی جا سکتا ہے۔

بہرکیف نواب نصیرالدولہ نے اقرارنامے پر دستخط اس جملے کے ساتھ قبول و منظور است، کر دئے اور انگریز اب منّا جان کو معزول کر کے جنھوں نے انگریزوں کی مزاحمت کے

[۱] اودھ کی لوٹ، ص، ۵۸
[۲] وہی، ص، ۵۹

باوجود تخت پر قبضہ کرلیا تھا نصیر الدولہ کو محمد علی شاہ کی حیثیت سے قبضہ دلانے لے چلے۔
یہ منّا جان، جن کا نام رفیع الدین اور عرفیت محمد مہدی تھی نواب افضل محل کے بطن سے نصیر الدین حیدر کے لڑکے تھے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ نصیر الدین حیدر کو بھی باپ کے پنجۂ غضب سے نواب بادشاہ بیگم ہی نے بچایا تھا اور منّا جان کو بھی بادشاہ بیگم نے ہی نصیر الدین حیدر کی تعدی سے بچایا۔ ورنہ شاید دو میں سے کوئی نہ کوئی تاریخ میں باپ کے ''مقتول ستم'' کے نام سے یاد کیا جاتا۔ شروع میں نصیر الدین حیدر اپنی مربیہ کو ماں سمجھ کے ہر طرح ان کا پاس ولحاظ کرتے رہے مگر منتظم الدولہ حکیم مہدی علی خاں سے نصیر الدین حیدر کو جب یہ معلوم ہوا کہ بادشاہ بیگم کی بدسلوکیوں کی وجہ سے ان کی ماں کا انتقال[۱] ہو گیا تھا تو ان کو بادشاہ بیگم کی طرف سے بددل ہو جانا فطری تھا اور جب قدسیہ محل کے سوگ میں سیاہ پوش ہونے سے انکار کر دیا تو پھر بادشاہ کا غیظ وغضب بے قابو ہو گیا اور انہوں نے طاقت کے بڑے وحشیانہ استعمال سے محل خانہ سلطانی بہ جور وجفا اُن سے خالی کرالیا۔[۲] اب آگے کی داستان شیخ تصدق حسین سے ان کی ہی لفظوں میں ملاحظہ فرمائیے:

''بروقت تخلیہ محل سرائے شاہی نصیر الدین حیدر نے چاہا تھا کہ اپنے بیٹے مرزا رفیع الدین فریدوں بخت عرف محمد مہدی منّا جان کو بیگم کے قبضہ سے نکال کر اس کے نخل حیات کو بھی کاٹ دیا جائے مگر جس طرح بیگم نصیر الدین کے مقابلے میں منّا جان کی حفاظت جان کے لئے سینہ سپر ہو گئیں اور اپنی دلیری اور ثابت قدمی سے نصیر الدین حیدر کے دانت کھٹے کر دیئے اس پر نصیر الدین حیدر نے ضد میں آکر منّا جان کے پسر ناجائز ہونے کے اشتہارات چھپوا کر تمام شہر میں چسپاں کرادیئے تاکہ بیگم صاحب کا منشاء دلی پورا نہ ہو اور منّا جان تخت وتاج سے محروم ہو جائیں۔''[۳]

---

[۱] بیگمات اودھ، ص ۶۴ تا ۶۵

[۲] وہی، ص ۵۹

[۳] وہی، ص، ۶۵

پسر نا جائز ہونے کے محض اشتہارات ہی شہر میں چسپاں نہیں کے گئے بلکہ علماء عمایدسے ایک محضر پر دستخط کرانے کی مہم بھی چلائی گئی۔ جب نصیر الدین حیدر شاہ نے منّا جان کے اپنی فرزندی سے خارج ہونے کی اطلاع ریذیڈنٹ کو دی تو وہ گورنر جنرل سے نصیر الدین حیدر کی جانشینی کے مسئلے میں مشورہ کرنے لگے۔ ڈاکٹر صفی احمد کا کہنا ہے کہ ''انگریز حقیقت حال کی دریافت کے لئے کوشاں رہے مگر سیاسی سازشوں اور امراء وعمائد کی مفاد پرستی کی وجہ سے نصیر الدین حیدر کی اچانک موت تک کوئی قطعیٔ فیصلہ نہیں ہوسکا۔''[۱]

پھر بھی نصیر الدین حیدر کے قائم مقام کے طور پر ان کی معزولی کی صورت میں نصیر الدولہ محمد علی خاں دستیاب افراد میں موزوں ترین شخص پائے گئے تھے۔ چنانچہ کرنل لو اسی موزوں ترین دستیاب شخص کو پوری قیمت وصول کر کے تخت دلانے جب قصر السلطان لائے تو اس کی روداد مورخین طرح طرح سے بیان کرتے ہیں۔ ان سب کے تذکرے اور مطالعے کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ آپ یہاں برڈ کے اقتباس کا ایک حصہ دیکھیں جو ایشاٹک جنرل، مورخہ ۱؍جولائی ۱۸۳۷ء پر مبنی ہے:

''بادشاہ کے چچا کو قبضہ دلانے کے لئے برطانوی افواج کو قصر السلطان پر چڑھائی کرنے کا حکم دے دیا گیا۔ ملکہ اور ان کے بیٹوں (اصل میں پوتوں ہونا چاہیے) کو ۵ منٹ کا وقت دیا گیا کہ وہ تخت حکومت خالی کردیں مگر انھوں نے ایک نہیں سنی لہٰذا کرنل کو محل میں آگ لگانے کا حکم دینا پڑا۔ اس سے دو سپاہی مارے گئے اور آٹھ گھائل ہوگئے۔ کمپنی کے ساتھ اس صف آرائی کے بعد ملکہ اور شہزادہ حراست میں لے لئے گئے اور بادشاہ کے چچا کو تخت نشین کردیا گیا۔ میں وہاں برابر موجود رہا۔ کمپنی کے سپاہیوں نے بڑی لوٹ پاٹ کی۔ تخت میں سجائے گئے سبھی ہیرے جواہر نوچ لئے گئے۔''

برڈ اسی سلسلۂ بیان میں آگے کہتے ہیں:

---

[۱] ٹو کنگس آف اودھ، ص ۲۰

''کمپنی سے ہوئے اس تصادم میں بے حد جانی نقصان ہوا۔ سرکار کی طرف سے مرنے والوں کی تعداد ۳۰۰ اور ۴۰۰ کے درمیان بتائی گئی تھی۔''[۱]

لیکن ایم ایم مسیح الدین کے مطابق اگر سرکار صحیح ڈھنگ سے جانچ کرے تو یہ تعداد ۵۰۰ سے کم نہ ہوگی۔ یہاں پر سوال کیا جا سکتا ہے کہ اس تصادم کے لئے ذمہ دار کون تھا؟

اس سوال کا جواب ایک ہی ہے جو برڈ نے دیا ہے کہ یہ سب نئے معاہدہ کے لئے کمپنی نے کیا کیونکہ نواب نصیر الدولہ کی طرف سے طاقت کے استعمال یا تخت کی دعویداری کا سوال ہی نہ تھا۔ بہرکیف آگ خون کے دریا سے گذر کر محمد علی شاہ ابوالفتح معین الدّین سلطاں زماں محمد علی شاہ بادشاہ کے لقب کے ساتھ تخت نشیں ہوئے۔

محمد علی شاہ ۱۱۹۰ھ کے ذیقعدہ میں بقول امیر علی[۲] پیدا ہوئے تھے۔ صفی احمد سلطان الحکایات[۳] کے حوالے سے ۱۱۹۱ھ بتاتے ہیں جو ۱۷۷۷ء کے مطابق تھا۔ اس لئے شمسی تقویم سے بوقت تخت نشینی ان کی عمر ۶۰ سال اور قمری تقویم سے ۶۳ یا ۶۲ سال تھی۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ وہ گٹھیا اور رعشہ کی وجہ سے تقریباً بیکار تھے۔ اس کے باوجود ان کے نظم ونسق کی ستائش کی جاتی ہے اور اس کے اسباب ہیں۔ اول تو یہ کہ اپنے والد کے زمانۂ فرماں روائی میں وہ دفتر دیوانی کے ذمہ دار تھے اور نظام مالگذاری سے عملی واقفیت رکھتے تھے۔ پھر وہ انگریزوں کی اپنی تلاش تھے۔ ریذیڈنٹ نے جیسے ہی پہلا اعتراض کیا بادشاہ نے جواب دیا:

''یہ الزام آپ کی موجب توہین کا ہوگا کہ ایسے بے دست و پا کو کیوں منصوب کیا میرا حال تو ظاہر تھا اور ابھی کے دن گذرے۔''[۴]

---

[۱] اودھ کی لوٹ، ص ۵۷

[۲] وزیر نامہ، ص ۶۷

[۳] ٹوکنگس آف اودھ، ص ۲۱، حاشیہ (۱)

[۴] سوانحات، ج ص، ۳۵۳

جنرل صاحب بعد ملاحظۂ تحریر کے خود بادشاہ کے پاس آئے اور بہت سا عذر کیا۔[1]

ان حالات میں انگریزی ریکارڈ ان کے قبائح و منقصت سے خالی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اگر ریکارڈ میں کچھ نہ ملے تو پھر کیا باقی رہ جاتا ہے۔ محمد علی شاہ مرحوم کو حسن اتفاق سے بیشتر وزراء ایسے ملے جو انگریزوں کے معتمد اور ریذیڈنسی میں ممدوح تھے۔ نصیرالدین حیدر شاہ کے وزیر روشن الدولہ بہت جلد شکنجۂ حساب کتاب میں کس دیئے گئے اور منتظم الدولہ حکیم مہدی علی خاں کا تقرر ہوا۔ ریذیڈنسی سے ان کی نیازمندی عام طور پر معلوم ہے۔ یہ دو مہینے ہی کام کر سکے تھے کہ پیام اجل آ پہونچا۔ منتظم الدولہ کے بعد ظہیر الدولہ منشی غلام یحییٰ خاں کا تقرر ہوا۔ یہ پہلے ریذنڈنسی میں وکیل شاہی تھے۔ یہ بھی اس وفد کے ایک رکن تھے جسے ریذیڈنٹ نے محمد علی شاہ سے اقرارنامے پر دستخط کے لئے بھیجا تھا۔ ان کی ممدوحیت و محبوبیت میں کیا کسر تھی مگر انھیں موت نے دو مہینے چند دن کا ہی وقفہ دیا۔ ۷ / جنوری کو خلعت وزارت پہننا تھا، ۲۲ / مارچ کو تجہیز و تکفین کا موقع آ گیا۔ ان کے جانشین منتظم الدولہ کے بھتیجے منورالدولہ احمد علی خاں ہوئے۔ یہ بھی چچا کے نقش قدم پر گامزن رہ کے صاحب کلاں بہادر کو راضی رکھنے کا فن جانتے تھے مگر دو ڈھائی سال کے بعد نظم و نسق کی روزافزوں گراوٹ کے باعث بادشاہ کے مطالبے پر مستعفی[2] ہو کے زیارت عتبات عالیات کو روانہ ہو گئے اور انگریز یہی لکھتے ہیں کہ وہ از خود علیحدہ ہو گئے تھے۔ جو ہندوستانی تاریخ نگار بادشاہ کے مطالبے سے واقف[3] بھی ہیں وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ ان کی علیحدگی رضاکارانہ تھی۔

منتظم الدولہ کے بھتیجے کے جانشین ضابطے سے تو ظہیر الدولہ کے بھانجے اشرف الدولہ محمد ابراہیم خاں نہ ہو سکے لیکن نام کے لئے تو ولی عہد سلطنت ثریّا جاہ امجد علی خاں کو وزارت

---

[1] وہی

[2] ٹو کنگس آف اودھ، ص ۳

[3] وہی، ص ۳

کا عہدہ دیا گیا لیکن ڈپٹی کی حیثیت سے کاروبار سارا شرف الدولہ بہادر کے ہی ہاتھ میں رہا۔ ایسا ریذیڈنٹ کالفیلڈ کی صلاح پر ہوا تھا اس لئے شرف الدولہ کو بھی ریذیڈنسی کی پوری حمایت تھی، اس لئے ریذیڈنٹ کے ریکارڈ میں ان کو اچھا لکھا ہی جانا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ سرورؔ جنھوں نے امجد علی شاہ کے دور کی تصویر مسخ کرنے میں اپنی پوری خلاقانہ فنکاری صرف کی ہے وہ شرف الدولہ کے توسل تھے اس لئے انھوں نے شرف الدولہ کی ستائش میں مضامین نو کے انبار لگا دیئے ہیں، اس لئے کوئی ضرورت محمد علی شاہ کو رسوا کرنے کی سرورؔ کو بھی نہ تھی۔ اس لئے اس دور کی مذمت نہیں ملتی تو اب بچارے بعد والے جو انھیں لوگوں کے بے امتیاز خوشہ چیں ہیں تعریف نہ کریں تو کیا کریں۔

یوں فرمارو ایانِ اودھ نے اپنے واقعیٔ حدود و اختیار میں رہ کے اچھی کارگذاری کا مظاہرہ کیا ہے۔ محمد علی شاہ کے کارنامے تو فی الواقع عظیم الشان کہے جا سکتے ہیں۔ ان کو جس عمر اور جن حالات میں بادشاہت میسر ہوئی تھی اس کی بناء پر وہ دین و دنیا دونوں کی طرف چشم ہوش سے نگراں رہے۔ علماء کی طرف سے جو بے توجہی عہد نصیر الدین حیدر میں پیدا ہو گئی تھی اس کی تلافی بڑے اخلاص کے ساتھ محمد علی شاہ نے کی۔ عتبات عالیات کی طرف بھی توجہ ہوئی اور علماء کی طرف بھی۔ اسے اگر آصف الدولہ کی روایت کے احیا کے نام سے یاد کیا جائے تو مطابق واقعہ ہوگا۔ لکھنؤ کو تو وہ پورا پورا بابل بنا دینا چاہتے تھے۔[1] ست کھنڈہ جس کی تکمیل کی مہلت حیات مستعار نے انھیں نہیں دی۔ یہ عمارت وہ بابل کے مینار یا ہوائی باغ کی طرح کی بنوانا چاہتے تھے۔[2]

لیکن ان کا امام باڑہ اپنے طرز کی لاجواب عمارت ثابت ہوا۔ حسین آباد کے امام باڑے پر سے آصف الدولہ کے امام باڑے تک دریا کے کنارے کنارے ایک سڑک بنوائی۔ جامع مسجد کی تعمیر کی تکمیل اپنے ہاتھوں سے نہ کر سکے۔ دس لاکھ روپیہ اپنے محل ملکۂ جہاں کے

---

[1] گزشتہ لکھنؤ، ص ۹۴

[2] وہی

پاس رکھوادیئے تھے۔ انھوں نے جامع مسجد کی تکمیل کرائی۔ ان کے علاوہ حسین آباد کا امام باڑہ اور بارہ دری بھی انھیں کے عہد تعمیر و ترقی کی یادگاریں ہیں۔ انھوں نے صرف امام باڑہ نہیں بنوایا بلکہ حسین آباد کو ایک نئی بستی کی شکل دی۔ بازار، عجائب گھر، تالاب اور معلوم نہیں کیا کیا۔

سرورؔ نے فسانۂ عبرت میں اور میاں دلگیرؔ نے اپنے کلام میں اس آبادی کا ذکر بہت تفصیل سے کیا ہے۔ میاں دلگیر کے منظومات کو ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری نے مدون کر کے شائع کیا ہے اور اس کے مطالعہ سے اس بستی کے متعلق تفصیلی معلومات ہوتے ہیں۔

محمد علی شاہ نے اپنے نام اور کارناموں کو اپنے جس اقدام سے بقا و دوام کی سند دی وہ ۳۶ لاکھ کی ودیعت ہے جو انھوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی میں دوبار کر کے جمع کی۔ اس وقف پر حکومتی نگرانی کے لئے پہلا قانون ۱۸۷۸ء میں بنایا گیا اور تب سے یہ کافی ترمیموں کے عمل سے گزرا ہے۔ لیکن اس کی افادیت وقت کے ساتھ بڑھتی جاتی ہے اور آج طرح طرح سے بندگانِ خدا کی راحت و آسائش کا ذریعہ ہے۔ عہد امجد علی شاہ کی یادگار مدرسۂ سلطان المدارس اور جامعہ سلطانیہ کا احیا اور بقا اسی وقف کی بدولت ہے۔ احیاء کے لئے نواب راحت علی خاں (ڈپٹی کلکٹر) سکریٹری اور ترقی اور موجودہ شاندار عمارت کے لئے آغا ابو صاحب متوّلی کو ہمیشہ شکرگزاری کے ساتھ یاد کیا جائے گا۔

محمد علی شاہ کے سنہ شمسی کے اعتبار سے پانچ سال سے بھی کچھ کم دور حکومت کو دیکھتے ہوئے ان کے کارنامے حیرت انگیز نظر آتے ہیں۔

اس خوش اعمال فرمانروا نے کم و بیش ۶۵ سال کی عمر میں ۱۷/ مئی ۱۸۴۲ء کو رحلت کی۔ اپنے تاریخی امام باڑے میں محوخواب واستراحت ہیں۔

شہزادہ منّا جان جو اپنی دادی نواب بادشاہ بیگم کے ساتھ گرفتار ہو کر کئی دن ریذیڈنسی میں رہے۔ ۷/ ربیع الثانی ۱۲۵۳ھ [1] مطابق ۱۱/ جولائی ۱۸۴۲ء کو کانپور پہونچا دیئے

---

[1] فسانۂ عبرت، ص، ۳۲

گئے۔ وہاں سے چنار گڑھ میں لے جا کر نظر بند کر دیئے گئے اور بسر اوقات کے لئے وظیفہ مقرر کر دیا گیا۔ اسی عالمِ غربت و پریشانی میں تقریباً ۲۵ ؍سال کی عمر میں ان کا ۱۱؍محرم ۱۲۶۲ھ مطابق جنوری ۱۸۴۶ء میں انتقال ہو گیا۔ چنار میں ہی مدفون ہو گئے ان کے بعد بادشاہ بیگم بھی ایک سال سے زیادہ نہ چل سکیں اور ۳؍صفر ۱۲۶۳ھ مطابق ۱۸۴۷ء کو چل بسیں۔ ان کی قسمت میں بھی وہیں آسودۂ خاک ہونا لکھا تھا۔

کمال الدین حیدر نے بتایا ہے کہ منّا جان صاحب اولاد تھے اور تین فرزند یادگار چھوڑے تھے۔

سطور بالا میں امجد علی شاہ کے اسلاف کی سرگذشت مختصر طور سے اس طرح پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ جس سے وہ صورت حال اُبھر کر سامنے آ سکے جس میں اودھ کا تخت امجد علی شاہ کو حاصِل ہوا۔ شاید اس گذارش سے امجد علی شاہ کی صحیح تقدیر و تعیین میں مدد مل سکے۔

اب ہمیں امجد علی شاہ کے حالات کی طرف توجہ کرنی ہے۔

❑❑

# امجدؔ علی شاہ

نازم بنام نامِ سلطاں کہ ازشرف
ترکیبِ آن ز مجد و علا کرد روزگار
شاہے کہ نخل دولت او را بباغ دیں
سر سبز زاب جوئے بقا کرد روزگار
امجدؔ علی شہ آں کہ بہ ذوق دعائے او
صد رہ نماز صبح قضا کرد روزگار
در مدح شاہ غالبؔ رنگیں ترانہ را
چوں بلبلاں ترانہ سرا کرد روزگار

غالبؔ

# امجد علی شاہ کے ابتدائی حالات

## ولادت

مورخین عام طور سے اس بچّے کی ولادت جو اپنے پدر بز گوار نصیر الدولہ فارس الملک مرزا محمد علی خاں بہادر کے شاہ اودھ ہونے کے بعد ولی عہد اور ان کی رحلت کے بعد خود شاہ اودھ ہوا، اوائلِ رمضان ۱۲۱۵ھ بتاتے ہیں۔ منشی سید امیر علی خاں کا بیان ہے:

"ماہ مبارک رمضان ۱۲۱۵ھ کے اوایل میں جنت آرام گاہ (نواب سعادت علی خاں) کا عہد حکومت تھا، کہ آپ کی ولادت سے چمن دولت کو نیا آب و رنگ بہم پہونچا۔"
(ترجمہ)[۱]

لیکن آپ کی تخت نشینی اور انتقال کے وقت کی جو عمریں بتائی جاتی ہے ان کے شمار سے یہ تاریخ درست ثابت نہیں ہوتی۔ کمال الدین حیدر[۲] ۶ ربیع الثانی ۱۲۵۸ھ کو بوقت جلوس آپ کی عمر ۴۳ برس چھ مہینے بیس دن بتاتے ہیں۔ نجم الغنی بھی کمال الدین حیدر کے ہم زبان ہیں۔[۳] امیر علی خاں ۴۳ ر برس بتاتے ہیں۔[۴]

اسی طرح بوقت وفات عمر ۴۸ سال ۵ مہینے ۱۲ دن بتائی جاتی ہے اس لئے اگر ان بیانات کو صحیح تسلیم کرلیا جائے تو ولادت کا ہجری سال ۱۲۱۵ھ نہیں بلکہ ۱۲۱۴ھ قرار پاتا

---

[۱] وزیر نامہ، ص، ۸۳

[۲] سوانحات سلاطین اودھ، ج، ۱، ص، ۶۹

[۳] تاریخ اودھ، ج، ۵، ص، ۲۰

[۴] وزیر نامہ، ص ۸۲

ہے اور راقم کے خیال میں یہی قرینِ صحت ہے کیونکہ ان کے پدر نامدار کی شادی نواب سعادت علی خاں کے مسند نشیں وزارت ہونے کے زمانے میں[۱] ہی ہوگئی تھی اور یہ ۱۲۱۲ھ تھا۔اس لئے امجد علی خاں کا سنِ ولادت ۱۲۱۴ھ تسلیم کرنے میں کوئی دقت نہیں ہے۔

یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ کوئی شخص تخمینی طور پر اتنی قطعیت کے ساتھ اطلاع نہیں دے سکتا۔ زیادہ امکان اسی بات کا ہے کہ اس حساب کی بنیاد پر جن لوگوں نے ولادت کا سال معین کیا ہے ان سے شمار میں غلطی ہوگئی ہے۔ تاریخ نگاروں کا طریقہ بھی یہی ہے کہ عمر کا شمار کر کے تاریخ ولادت طے کرتے ہیں۔ مثال کے لئے شجاع الدّولہ کی تاریخ ولادت ڈاکٹر آشیر وادی لال سریواستوا نے ۲۲ /رجب اس لئے تسلیم کی ہے کہ ہر چرن نے چہار گلزار شجاعی میں بوقت وفات شجاع الدولہ کی عمر ۴۴ سال ۴ ماہ بتائی ہے۔ ڈاکٹر شری واستوا کو سال نہیں طے کرنا پڑا، وہ ۱۱۴۴ھ معلوم تھا۔لیکن مہینہ اور تاریخ عمر کا شمار کر کے ہی معین کئے گئے۔ اسی اصول پر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ امجد علی کی ولادت نصیر الدولہ محمد علی خاں بہادر کے گھر میں ان کی خاص محل جہاں آرا بیگم عرف کھیتو بیگم بنت نواب امام الدّین خاں نبیرۂ وزیر الممالک نواب اعتماد الدولہ قمر الدین خاں وزیر حضرت محمد شاہ شہنشاہ دہلی کے بطن سے اپنے جد امجد نواب سعادت علی خاں کے عہدِ وزارت میں وسط رمضان ۱۲۱۴ھ میں ہوئی۔

لیکن اس امکان کو یکسر مسترد نہیں کیا جا سکتا کہ عمر کا شمار غلط ہو اور صحیح وہ سال ولادت ہو جو امیر علی خاں نے بتایا ہے۔ یعنی ۱۲۱۵ھ بعض ارباب قلم کا رجحان بھی یہی ہے۔ نواب حکیم مرزا محمد کاظم کا اپنی سوانح عمری میں کہنا ہے کہ:

''مسماۃ کھیتو بیگم صاحبہ جو نہایت عالی خاندان تھیں عہد سلطنت میں ملکہ آفاق کے خطاب سے مخاطب ہوئیں۔''

شیخ تصدق حسین کا ان ملکۂ کے بارے میں بیان ہے:

---

[۱] وزیر نامہ، ص ۷۶

''ملکۂ آفاق نصیر الدولہ نواب محمد علی خان پسر نواب سعادت علی خاں کو بہ زمانہ صاحبزادگی منسوب ہوئیں۔ان کا نام جہاں آرا بیگم عرف کھیتو بیگم تھا۔ جب بعد انتقال شاہ نصیر الدین حیدر ان کے شوہر سریر آرائے سلطنت ہوئے تو بیگم صاحبہ کو ''نواب ملکہ آفاق مخدرہ عظمی ممتاز الزمانی نواب جہاں آرا بیگم عرف کھیتو بیگم'' کا خطاب عطا فرمایا۔

انھیں ملکۂ آفاق نے شاہ نصیر الدین حیدر کی کربلا کے جانب غرب تھوڑ ہی دور پر محلہ مکاراً گنج میں اپنی شہرۂ آفاق کربلا تعمیر کرائی جس کے گنبدوں اور میناروں کی سنہری کلسیاں دور ہی سے جگمگاتی ہوئی نظر آتی ہیں۔اس کربلا کا دوسرا نام عسکر یین بھی ہے۔اس میں حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام اور حضرت امام علی نقی علیہ السلام کے مزارات سامرہ کی نقل بنائی گئی ہیں۔[۱]

ملکہ آفاق کی سیرت کے بارے میں شیخ صاحب، کمال الدین حیدر کا حسب ذیل بیان نقل کرتے ہیں:

''مرحومہ فی الحقیقت صاحب اوقات تھیں، روز وشب عبادات خدا میں بسر کرتی تھیں اور مصائب خامس آلِ عبا (امام حسینؑ) میں مصروف ہتی تھیں اور از راہ مآل اندیشی چھ لاکھ جو حضرت فردوس منزل محمد علی شاہ نے بھیجے تھے[۲] وہ اور باقی اپنے پاس سے ملا کر جملہ تیرہ لاکھ کے نوٹ اپنے نواسے مرزا علی قدر کے نام کر دیئے تھے جن کا منافع چھ ہزار ماہوار ہوتا ہے۔ بطریق قرضہ موبد گورنمنٹ سے معرفت نواب منیر الدولہ تھے۔اس صرف سے امام باڑہ میں رونق رہتی تھی اور متروکہ موافق سہم شرعیہ تقسیم ہوا۔ایک حصّہ حاکم وقت یعنی بادشاہ، دوسرا جناب عالیہ نواب ملکہ کشور بدعوی متروکہ پدری نواب حسین الدین خاں (ملکۂ آفاق کے بھائی) تیسرا حصّہ بڑی شہزادی زوجہ نواب محسن الدولہ، چوتھا چھوٹی شہزادی زوجہ نواب منیر الدولہ کا ہوا چنانچہ فی کس پانچ لاکھ روپئے علاوہ جواہر

---

[۱] بیگمات اودھ، ص، ۱۷۶

[۲] شیخ تصدق حسین کہتے ہیں کہ یہ رقم دین مہر میں دی گئی تھی، ص، ۱۷۷، بیگمات اودھ

واسباب کے ملا اور تنخواہ دار ملازمین قدیم زن و مرد کے لئے داخل وصیت تھا کئی برس تک یہ انتظام رہا۔ اب وہ سب نوٹ گورنمنٹ سے لے کر نواب محسن الدولہ اپنے صرف میں لائے۔''[۱]

یہاں پہنچ کر علامہ کنتوری مولانا حکیم سید غلام حسنین (متوفی ۱۹۱۸ء) کا وہ بیان یاد آتا ہے جس میں انھوں نے ''جناب عالیہ مرحومہ'' کے ۵ رلاکھ کے وقفی نوٹ کا تذکرہ کیا ہے۔ اگرچہ علامہ نے ''جناب عالیہ'' کی صراحت نہیں کی ہے جناب عالیہ ہرنا درشاہ کو کہا جاتا ہے چونکہ کسی اور ملکہ کا اس قدر صاحب مقدرت ہونا معلوم نہیں ہے۔ ملکۂ کشور اس لئے مراد نہیں ہوسکتیں کہ ان کے نوٹ وقفی کی تولیت ان کے فرزندوں میں سے کسی کی ہوتی، بعض امرائے لکھنؤ کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ اسلئے ظن غالب ہے کہ علامہ کا حسب ذیل بیان ملکۂ آفاق کے بارے میں ہے:

لکھنؤ میں ایک نوٹ وقفی تعدادی ۵ رلاکھ روپیہ جناب عالیہ مرحومہ کا جو خاص واسطے اجرائے مدرسہ کے تھا اور اس کو بعض امرائے لکھنؤ نے (نام نہ لوں گا کیا فائدہ) ہضم کرلیا تھا، اس کا پتہ لگا چونکہ مسودہ وقف اور دیگر کاغذات ہمارے نانا مولوی نوازش احمد صاحب منشی خانہ بادشاہی کے رکن رکین کے لکھے ہوئے تھے ان کاغذات کو بڑی تلاش سے بہم پہونچایا اور نوٹ کا نمبر بھی مل گیا۔''[۲]

مگر اس نوٹ کی بازیابی کی سعی کامیاب نہ ہوسکی۔ اس کی تفصیل میں جانا اس کتاب کے موضوع کے لئے غیر ضروری ہے۔ مقصد بس اتنا ہے کہ ملکہ کی علم دوستی کا ایک نمونہ سامنے آجائے اور یہ معلوم ہوسکے کہ امجد علی شاہ کی دین داری وعلم دوستی میں ان کی مادر معظّمہ کا بھی ہاتھ ہے۔

ملکۂ آفاق کے بطن سے امجد علی شاہ کے علاوہ ''نواب سلطان عالیہ بیگم جو بڑی شہزادی

---

[۱] بیگمات اودھ، ص، ۱۷۹

[۲] لائف یعنی سوانح عمری، از مولانا غلام حسین کنتوری، ص ۱۴

مشہور تھیں یہ شاہ زمن غازی الدین حیدر کے نواسے نواب محسن الدولہ کو منسوب تھیں اور نواب روشن آرا جو چھوٹی شہزادی کے نام سے مشہور تھیں، ان کی شادی نواب سرفراز الدولہ کے بیٹے نواب منیر الدولہ کے ساتھ ہوئی تھی۔"[۱]

ملکۂ آفاق نے بتاریخ ۲۰/اکتوبر ۱۸۵۰ء بروز یکشنبہ قریب شام اپنی جائے سکونت حسن باغ میں ہیضہ وبائی سے خاموش زندگی بسر کر کے انتقال کیا۔ دوسرے روز انھیں کا تعمیر کردہ امام باڑہ ان کی دائمی آرام گاہ بنا۔ سنگ مزار پر جو کتبہ درج ہے اس کا آخری شعر یہ ہے۔

کن دعا صالح چنین ہر دم برائے مغفرت
حق ببرفردوس منزل ملکۂ آفاق را[۲]

## تعلیم وتربیت

بادشاہوں کے ابتدائی حالات پر ارباب تاریخ نے یوں بھی توجہ کم ہی کی ہے۔ امجد علی شاہ تک اورنگ حکومت پہونچنے کے امکانات تو یوں بھی نہیں تھے۔ اسے تو اتفاقی بات ہی سمجھنا چاہیے کہ سلطنت نصیر الدین حیدر کے بعد ان کے چچا کو منتقل ہوئی۔ اس لئے ابتدائی حالات کا پتہ نہیں چلتا۔ لیکن ان کی مذہبیت کو ان کی تعلیم اور علماء کی صحبت کا نتیجہ قرار دیا جاتا ہے۔ شرر لکھتے ہیں:

"محمد علی شاہ نے کوشش کی تھی کہ ولی عہد سلطنت کی تعلیم اعلیٰ درجہ کی ہو۔ چنانچہ انھیں علماء وفضلاء کی صحبت میں رکھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ امجد علی شاہ بجائے اس کے کہ تعلیم میں کوئی نمایاں ترقی کریں، اخلاق وعادات کے لحاظ سے ایک ثقہ مولوی بن گئے۔"[۳]

---

[۱] بیگمات اودھ، ص، ۱۷۷

[۲] وہی، ص، ۱۷۸

[۳] گزشتہ لکھنؤ، ص، ۹۵

مگر مولانا شررؔ کا بیان سمجھ میں نہیں آتا۔ کیونکہ محمد علی شاہ جب بادشاہ ہوئے تو ولی عہد کی عمر ۳۹ سال کی تھی اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ اس پختہ عمر میں علماء وفضلاء کی صحبت کے فیضان نے انھیں اس قدر متاثر کیا کہ وہ ثقہ مولوی بن گئے تو بھی اس عمر کی کیفیت کا پتہ نہیں چلتا جو تحصیل علم کی ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ نواب سعادت علی خاں، امجد علی خاں کی پندرہ سال کی عمر تک حیات رہے اس لئے یہ قیاس کرنے کے قوی اسباب ہیں کہ پوتے کی تعلیم کا دادا کی توجہ سے بہت معقول انتظام ہوا ہوگا۔ ڈاکٹر صفی احمد نے امین الدولہ کو امجد علی شاہ کا اتالیق واستاد (ٹیوٹر)[1] بتایا ہے۔

لیکن ان کو کمال الدین حیدر کی عبارت سمجھنے[2] میں مسامحہ ہوا۔ شہزادوں سے مراد امجد علی شاہ کے فرزند ہیں وہ خود نہیں۔ اس لئے تعلیم وتربیت کے مفصل اور معتبر حالات سے ایک طرح لاعلمی ہی ہے۔ ڈاکٹر صفی احمد ''شیعہ فقہ کا اچھا عالم'' بتاتے ہیں۔''[3]

## شادی

اپنے حقیقی ماموں اور پھوپھا بھی، نواب حسین الدین خاں رسالدار اودھ کی صاحبزادی نواب سعادت علی خاں کی نواسی نواب تاج آرا بیگم سے ہوئی۔ جنھیں سسرال سے خاتون معظّمہ بادشاہ بہو نواب ملکۂ کشور صاحبہ خطاب ہوا یہ شادی بقول منشی سید امیر علی[4] غازی الدین حیدر شاہ کے عہد فرماں روائی میں ہوئی۔ شیخ تصدق حسین کا یہ فرمانا کہ ''نواب تاج آرا بیگم امجد علی شاہ کو بزمانہ ولی عہدی بیاہی گئیں[5] لغزش قلم کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ شیخ صاحب کی

---

[1] ٹوکنگس آف اودھ، ص ۳۸

[2] سوانحات، ج ۱،

[3] ٹوکنگس آف اودھ، ص ۵۳

[4] وزیرنامہ، ص ۸۳

[5] بیگمات اودھ، ص ۱۸۱،

جو نظر تاریخ اودھ پر تھی اسے دیکھتے ہوئے یہ غلطی مستبعد ہے۔

ملکہ کے ذاتی عادات و خصائل دیکھنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ان کی وجاہت خاندانی کا اثر دیکھ لیا جائے کہ ان سے رشتہ ہونے کا اشتیاق کسے کسے اور کتنا تھا۔ راقم کی نظر میں اگرچہ کمال الدین حیدر کے بیانات بڑی نظر احتیاط سے دیکھے جانے کے لائق ہیں پھر بھی ان کا یہ بیان دیکھے جانے کے قابل ہے:

''نواب معتمدولہ آغا میر نے دوسرا امر صاحب عالم (نصیرالدین حیدر) کے واسطے یہ کیا کہ پہلے نسبت نواب نصیرالدولہ کی بڑی صاحبزادی سے ٹھہری تھی اسے بادشاہ کو کچھ سمجھا بجھا کر چھڑا دیا۔ دوسری نسبت نواب حسین الدین کی بیٹی سے یعنی نواب ملکہ کشور سے، اسے برہم کیا۔ ادھر نواب نصیرالدّولہ سے بیس ہزار لے کر حضرت جنّت مکاں سے شادی کرادی۔''[1]

ہوسکتا ہے کہ رشوت کی حقیقت نہ ہو۔ یہ بھی کمال الدین حیدر کی ہوائی ہو لیکن اتنی حقیقت تو ہے ہی کہ ملکہ کشور کا رشتہ پہلے نصیرالدین حیدر سے طے ہوا تھا۔ مگر آغا میر نے بھانجی ماردی اور تب یہ شادی امجد علی شاہ سے ہوئی۔ آغا میر نے تو اپنی ایسی کوشش کرڈالی کہ اس خاتون باعظمت کو ملکہ ہونے سے محروم کردیا جائے مگر مشیت یہ اعزاز ان کو مقسوم کرچکی تھی جو اس طرح بہم پہونچا۔

نواب ملکۂ کشور اپنے گونا گوں اوصاف، زبردست شخصیت، بحالی سلطنت کی جان لیوا مساعی کے باعث زبردست تاریخی اہمیت کی مالک ہیں۔ ان کا تذکرہ بجائے خود ایک مبسوط تصنیف کا موضوع ہے۔ یہاں تو بس سرسری اشارے ہی کئے جاسکتے ہیں۔ شیخ تصدق حسین بتاتے ہیں:

''ملکہ کی رنگت کندنی، ناک نقشہ سڈول اور قد میانہ بوٹا سا تھا، جسم چھریرہ اور خوش

---

[1] سوانحات، ج، ص، ۱۸۱

نما، آنکھیں بڑی بڑی سیاہ چمک دار، بال سیاہی مائل بھورے رنگ کے اور ہاتھ پاؤں چھوٹے اور نازک تھے۔ اپنے شوہر نامدار کی زندگی میں وہ بہت خوش وخرّم رہتی تھیں، مگر ضبطی سلطنت کے بعد وہ مغموم اور اداس رہنے لگیں۔ ڈیل بھاری ہوگیا، چستی و چالا کی جاتی رہی، اور ولایت جانے سے قبل ان کی نزاکت اور خوبصورتی زایل ہوچکی تھی۔''[۱]

وہ اپنے مذہب کی بہت پابند تھیں، شب کو دیر سے آرام کرتی تھیں، اسی سبب سے صبح کو دیر سے بیدار ہوتی تھیں اور ملازموں کی مدد سے ہاتھ منھ دھو کر اور تھوڑی سی روغنی ٹکیہ اور بالائی کا ناشتہ کر کے اپنے توشہ خانے میں چلی جاتی تھیں جہاں مولوی صاحب پس پردہ بیٹھ کر ان کو کلام پاک پڑھ کر سنایا کرتے تھے۔

اپنے شوہر کے انتقال کے بعد وہ خود رات گئے تک قرآن مجید کی تلاوت کیا کرتی تھیں۔ ان کی استعداد علمی اچھی تھی اور فارسی بخوبی لکھ پڑھ لیتی تھیں۔[۲] ضبطی سلطنت سے قبل ریذیڈنٹ نے ایک کونسل آف ایجنسی یعنی مجلس نظامت قائم کرنے کی تجویز پیش کی تھی، جس میں والدۂ محترمہ بادشاہ سلامت کا سب سے پہلے ذکر کیا ہے کہ وہ نہایت ہوش مند اور بیدار مغز خاتون ہیں۔ اصلیت بھی یہ ہے کہ بعد الحاق اودھ انہوں نے انگلستان جانے کا جوعزم بالجزم کیا اور باوجود ضعیف العمری کے جس استقلال اور تن دہی سے انھوں نے سات سمندر پار جا کر بحالی سلطنت کی جان توڑ کوشش کی وہ اس بات کا کافی ثبوت ہے کہ ریذیڈنٹ نے ان کی فہم وفراست کا جو اندازہ کیا تھا وہ سرمو غلط نہ تھا۔[۳] ڈاکٹر صفی احمد نے ملکۂ کشور کی شخصیت اور ان کے اثرات کو اس طرح پیش کیا ہے:

''حکومت میں ملکۂ کشور کا زبردست اثر تھا۔ امجد علی شاہ کے زمانے میں محل میں وہ مختار مطلق تھیں اور امور سلطنت میں بھی ان کا بہت وزن تھا۔ بادشاہ کو ان سے اتنا انس

---

[۱] بیگمات اودھ، ص ۱۸۶

[۲] بیگمات اودھ، ص ۱۸۳

[۳] وہی، ص ۱۹۱

اور ان کی نظر میں اس درجہ عزت تھی کہ انھوں نے بادشاہ کو ہجوم ازواج و محلات سے بچا لیا تھا ایک بار جب انھوں نے اور ایک شادی کر لی تو ملکہ نے ان سے کئی دن تک بات چیت نہیں کی اور وزیر و امراء کی مداخلت نے بے تعلقی کو ختم کرایا۔ جنھوں نے آ کر عرض کیا کہ اگر سرکار اس رویّے کو جاری رکھیں گی تو سلطنت کو نقصان عظیم پہونچنے کا اندیشہ ہے۔''[۱]

جیسا کہ ہم ابھی دیکھ چکے ہیں کہ ملکہ بحالی سلطنت کا مطالبہ لے کے ولایت گئی تھیں۔ ملکہ وکٹوریہ سے بہت امید افزاء ملاقات ہوئی مگر جب ۱۸۵۷ء کی جدو جہد آزادی کی خبریں ولایت پہونچنے لگیں تو صورت حال مایوس کن ہو گئی اور ملکہ پیرس چلی گئیں۔ وہاں کی خاک دامن گیر ہوئی اور ملکہ ۲۴؍جنوری، ۱۸۵۸ء کو آلام روزگار سے ہمیشہ کے لئے نجات پا گئیں اور وہیں پیوند خاک ہوئیں۔ افسوس کہ اس غربت کے مارے قافلے کو وہاں پے در پے جانی نقصان بھی ہوئے۔ ماں کے بعد مرزا اسکندر حشمت لندن آ کر خود بھی بیمار ہوئے اور ماں کی رحلت کے کم و بیش مہینے بھر بعد رحلت کر گئے۔ لاش پیرس کے لئے ۲؍مارچ ۱۸۵۸ء کو روانہ ہوئی اور وہیں ماں کے پہلو میں سپرد خاک کر دی گئی۔ اس واقعہ کے بعد مرزا اسکندر حشمت کی خوردسال صاحبزادی نے بھی وہیں انتقال کیا اور دفن کی گئیں۔

ان المناک سانحوں کے بعد بے دست و پا قافلہ وطن لوٹ آیا اور ان کی مظلومیت اور انگریزوں کی ہوس ملک ستانی کی بہیمانہ کہانی ہمیشہ کے لئے صفحات تاریخ پر ثبت ہو گئی۔ ملکہ کے تعمیرات کی بابت شیخ تصدق حسین کا بیان ہے:

''ملکہ کے نام کا ایک محلہ کشور گنج وارڈ سعادت گنج میں لکڑ منڈی سے متصل آباد تھا اب وہ بھی ٹوٹے ہوئے دل کی طرح بالکل اجڑا ہوا سنسان پڑا ہے۔ مگر ایک نہایت خوبصورت مسجد کشمیری محلہ وارڈ سعادت گنج لکھنؤ میں ان کی یاد تازہ کرنے کو اب تک موجود ہے۔ حضرت گنج کے قریب ایک محلہ جناب گنج ملکۂ کی یادگار میں بھی بسایا گیا تھا

---

[۱] ٹوکنگس آف اودھ، ص، ۸۹

جو امتداد زمانہ سے اب گمنام ہوکر رہ گیا ہے۔''[1]

ملکہ کشور سے امجد علی شاہ کی حسب ذیل اولادیں تھیں۔

۱۔ واجد علی شاہ

۲۔ مرزا محمد جواد علی جنرل سکندر حشمت۔

۳۔ اشرف النساء بیگم جو نواب سرفراز الدولہ پسر نواب منیر الدولہ سے منسوب ہوکر افسر بہو صاحبہ کے نام سے مخاطب ہوئیں۔

نواب ملکۂ کشور کے علاوہ امجد علی شاہ کے دوسرے جن محلات کا نام ملتا ہے وہ بروایت کمال الدین حیدر یہ ہیں:

۱۔ نواب خسرو بیگم ملکۂ گیتی جن سے دولڑکے ہوئے۔

(۱) مرزا محمد رضا علی دار اسطوت

(۲) مرزا محمد حسین علی سکندر قدر

۲۔ نواب ملکہ عہد تاج، مخدرات مغفور محل صاحبہ ان سے۔

(۱) مرزا سلیماں قدر بہادر

(۲) کسریٰ شکوہ مرزا محمد عباس دو فرزند ہوئے۔[2]

شیخ تصدق حسین ان کے علاوہ سلطان محل دوم کا تذکرہ کرتے ہیں[3] جسے سبزی فروش کی لڑکی بتاتے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر صفی نے سلطان الحکایات مصنّفہ لال جی کا اقتباس نقل کیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ لڑکی بیڑہ فروش تھی اور اسے سلطان محل امتیاز النساء بیگم کا خطاب دیا گیا تھا۔

امجد علی شاہ کے ایک فرزند جو اکبر اولاد تھے شہزادہ بہرام صولت مرزا محمد مصطفی علی حیدر

---

[1] بیگمات اودھ، ص ۱۹۷

[2] سوانح، ج ۱، ص ۱۲

[3] بیگمات اودھ، ص ۸۔۱۹۷

خاں تھے۔ ان کا تذکرہ اس وقت قدرے بسط کے ساتھ آئے گا جب امجد علی شاہ کے ولی عہد کی نامزدگی پر بحث ہوگی۔

سلیمن تین اور ازواج کا ذکر کرتے ہیں۔ اور ان کے اعتماد پر لال جی سلطان الحکایات[1] میں درگا پرشاد تاریخ اجودھیا[2] میں صفی احمد اپنے مقالہ تحقیق ٹوکنگس آف اودھ میں حسینی خانم، مصاحب خانم، سکینہ خانم کا ذکر کرتے ہیں۔ کمال الدین حیدر نے ازواج امجد علی شاہ کے بیان میں ان کا ذکر نہیں کیا ہے۔ ڈاکٹر صفی احمد[3] بادشاہ کے مکتوب بنام گورنر جنرل مورخہ ۵ ر ستمبر ۱۸۴۴ء کے حوالے سے سکینہ خانم کو مصلح الدولہ میر حسن علی لندنی کی منکوحہ اور بادشاہ کی منظور نظر بتاتے ہیں۔

معلوم نہیں اس میں سے کون سا سلسلۂ روایات یہ حضرات درست سمجھتے ہیں۔ ایک طرف امجد علی شاہ کی پاک بازی ملکہ کشور کا اثر اور اس کا یہ ثمرہ بتایا جاتا ہے کہ بادشاہ کے ملکہ سے انس اور ملکہ کے مزاج کی بدولت امجد علی شاہ ہجوم ازواج سے محفوظ رہے دوسری طرف منکوحہ عورت کو منظور نظر کے روپ میں پیش کیا جاتا ہے۔

سلیمن کا جو مشن تھا اور انہوں نے جس طرح اسے پورا کیا اسے اگر نظر میں رکھا جائے تو یہ محض بہتان معلوم ہوتا ہے اسے بھی پیش نظر رہنا چاہیئے کہ امجد علی شاہ کی حیات تک ان کی والدہ نواب ملکہ آفاق موجود تھیں ان کا فرزند ارشد پر جو اثر تھا اسے دیکھتے ہوئے یہ سب سلیمن اور ان کے دیسی و بدیسی ہم صفیروں کی پرواز تخیل کے سوا کچھ نہیں۔

## ولی عہدی

جب محمد علی شاہ کو تخت و تاج پر تسلط کلی ہو گیا تو خلف ارشد مرزا امجد علی خاں بہادر کو ولی

---

[1] ٹوکنگس آف اودھ، ص ۵۴

[2] ص، ۹۵

[3] ٹوکنگس آف اودھ، ص ۵۱

عہد سلطنت نام زد کرنے کے لئے تحریک کی، جس کے بعد بقول کمال الدین حیدر:

''۴ جمادی الثانی سنہ الیہ ۱۵ / اکتوبر خلعت عہدہ جلیلہ سے سرفراز ہوئے''[1]

مگر اس میں تاریخ کی غلطی ہے۔ ہم دیکھ چکے کہ ۳ / ربیع الثانی ۷ / جولائی کو ۱۲۵۳ھ میں واقع ہوئی تھی، اس لئے ۴ / جمادی الثانی کو ۴ / ۵ ستمبر ہونا چاہئے۔ بہر حال ولی عہدی کو گورنر جنرل کے یہاں سے توثیق ہونے کے بعد ''نجم الدولہ ابو المظفر ثریا جاہ سپہر شکوہ صاحب عالم ولی عہد بہادر مرزا محمد امجد علی بہادر'' کے خطاب سے مخاطب ہوئے[2] حکیم مرزا محمد کاظم کے بقول: ''ولی عہد امجد علی خاں کی تنخواہ ۲۵ / ہزار سالانہ تھی[3]''

# انتظامی ذمہ داریاں

ہم دیکھ چکے ہیں کہ جب محمد علی شاہ زینت اورنگ سلطنت ہوئے تھے تو ان کی جسمانی کیفیت کیا تھی اس لئے یہاں اس کے اعادے کی ضرورت نہیں۔ اپنی مجبوریوں کی وجہ سے بس وہ پلنگڑی پر بیٹھے بیٹھے حکم جاری کیا کرتے تھے۔[4] نقل و حرکت سے معذور تھے، کاروبار سلطنت میں نقل و حرکت کے بغیر چارہ نہیں اور ایسے تمام امور جن کے سرانجام سے بادشاہ مجبور تھے، بادشاہ کی نیابت میں ولی عہد ثریا جاہ بہادر ہی بجالاتے تھے۔

مثلاً ریذیڈنسی کی دید و باز دید، گورنر جنرل کا استقبال اور تمام تقریبات جن میں بادشاہ کی شرکت ہونی چاہئے تھی وہ سب ولی عہد کے ہی ذمہ تھی، ولی عہد کا جلوس بھی شاہی تزک و احتشام سے نکلتا تھا۔

دسمبر ۱۸۳۷ء میں گورنر جنرل کی کانپور میں آمد ہوئی، ولی عہد اور وزیر اعظم کے

---

[1] سوانحات ج ۱ ص ۱ / ۳۵
[2] وزیر نامہ ص ۸۳
[3] سوانح عمری ص ۲۷
[4] بیگمات اودھ ص ۱۷۴

استقبال و ملاقات کے لئے کان پور جانے کی ٹھہری مگر اتفاق سے وزیر اعظم مرض الموت میں مبتلاء ہو گئے۔ وزیر اعظم کے بجائے مہاراجہ بال کرشن [1] ولی عہد کے ہمراہ گئے اب اس سفر کا ذکر مرزا رجب علی بیگ سرور سے سنئے:

''نواب نے گورنر جنرل بہادر کی کانپور میں آنے کی خبر سنی، سفر کی تیاری گھر گھر سنی ،صاحب عالم بہادر ثریا جاہ ونواب منتظم الدولہ خیر خواہ کا عزم کان پور کی طرف ٹھہرا، اب سپہر بے مہر اور چال چلا ڈھنگ نیا بدلا، دفعتہً نواب کی طبیعت علیل ہوئی، مقدمات کی اور سبیل ہوئی، ۲۰؍ ماہ مبارک رمضان (۱۹؍دسمبر ۱۸۴۷) سہ شنبہ تھا، صاحب عالم نے کوچ کیا۔ نواب منتظم الدولہ پر مرض کا غلبہ ہوا، ۲۶؍شہر صدر دوشنبہ کو صاحب عالم بہادر ثریا جاہ ونواب گورنر جنرل سے ملاقات کانپور میں ہوئی اسی شب منتظم الدولہ نواب مہدی علی خاں کی روح جنت میں پہنچی ............ واقعی مرد نماز گزار، شب زندہ دار، صائم النہار تھا۔ ہزار ہا روپیہ مکہ معظّمہ و مدینہ منورہ و نجف اشرف و کربلائے معلیٰ جاتا تھا، اس کی بدولت سینکڑوں محتاج آرام پاتا تھا۔'' [2]

یہ ہزار ہا روپیہ عتبات عالیہ جانا حکیم مہدی اور محمد علی شاہ کے عہد تک ہنر اور قابل تعریف وصف تھا۔ کیوں کہ دونوں ''مقبول گورنمنٹ'' تھے لیکن امجد علی شاہ اور امین الدولہ کے وقت میں یہ عیوب والزامات میں شامل ہو گیا۔

ولی عہد کی سواری کے تزک و احتشام کا بیان منظومات میاں دلگیرؔ میں دیکھیں۔ ایک موقع وہ ہے جب مسجد جامع کی تعمیر کا فیصلہ ہو چکا ہے اور اسی جگہ عید کا جلسہ کئے جانے کا اہتمام کیا گیا ہے اس موقع پر ولی عہد کے جلوس کی تصویر کشی دلگیرؔ یوں کرتے ہیں:

ہوا عزم سواریٔ ولی عہد قریب آئی عماریٔ ولی عہد
امیروں کو ہوا حکم شہنشاہ کہ جلدی جائیں اسواری کے ہمراہ

---

[1] سوانحات ج ۱ ص ۳۱۲

[2] فسانۂ عبرت، ص، ۳۵

عماری بھی مغرق پالکی بھی
ہر اک شہزادے کو حضرت نے بخشی
کمر میں تھی ، وہ تیغِ اصفہانی
نہیں تلوار کوئی جس کی ثانی
قریں ہاتھی کے روشن چوکی والے
قبائیں پہنے اور اوڑھے دوشالے
سب شہزادے داہنے اور بائیں
خوشی لیتی تھی ہر اک کی بلائیں
پھر ان کے بعد سب ارکان دولت
عیاں چہروں سے سب کے شان دولت
جو درباری تھے ان کا تھا یہ عالم
کہ تھے حد سے زیادہ شاد و خرّم
سواری دیکھنے اُمڈی تھی خلقت
در دولت سے تا مسجد تھی کثرت
در دولت سے یوں نکلی سواری
تو ہو کر شاد سب خلقت پکاری
ولی عہد ، اے خدا با جاہ و شوکت
رہے سائے میں حضرت کے سلامت
الٰہی بادشہ کو تو شفا دے
رہے قائم، یہ شاہ اور شاہزادے[1]
بیاں میں کرچکا بازار کا حال
سنو اب پھر سواری کا تم احوال
کئی تھے ہاتھیوں پر بیلہ بردار
ہر اک سو روپیوں کی، کرتے بوچھار
کئی جانب رہا تھا گوزروسیم
ولی عہد، آپ بھی کرتے تھے تقسیم
عظیم اللہ خاں بھی پیچھے پیچھے
بہت ہنس ہنس کے روپئے بانٹتے تھے[2]

دوسرا موقع، حسین آباد کے تالاب مثمن کی تعمیر کے بعد وہاں میلے کی بنا ہوئی ہے۔ اس میں ولی عہد کی سواری اس شان سے جاتی ہے۔

جلو میں شملہ باندھے ناقہ اسوار
کئی پیک آگے آگے برق رفتار
سواری میں بہت سے گھوڑے کوتل
بہت سے ساتھ اسوار اور پیدل
کئی سو سے زیادہ بان بردار
پھر ہرے جن کے رنگیں اور زرتار

---

[1] منظوماتِ میاں دلگیر، ص ۷۴۔۷۳
[2] نگارشاتِ ادیب، ص ۱۲۳

جلو میں برچھیوں والے بہت خوب | وہ ان کی برچھیاں، اچھی خوش اسلوب
سوار فیل باصد شان و شوکت | جلو میں دبدبہ، ہمراہ حشمت
رفیق الدولہ ان کے ساتھ اسوار | بدن میں ان کے تھی پوشاک زرتار
ہر اک سردار کی آئی سواری | لب تالاب شاہی باری باری
امیرِ شہر بنئے اور مہاجن
تمام آئے تھے اس جا دولھا بن بن[1]

مرحوم پروفیسر مسعود صاحب کا معاصر پٹنہ حصّہ ۱۸۔ص، ۳۰ کے حوالہ سے ارشاد ہے کہ اسی موضوع پر شہید شاگرد ناسخؔ کی بھی ایک مثنوی ہے جس کا مخطوطہ کتب خانہ سالار جنگ حیدر آباد میں ہے۔[2] دوسرے معاصر شعراء کے یہاں بھی اس طرح کی چیزوں کا ہونا ممکن ہے۔

اس طرح کی قائم مقامی و نیابت کے علاوہ کچھ فوجی دستوں کی کمان بھی ولی عہد سے متعلق تھی۔ان دستوں کی تنخواہ ایک دفعہ مکرّر تقسیم ہوگئی۔ یہ معاملہ بھی امجد علی خاں کی مرشد زادہ مصطفی علی حیدر سے ناخوشی کا سبب بنا۔ڈاکٹر جی ڈی بھٹنا گر بیان کرتے ہیں:

''ایک بار جب امجد علی نے اپنے کسی دستے کی تنخواہ ایک مہینے میں دو بار تقسیم کردی تو کہا جاتا ہے کہ مصطفی علی (حیدر) نے یہ بات بادشاہ تک پہونچا دی اور بادشاہ نے مہاراجہ بال کرشن دیوان سے اس بے قاعدگی کے لئے جواب طلب کیا۔''[3]

## وزارتی ذمّہ داریاں

یہ تو پتہ نہیں چلتا کہ وزیر اعظم، ولی عہد کے اور ڈپٹی شرف الدولہ کے مقرر ہونے کے

---

[1] وہی، ص۔۹۸۔۱۰۰

[2] نگارشاتِ ادیب ص ۱۳۰

[3] اودھ انڈر واجد علی شاہ، ص ۴

بعد دونوں میں تقسیم فرائض کس طرح تھی۔لیکن یہ معلوم ہے کہ دونوں میں اختلافات و کشاکش کی صورت تھی۔ ڈاکٹر صفی احمد نے ریذیڈنٹ جان لو کے خط اور کتاب اخبار ڈیوڑھی بادشاہ اودھ کا انھوں نے اقتباس نہیں دیا، اس کے حوالے سے بس یہ بتایا ہے کہ ''بادشاہ مرحوم خود ان کے والد نے بھی انھیں شرف الدولہ سے تعاون پر آمادہ کرنے کی کوشش کی، جنھیں وہ ایک قابل منتظم سمجھتے تھے''[۱] البتہ لو کی تحریر کا اقتباس دیا ہے اس کا ترجمہ یہ ہے:

''میں نے لکھنؤ پہونچ کے، ان لوگوں (وزیر اعظم) اور (شرف الدولہ) سے کہا کہ ایک معاملے میں فوری طور پر مجھے کافی سکون پہونچانا ان کے اختیار میں ہے۔یعنی وہ ایک دوسرے سے حقیر رشک وحسد ختم کر کے اتحاد و اتفاق سے اپنے بادشاہ و ملک کے مفاد میں کام کر سکتے ہیں۔''[۲]

اتنا اندازہ حالات کی مدد سے بہر حال ہوتا ہے کہ زیادہ تر نظم ونسق کی باگ ڈور شرف الدولہ کے ہاتھ میں رہی کیوں کہ عہد محمد علی شاہ میں انھیں ریذیڈنسی کی مسلسل حمایت حاصل رہی اور دراصل وہ ریذیڈنسی ہی کے آوردہ تھے۔شرف الدولہ کے متوسل سرورؔ ان کی اس کیفیت کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں:

''نواب شرف الدولہ بہادر پیش دست ہو کے محل اعتبار بادشاہی ہوئے۔پھر تو نیابت یہ چمکی کہ کسی نے ایسی کم کی۔سرکاریں میں ربط بڑھا۔سر رشتۂ اتحاد از حد زیادہ مستحکم ہوا...... بادشاہ کے دل میں گھر ہوا۔ریذیڈنٹ سے سینہ سپر ہوا۔''[۳]

لیکن یہ نتیجہ بھی برآمد ہوتا ہے کہ امور مکمل ملکی و مالی سے اگر وزیر اعظم امجد علی خاں بالکل بے نیاز، دست کش اور یکسو ہوتے تو کشاکش درمیاں کیوں ہوتی!

---

بہرکیف ۲۴؍جولائی ۱۸۴۰ء سے ۱۷؍مئی ۱۸۴۲ء محمد علی شاہ کے وقت رحلت تک یہ صورت حال جاری رہی۔ لیکن خود تخت نشین ہونے پر بھی امجد علی شاہ نے شرف الدّولہ کو موقع دیا۔ علیحدگی کے اسباب سے بحث اپنے محل پر ہوگی۔

❑❑




سلطان العلماء سید محمد رضوان مآبؒ

(۳)

# تخت نشینی و نظم و نسق میں حکومت شرعیہ کا رنگ

## تخت نشینی

جب محمد علی شاہ نے ۴؍ربیع الثانی ۱۲۵۸ء مطابق، ۱۷؍مئی ۱۸۴۲ء کو بوقت شب رحلت کی تو ان کے ولی عہد امجد علی تخت نشین سلطنت ہوئے۔ تخت نشینی کی تاریخ کے بارے میں مورخین میں قدرے اختلاف ہے۔ ۴؍ربیع الثانی ڈاکٹر صفی احمد کی تحقیق کے مطابق ہے۔[۱] جو انہوں نے اپنے تحقیقی مقالے میں درج کی ہے لیکن رجب علی سرور ۵؍ربیع الثانی بتاتے ہیں۔[۲] اسی تاریخ کو وقف حسین آباد اپنے مخیر بانی کے دیسے کی مجلس بھی کرتا ہے۔ محمد کاظم نے اپنی سوانح عمری میں بھی یہی تاریخ لکھی ہے۔[۳]

امجد علی خاں نے لقب شاہی جو اختیار کیا وہ یہ ہے ''ابوالمظفر، مصلح الدین، ثریا جاہ، سپہر شکوہ سلطان عادل، خاقان زماں محمد امجد علی بادشاہ۔'' سکہ یوں نظم ہوا۔

در جہاں زد سکۂ شاہی بتائید الٰہ[۴]

ظل حق، امجد علی، شاہ زماں، عالم پناہ

اودھ کے بادشاہوں کے یہاں یہ بھی بڑی قابل لحاظ بات پائی جاتی ہے کہ ان کے

---

[۱] ٹوکنگس آف اودھ، ص، ۳۵

[۲] فسانۂ عبرت، ص ۵۵

[۳] سوانح عمری، ص ۲۸

[۴] نجم الغنی خاں، تاریخ اودھ، ج، ۵، ص، ۲۱

سکے کے ساتھ کتب خانہ کی مہر تبدیل ہوتی تھی اور اس کی عبارت ہمیشہ منظوم ہوتی تھی۔ امجد علی شاہ کی مہر پر یہ شعر کندہ کیا گیا۔

ناسخ ہر مہر شد، چوں شد مزین بر کتاب[۱]
خاتم امجد علی، شاہ زماں، عالی جناب

تخت نشینی کی تاریخ بہت سے شعراء نے تلاش کی۔ نصیرؔ نے ایک قطعہ کہا ہے جس کے ہر مصرعے یا بیشتر مصرعوں سے سال برآمد ہوتا ہے۔ لیکن آپ یہاں چند دوسرے شاعروں کے مصرعہ ہائے تاریخ ملاحظہ فرمایئے۔

الفتؔ : تاج واورنگ مبارک بہ شاہ
فانیؔ : زہے جشن جلوس بادشاہت
واثقؔ : سریر سلطنت را زیب دادی[۲]

## ولی عہد کی نامزدگی

ذکر ہو چکا ہے کہ بادشاہ کے بڑے بیٹے شہزادہ مصطفیٰ علی حیدر بہرام صولت تھے۔ یہ ایک خواص خاص کے بطن سے تھے۔ غیر کفو ہونے کے نقص کے علاوہ جیسا کہ تفصیل آگے آتی ہے وہ اپنے والد کی رضا جوئی بھی نہ کر سکے تھے۔ اس لئے سب سے پہلا کام بادشاہ نے یہی کیا کہ مصطفیٰ علی حیدر کے اپنے فرزند نہ ہونے کا اعلان کر کے دوسرے فرزند مرزا واجد علی خاں کو اپنا ولی عہد نامزد کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ بھٹناگر بتاتے ہیں:

''۱۸۵۲ء میں مصطفیٰ علی کے ایک ملازم گنگا دھر نے لکھنؤ کے چند بااثر لوگوں کے دستخط سے گورنر جنرل کی خدمت میں ایک یادداشت پیش کی۔ جس میں اپنے آقا کے تخت اودھ کے دعوے کو پیش کیا گیا تھا۔ لیکن گورنر جنرل نے اس بارے میں کچھ بھی سننے سے

---

[۱] یہ مہر میں نے پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب مرحوم کے ذخیرۂ کتب کی بعض کتابوں پر دیکھی ہے۔
[۲] تاریخ اودھ، ج، ۵، ص ۲۱

انکار کر دیا۔ جب واجد علی شاہ کو یہ واقعہ معلوم ہوا تو انھوں نے برطانوی حکومت کا شکریہ ادا کیا اور اصل یادداشت مانگی۔ شاید اس لئے کہ مستقبل میں اس طرح کے ادعائے باطل سے ہوشیار رہیں۔

ریذیڈنٹ نے مصطفی علی کا اصل میمورنڈم بادشاہ کو حوالہ کر دیئے جانے کی سفارش کی اور اسی کے ساتھ اس بدقسمت شہزادے کی مختصر کیفیت بھی روانہ کی اس نے لکھا کہ محمد علی شاہ کی وفات کے وقت تک مصطفیٰ علی (حیدر) امجد علی شاہ کے ولد اکبر سمجھے جاتے تھے۔ لیکن امجد علی شاہ کے تخت نشین اودھ ہونے کے دس دن بعد برٹش ریذیڈنٹ نے گورنر جنرل کو رپورٹ کی کہ جہاں پناہ نے اسے بتایا ہے کہ مصطفی علی ان کے لڑکے نہیں ہیں۔ اور ان کی خواہش ہے کہ ان کے دوسرے فرزند واجد علی کو ولی عہد قرار دیا جائے۔ گورنر جنرل نے جواب میں ریذیڈنٹ کو بتایا کہ وہ بادشاہ سے اس مطلب کا نوشتہ حاصل کریں جس کے نتیجے میں ۶ رجون ۱۸۴۲ء کو بادشاہ کی تحریر جس میں اظہار کیا گیا تھا کہ (مصطفی علی حیدر) نہ ان کا لڑکا ہے اور نہ کسی طرح ان کے خاندان سے تعلق رکھتا ہے اور اس کی ماں ایک خادمہ یا خواص تھی، جس کا بچے کی ولادت کے وقت تک ان سے (امجد علی شاہ) کوئی واسطہ نہ تھا۔ یہ دو تین سال بعد کی بات ہے کہ وہ محل میں آئی۔

جنرل لو نے اس تحریر کے بعد گورنمنٹ کو مطلع کیا کہ وہ اس تحریر کو درست سمجھتے ہیں اور اس کی تصدیق ریذیڈنسی کے ایک نائب منشی کے بیان سے جو اس نے محمد علی شاہ کی علالت کے دوران دیا تھا ہوتی ہے۔ ۱۱ رجون ۱۸۴۲ء کو ریذیڈنٹ کو جواب میں بتایا گیا کہ ان حالات میں گورنر جنرل کو واجد علی شاہ کے ولی عہد تسلیم کئے جانے میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔

اسی ماہ کی ۲۱ رتاریخ کو ریذیڈنٹ نے بادشاہ کے دستخط و مہر سے مزین ایک خط اور ایک دوسرا بیان روانہ کیا، جس میں بھی یہی وضاحت تھی کہ مصطفی علی حیدر بادشاہ کے فرزند نہیں ہیں۔ یہ تحریریں پہلے بھیجے گئے ایک بیان کا بدل تھیں۔ گورنمنٹ کے سکریٹری نے

ان کاغذات کی رسید بھیجی تبھی سے مصطفی علی حیدر شدید نگرانی میں رکھے جانے لگے۔'' [۱]
(ترجمہ)

اس طرح یہ سمجھنا چاہیے کہ ۲۹؍جون ۱۸۴۲ء سے مرزا محمد واجد علی خان بہادر اپنے نئے خطاب ''ابوالمنصور سکندر جاہ، سلیماں حشم، صاحب عالم ولی عہد مرزا محمد واجد علی بہادر [۲] کے ساتھ ولی عہد سلطنت قرار پائے۔''

## محکمۂ مرافعہ شرعیہ

اودھ کی سلطنت کا نظم ونسق محمّد علی شاہ مرحوم کے عہد تک اسی نہج پر قائم رہا جو دلّی کی مرکزی سرکار کا تھا۔ تبدیلیاں ہوئیں تو جزوی اور طریقۂ کار میں معمولی قسم کی۔ امجد علی شاہ کے عہد میں نظم ونسق ایک بنیادی اور دور رس تبدیلی سے روشناس ہوا اور یہ محض ایک نئے محکمے کا قیام نہ تھا بلکہ حکومت کو شرعی اساس مہیّا کرنے کی ایک باضابطہ اور محکم کوشش تھی، جس کا نفاذ نظام عدلیہ میں بخوبی محسوس کیا گیا۔ دوسرے شعبوں میں اس کے اثرات کو محسوس نہ کیا گیا ہو ایسا نہیں ہے لیکن اسے بادشاہ کے ذاتی رجحان یا مذہب پسندی وغیرہ سے تعبیر کیا گیا۔ اس سلسلہ میں جو پہلا قدم اٹھایا گیا وہ ایک محکمے کا قیام تھا۔ ڈاکٹر بھٹنا گر اس کا نام محکمہ مرافعہ [۳] بتاتے ہیں۔ کمال الدّین حیدر کہتے ہیں:

''اور مقدمات معدلت رسانی بمقتضائے حسن عقیدت وخلوص نیت سلطان العلما و سید العلماء دونوں مجتہدین پر محمول رکھتے تھے، مرافعہ شرعیہ مقرر فرمایا'' [۴]

لیکن یہ دونوں بیانات ناقص و نا تمام ہیں۔ پورا نام محکمہ مرافعہ شرعیہ تھا جیسا کہ مولوی

---

[۱] اودھ انڈر واجد علی شاہ، ص ۲۔۹۱
[۲] پروفیسر مسعود حسن رضوی نذر مقبول مضمون سلطان عالم واجد علی شاہ، ص ۴
[۳] اودھ انڈر واجد علی شاہ، ص ۱۷
[۴] سوانحات سلاطین اودھ، ج ۱، ص ۳۷۱

سید علی اکبر کا بیان ہے اور وہ کافی وسعت کے ساتھ صورت حال کا احاطہ کرتا ہے:

''ہر چند (سلطان العلماء مولوی سید محمدؒ) سلاطین اودھ کے زمانے میں تبلیغ دین کرتے تھے اور احکام شرع کی اشاعت کرتے تھے۔ لیکن جنت مکان (امجد علی) شاہ کے عہد میں یہ ترقی کی بلند منازل تک پہنچ گئی تھی، محکمہ مرافعہ شرعیہ کا منصب آپ سے وابستہ ہوگیا اور اس محکمے کے لئے مفتی، اہل قلم، دفتر کے اہل کار اور دوسرے ملازم مثلاً عصا بردار و خاص بردار وغیرہ مقرر کئے گئے۔ مقدمات کی اپیلیں اور استغاثے اس محکمہ میں فیصل ہوتے تھے۔ اور جناب کی ہی تجویز سے دیوانی اور فوجداری کی عدالت مولوی سید باقر صاحب مغفور سے متعلق ہوئی اور آپ کو منصف الدولہ شریف الملک کا خطاب دیا گیا اور اس کے بعد نشہ بندی کے لئے محکمۂ آب کاری بھی آپ کو سونپا گیا اور جناب موصوف نے بڑی تاکید اور شدت کے ساتھ حکم قطعی صادر فرمایا کہ تمام شراب خانے مملکت محروسہ میں توڑ دیئے جائیں اور سب نشہ آور چیزوں مثلاً گانجہ بھانگ وغیرہ کی فروخت روک دی جائے۔ دوسرا محکمہ صدر الشریعہ سید محمد ہادی صاحب مغفور کو سونپا گیا اور عمدۃ العلماء کا خطاب ملا۔ آپ نماز جماعت کی اقامت اور علوم و احکام دین کی تعلیم فرماتے تھے۔ محکمۂ صدر الصدوری اور تھانوں سے متعلق معاملات کا تصفیہ سید مرتضیٰ صاحب کے حوالے ہوا اور خلاصۃ العلماء کے خطاب سے اظہار عنایت ہوا۔ مدرسۂ شاہی کی تجویز ہوئی اور وہ جناب سیّد تقی صاحب کے سپرد ہوا۔ آپ خطاب ممتاز العلماء فخر المدرسین سے ممتاز ہوئے اور مدرسین صاحبان علم و کمال مناسب تنخواہ پر مقرر ہوئے۔ اور کافی رقم خیرات و زکوٰۃ وغیرہ کی سرکار شاہی سے جناب قبلہ و کعبہ (سلطان العلماء) کی خدمت میں پہنچتی تھی اور غریب و محتاج مومنوں میں تقسیم کی جاتی تھی بالآخر اس رقم کی تقسیم کے لئے ایک محکمۂ قائم ہوا اور جناب سید علی نقی صاحب کو سونپا گیا اور خطاب زبدۃ العلماء معین المومنین عنایت ہوا''[1]۔ (ترجمہ)

---

[1] حیات رضواں مآب، ص ۳۱

یہ صورت حال وضاحت کرتی ہے کہ یہ محض مجتہدین سے عقیدت مندی یا سادات مومنین کی دستگیری کی حد تک بات نہ تھی۔ ایسے حدود تک کہ ریذیڈنسی سے مزاحمت یا تصادم کی نوبت نہ آئے۔ امجد علی شاہ منہاج کتاب وسنت تک نظام حکومت کو لے جانے کے متمنی تھے اسی لئے مالیہ فوج کمپنی سے معاملات بادشاہ کے تحت رہے۔[۱]

جنرل اوٹرم کی رپورٹ کی بنیاد پر ڈاکٹر صفدر حسین نے اودھ کے عدالتی نظام کی جو تفصیل تحریر کی ہے۔ اس میں عدالت العالیہ مخصوصہ جو مجتہد العصر کے ماتحت تھی اور عدالت العالیہ سب سے اعلیٰ عدالت جو مجتہد العصر کے صاحب زادے منصف الدولہ کے ماتحت تھی کے علاوہ عدالت کوتوالی، عدالت درخواست، عدالت دیوانی، عدالت دیوانی دوم، عدالت خفیفہ، عدالت مخصوصہ معتمد تھیں۔ تین عدالتیں ایسی تھیں جن میں وہ مقدمات طے ہوتے تھے، جس میں کوئی فریق کمپنی کا ملازم ہوتا تھا اور بعض ادنیٰ درجے کی عدالتیں جن کا ذکر نہیں کیا گیا۔[۲]

## انتظام سلطنت میں بادشاہ کا انہاک

امور سلطنت سے امجد علی شاہ کی دلچسپی کو عام طور سے تسلیم کیا گیا ہے۔ نجم الغنی خاں کہتے ہیں:

”دربار شاہی بعد طلوع نیر اعظم ہر روز ہوتا تھا کاغذ حسابی و عرائض مستغیثان معائنہ ہوتیں احکام روزانہ اجرا ہوتے مجرائیان دربار ہر روز حاضر ہوتے۔“[۳]

خان صاحب پھر کہتے ہیں:

”ان کے وقت میں انتظام کا یہ حال تھا کہ صبح سے دوپہر تک کاغذات ملکی و مالی اور

---

[۱] ہندوستان میں شیعیت کی تاریخ، ص ۴۳

[۲] لکھنؤ کی تہذیبی میراث، ص ۱۵۱

[۳] تاریخ اودھ، ج، ۵، ص ۳۳

دادخواہوں کی عرضیاں سنتے اور خود بھی ملاحظہ کر لیتے۔ سہ پہر کے وقت اور رات کو پرچہائے اخبار اور مستغیثوں کی عرضیاں جوالا پرشاد سے سنتے اوران پر حکم لکھواتے۔''[۱]

کمال الدّین حیدر بیان کرتے ہیں:

''اور شاہزادے وغیرہ جن کی تنخواہ ہزاروں تھی تخفیف کر کے چہارم سب کی کم کردی۔ ہر چند کہ عرض کی بقرون اجابت نہ ہوئی۔طریق دربار یہ تھا کہ صبح کو بادشاہ سوار ہوتے تھے ہوا کھانے کو، جب مراجعت کرتے تھے مجرائی حاضر ہوکر رخصت ہوتے تھے بعد ۹ بجے کے ۱۲ بجے تک صحبت کواغذ ملکی و مالی وغیرہ رہتی تھی۔اس کے بعد داخل محل سرا ہوتے تھے شام کو پھر بادشاہ سوار ہوتے تھے۔''[۲]

صفدر حسین سلیمٰن کا اقتباس نقل کرتے ہیں:

''کاغذات صبح وشام یعنی تین دن میں دو مرتبہ ملاحظہ ہوتے تھے اوران پر احکام صادر کئے جاتے تھے اس موقع پر تمام شعبوں کے افسران حاضر رہتے تھے۔''[۳]

نجم الغنی خاں نے اگر چہ جز رسی و کنجوسی ظاہر کرنے کے لئے مگر سرکاری واجبات کی وصولی پر امجد علی شاہ کی کڑی نظر کا ذکر اس طرح کیا ہے:

''نادر العصر میں لکھا ہے کہ بخل اس بادشاہ کا یادگار ہے اور افضل التواریخ میں بیان کیا ہے کہ مشہور ہے کہ یوم ایفائے قسطِ کے روز (کذا) بادشاہ وزیر سے حساب فہمی کرتے تھے اور جب تک زر قسط تمام وکمال ادا نہ ہوتا خاصہ تناول نہ کرتے تھے۔''[۴]

یہ ایک نمونہ ہوا بادشاہ کے بخل کا اب ایک دوسرا نمونہ ملاحظہ کیجئے۔ یہ رجب علی بیگ سرورؔ ہیں اس دور کے مسلم الثبوت ہجونگار، کسی عامل یا جاگیردار کا ذکر ہے جسے مولوی بنا کے

---

۱ تاریخ اودھ، ص ۳۶

۲ سوانحات، ج ۱، ص ۳۷۱

۳ لکھنؤ کی تہذیبی میراث، ص ۱۰۶

۴ تاریخ اودھ، ج ۵، ص ۳۶

پیش کرتے ہیں، فرماتے ہیں:

''اسی سرکار میں ایسے نائب خوش ہمت، با اوصاف ہوئے، کل کا ذکر ہے، چودہ چودہ لاکھ اختلاط میں معاف ہوئے آج گردشِ فلک نے اسی کچہری کی یہ نوبت پہنچائی سگ نہ نشیند بجائے گیپائی۔ دس بارہ ہزار روپئے کی باقی پر کھڑے کھڑے مولوی پر کوڑے پڑے۔''[1]

اب چودہ یا بقول کمال الدّین سولہ لاکھ کی اختلاط میں معافی کی یاد تازہ کر لیجئے اور یہ ملاحظہ فرما لیجئے کہ دوسرے دَور کے نہایت بے جا اور غیر مجاز اقدامات اس دور کے مقابلے میں کس طرح ممدوح و مثالی قرار دیئے جاتے ہیں۔ سرورؔ ہی نہیں کمال الدّین حیدر بھی یہی دھاندلی کرتے ہیں۔ معتمد الدولہ نواب آغا میر کے صاحبزادے امین الدّولہ آغا علی خاں کی شادی میں رسم شربت پلائی کا موقع ہے:

''نواب روشن الدولہ نے رسم شربت پلائی حسب دستور کی، جب نوبت شربت نواب (آغا میر) تک آئی تو، نواب نے اپنی جیب سے اشرفیاں نکالیں، نواب روشن الدولہ نے عرض کی، آج ہم شربت پلائی میں امتحانِ جودو ہمت وزیر اعظم کرتے ہیں۔ نواب نے فرمایا ہم نے سولہ لاکھ روپئے جو تمہاری نظامت میں باقی ہیں، اس شربت پلائی میں دیئے۔ نواب روشن الدولہ آداب بجالائے۔ جب بادشاہ نے از روئے پرچہ اخبار نواب سے پوچھا، عرض کی حضور! روشن الدولہ نے اسی پر قناعت کی۔ اگر کچھ تامل کرتے میں زر تحصیل دوسرے سال کا بھی دے دیتا۔ بس اب تاثیر وقت اس زمانے کی دیکھئے کہ جب وزیر اعظم نے عرض کی۔ اس قدر غلام نے حضور کی بدولت ۷ لاکھ کمائے ہیں، حاضر ہیں، فرمایا: اس میں سے ایک لاکھ اپنی تعمیر عمارت کو لے لو باقی داخل خزانہ کرو۔''[2]

یہ اعتراض امجد علی شاہ پر ہے کہ جب امین الدولہ مولوی امداد حسین خاں نے سات

---

[1] فسانۂ عبرت، ص، ۹۔۶۸

[2] سوانحات، ج ا، ص، ۲۵۹

لاکھ حاضر کئے تو انھیں صرف ایک لاکھ کیوں دیئے [1] کل کے کل سات لاکھ کیوں نہ بخش دیئے۔ یہ بھی اعتراض ہے اور یہ بھی اعتراض ہے کہ مالی حالت خراب تھی، تحصیل مطالبات کم تھی، خزانہ خالی تھا۔ وغیرہ وغیرہ قعر دریا میں جس طرح تختہ بندی کر کے دامن ترمکن، ہشیار باش کی جیسی بدعت امجد علی شاہ کے ساتھ ہوئی اس کی نظیر ڈھونڈھے نہیں ملتی۔ اس طرح کے بہت سے نمونے ہیں لیکن کہاں تک پیش کئے جائیں۔ اب وزراء و امراء کی مختصر کیفیتیں دیکھ لیں۔

## وزراء و امراء

وزراء کے نصب و عزل کو ہم کسی قدر تفصیل سے امین الدّولہ کے حالات کے ذیل میں دیکھیں گے لیکن ایک مختصر خاکہ یہاں پیش کرنا سلسلۂ کلام کے لئے ضروری ہے۔ اس عہد میں وزارت کے منصب پر جن لوگوں نے کام کیا، وہ ہیں:

۱۔ شرف الدّولہ نواب محمد ابراہیم خاں۔ یہ محمد علی شاہ کے زمانے میں ریذیڈنٹ کی تجویز پر وزیر اعظم (امجد علی خاں ولی عہد) کے ڈپٹی ۲۴/جولائی ۱۸۴۰ء [2] کو مقرر ہوئے تھے۔
امجد علی شاہ کی بادشاہت میں تین مہینے وزیر اعظم کے فرائض انجام دے کر ۹/رجب ۱۲۵۸ھ [3] مطابق ۱۷/اگست ۱۸۴۲ء کو ریذیڈنٹ کے اصرار آمیز ایما سے الگ کئے گئے۔

۲۔ امین الدولہ امداد حسین خاں، پہلی بار ۱۷/اگست ۱۸۴۲ء سے ۲/دسمبر ۱۸۴۳ء مطابق ۹/ذی قعدہ ۱۲۵۹ تک برسر منصب رہے۔

---

[1] وہی، ص ۸۔۷۷ ۳
[2] ٹوکنگس آف اودھ، ص ۳۳
[3] وہی، ص ۴۰، ۳۸

۳۔ منور الدولہ احمد علی خاں ۸ر دسمبر ۱۸۴۲ء مطابق ۱۵ ذیقعدہ ۱۲۵۹ھ سے ۱۱ر جولائی ۱۸۴۴ء مطابق ۲۴، جمادی الثانی، ۱۲۶۰ھ تک عہدہ وزارت پر رہے۔

۴۔ نواب امین الدولہ، ۱۱ر جولائی ۱۸۴۴ء سے امجد علی شاہ کے آخر عہد بلکہ واجد علی شاہ کے عہد میں بھی کچھ مدت تک وزیر اعظم رہے۔

## امراء

تخت نشینی کے بعد سب سے پہلا اعزاز امداد حسین خاں کو ملا ''خطاب امین الدولہ امداد حسین خاں بہادر ذوالفقار جنگ'' خلعت، ہاتھی، پالکی جھالردار شمشیر ولایتی سے سرفراز ہوئے۔ ان کے مقابل دوسرا خلعت میر عنایت علی کو ملا۔ اگرچہ ان سے صفائے باطن جیسا چاہیے نہ تھی مگر ماں کی خاطر سے جن کے عنایت علی کسی طرح بھائی ہوتے تھے خطاب معین الدولہ بہادر عنایت ہوا۔[۱] بادشاہ نے ایک مہینے کئی دن بعد اعظم الدولہ (عظیم اللہ خاں) اور داروغہ عاشق علی ان کے پیش دست کو داروغگی اہتمام دیوان عام سے موقوف کیا۔ رجب علی بیگ سرورؔ داروغہ عاشق علی خاں کی تاریخ برطرفی ۱۰ر جمادی الثانی[۲] ۱۲۵۸ھ بتاتے ہیں۔ عظیم اللہ خاں کا ذکر نہیں کرتے۔ ان لوگوں کے عوض اعتبار الدولہ عطا حسین خاں بڑے بھائی امین الدولہ کو خلعت دے کر مقرر فرمایا۔ اہتمام الدولہ حیدر حسین خاں کو ان کا پیش دست کیا۔

منشی عبداللطیف کو خطاب دبیر الدولہ و خدمت تقسیم خزانہ عامرہ، منشی جوالا پرشاد کو خطاب مدیر الدولہ دستخط عرض داشت وغیرہ سپرد کئے۔ رجب علی بیگ سرورؔ، منشی عبداللطیف کا پورا خطاب دبیر الدولہ، مدیر الملک اور منشی جوالا پرشاد کا پورا خطاب مدبر الدولہ

---

[۱] ٹوکنگس آف اودھ، ص ۴۵

[۲] فسانہ عبرت، ص ۵۸

دبیر الملک بتاتے ہیں۔[1]

امین الدّولہ کے وزیر مقرر ہونے کے بعد ان کے پیش دست ڈپٹی نواب اکبر علی خاں ہوئے اور عہدۂ دیوانی مشیر الدّولہ موید الملک مہاراج بالکرشن بہادر جسارت جنگ کو خلعت سے سرفراز کیا اور منشی الملوک راجہ رتن سنگھ کو موقوف کیا۔ دستور معظم (امین الدولہ) نے مرزا وصی علی خاں کو خدمت دیوان خانۂ وزارت دی۔ پھر محمد خلیل الدّین خاں کو بادشاہ سے عرض کر کے پانسو کا نوکر رکھوا دیا۔ بادشاہ نے پہلے داروغہ صدر امانت کیا اور اخبار ملکی ان کے بڑے بیٹے رشید الدّین خاں کو دی۔ میر حسن علی لندنی کو عہدۂ سفارت ریذیڈنٹ پر مامور کیا۔

نواب اکبر علی خاں ڈپٹی کے انتقال اور ان کے بیٹے اصغر علی خاں کی برطرفی کے بعد نواب نے سیّد قطب الدین حسین خاں کو ڈپٹی کیا ان کے ساتھ بھی وہی صورت پیش آئی (یعنی برطرفی) تو لاچار ہو کر معین الدولہ کو ڈپٹی کیا۔

منور الدولہ خلعت وزارت سے سرفراز ہوئے تو معین الدولہ ڈپٹی ہو کر کارفرما رہے۔ جب امین الدولہ پھر بحال ہوئے تو مدبر الدولہ کے سمجھانے سے (انھیں کے ساتھ) میر حامد علی خاں کو خلعت پیش دستی عنایت فرمایا، معین الدولہ کے بعد مَنّور الدّولہ نے اپنے داماد مرزا ابوتراب خاں کو ڈپٹی کیا تھا۔ امین الدّولہ کے ساتھ مرزا وصی علی خاں خدمت دستکات (کذا) واصلباقی عمالی پر مامور ہوئے۔ نواب نے شیخ احمد بخش کو داروغہ دیوان خانہ کیا اور انھوں نے اپنے داماد شیخ اکبر علی کو اپنا پیش دست کیا۔ ۲۶ رنومبر ۱۸۴۴ء کو میر حامد علی خاں بھی الگ کر دیئے گئے۔[2]

اور سعید الدولہ علی محمد خاں بہادر بیٹے میر بندہ علی خاں کو پیش دستی نواب ملی۔

عشرۂ محرم کے دوران جب خبر فتح لاہور آئی ریذیڈنٹ نے توپ کی سلامی کا حکم

---

[1] وہی، ص ۵۹

[2] ٹوکنگس آف اودھ، ص، ۴۶، حاشیہ، ۱۷

بھجوایا۔ یہ امر خلاف حکم شاہی تھا۔ ادھر سے عذر ہوا۔ نخوت کے ساتھ فتح کا نشہ دوآتشہ ہورہا تھا عذر کون سنتا۔ صاحب کلاں سفیر شاہی میر حسن علی لندنی کے بھی مخالف ہو گئے اور انھیں ہٹوا کے دم لیا۔ ان کی جگہ امین الدولہ نے اپنا استاد میر باقر علی کو مقرر کیا حفیظ الدّولہ خطاب ملا۔"[1]

اب ہمیں اس دور کے حسنات و خیرات کا مطالعہ کرنا ہے۔

❑❑

[1] بابقی بیانات کمال الدین حیدر سے ماخوذ ہیں دیکھیں جلد اوّل، ص ۸۱۔۳۵۹

(۴)

# تعمیری، علمی، دینی کارنامے اور ثقافتی کیفیت

## آہنی پل

پانچ سال کی مختصر مدت ہوتی ہی کیا ہے۔ پھر ایسے فرمانروا کے لئے جو انگریزوں کے کلّی انتداب میں ہو۔ پھر بھی امجد علی شاہ کے کارنامے ہمہ جہتی، دیرپا اور تاریخی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان میں سے ایک زبردست کام لکھنؤ کے راج گھاٹ کے قریب لوہے والے پل کی تکمیل ہے۔ یہ لندن کے ایک پل کے نمونے پر ہے۔ اس کی تیاری نواب سعادت علی خاں بہادر کی فرمائش سے ہوئی تھی اور غازی الدین حیدر شاہ کے عہد میں لکھنؤ پہنچ گیا تھا مگر نصب حضرت جنت مکاں کے عہد میں ہوا۔ تنصیب پر لاگت تین لاکھ کی آئی۔ اتنے تعمیری کام میں بھی کمال الدین حیدر اعتراض کی بنیاد تلاش کرنے میں نہیں چوکے۔ بیچارے کیا کریں شاہانِ اودھ پر اعتراض کے بغیر لقمہ ہی نہیں توڑ سکتے۔ فرماتے ہیں:

> ''جسر آہنی کی تکمیل عہدِ دولت میں ہوئی، اس کی طلب لندن سے جنت آرام گاہ، (سعادت علی خاں) نے کی تھی۔ ہر سلطنت میں اس پر ناواقفیت سے بربادی لکھا روپے کی ہوئی۔ آخر کپتان فریزر صاحب نے اتمام کو پہونچایا۔''[1]

چلئے! کپتان فریزر صاحب کے سر سہرا باندھ کے سہی، میرزا یر صاحب نے پل تو بنوا دیا۔ اب اس کے بارے میں مولانا شررؔ کا بیان بھی دیکھ لیں:

---

[1] سوانحات، ج ۱، ص ۳۷۳

''اس پل کی تعمیر کا واقعہ یہ ہے کہ اس کے اجزا اور پرزے غازی الدین حیدر نے انگلستان سے منگوائے تھے۔ مگر وہ پرزے جب تک پہونچیں، بادشاہ رہ گرائے عالم جاوداں ہو چکے تھے۔ نصیر الدین حیدر کے عہد میں جب وہ پرزے ولایت سے آئے تو انھوں نے اپنے دربار کے انجینئر مسٹر سینکلر کو ان پرزوں کے جوڑنے اور پل کو بنا کے کھڑا کر دینے کا ٹھیکہ دیا اور حکم دیا کہ وہ پرزے ریذیڈنسی کے سامنے دریا کے کنارے ڈال دیئے جائیں۔ جس مقام پر پل کے پرزے ڈالے گئے تھے، اس کا پتہ دینے کے لئے وہیں ایک گھاٹ اور شوالہ قائم ہے۔ مسٹر سینکلر نے دریا کے اندر ستون قائم کرنے کے لئے گہرے کنویں کھدوائے اور ستونوں کی جڑائی بھی کرلائے۔ مگر اس کے بعد ان سے کچھ کرتے دھرتے نہ بنی اور پل کی تکمیل میں ناکامی ہوئی محمد علی شاہ کے زمانے میں یہ پل ناتمام پڑا رہا مگر امجد علی شاہ نے اپنے عہد میں اس کی جانب توجہ کی اور پل بن کے تیار ہو گیا۔''[۱]

دیوان خانۂ وزارت کے منشی سید مظفر علی اسیرؔ نے تاریخ نظم کی ؎

آن پادشاہ عادل کز حکم محکم او　　گردید آہنی پل بر گومتی نمودار
فرمود حکم سلطاں، تاریخ نظم کردم　　'چوں حکم شاہ محکم، چو عدل شاہ ہموار'[۲]

## حضرت گنج

آج کا سب سے زیادہ پر رونق بازار اور پُر ہجوم علاقہ حضرت گنج بھی اسی عہد کی یادگار ہے۔ اس گنج میں انواع و اقسام کے اسباب و اجناس کی مناسب و ارزاں نرخ پر فراہمی کا اہتمام کیا گیا تھا۔ تاجروں اور خریداروں کے ساتھ خاص مراعات ملحوظ تھیں جس سے بہت مختصر مدت میں یہ بازار رونق پا گیا۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ بادشاہ دار بقا کی جانب اس

---

۱ گزشتہ لکھنؤ، ص ۹۶

۲ تاریخ اودھ، ج ۵، ص ۳۰

قدر متوجہ ہیں کہ دار دنیا میں تعمیرات کی فکر ہی نہیں، پھر بھی سلطان عنایت کے نام سے ایک محل تعمیر کرایا جس کے قریب حضرت گنج بسایا گیا تھا۔ سید امیر علی خاں، سلطان عنایت کے ساتھ وغیرہ کی لفظ استعمال کرتے ہیں مگر تصریح نہیں کرتے۔

کسی عزاخانے کی تعمیر امجد علی شاہ کے ہاتھ سے ہونے کی صراحت نظر قاصر سے نہیں گزری۔ لیکن 'فریڈم اسٹرگل اِن یوپی' کے فاضل مولفین موتی محل کے رہنے پر بندہ علی خاں کے سکان کے پاس امجد علی شاہ کے امام باڑے کا ذکر کرتے ہیں۔[1]

ہوسکتا ہے کہ یہ امام باڑہ ان کا تعمیر کردہ ہو یا کسی پرانی عمارت یا اس کے کسی خاص حصّے کو اس عہد میں امام باڑہ میں تبدیل کیا گیا ہو۔

لکھنؤ کے قلب میں امین آباد کا بازار اگرچہ اس دور کے دیندار وزیر اعظم امین الدّولہ کی ذاتی جائداد کی طرح بسایا گیا لیکن اس کی تعمیر میں ایک لاکھ کا شاہی عطیہ بھی شامل ہے۔ یہ عطیہ نہ بھی ہوتا تو بھی شمار اسی عہد کے تعمیرات میں ہوگا۔ اس کا ذکر امین الدولہ کے سوانح میں ہوگا۔

## لکھنؤ کانپور روڈ

لکھنؤ سے کانپور کے گنگا کے پل تک سڑک کی تعمیر بھی اسی عہد فلاح مہد کی تعمیر ہے۔ اس سڑک کی تعمیر پر تین لاکھ کی لاگت آئی تھی۔

## سرحدی حفاظتی دستہ

رہزنوں اور بدمعاشوں کی حفاظت کے لئے جو کمپنی کے مقبوضہ علاقے سے آتے تھے امجد علی شاہ نے ۱۸۴۵ء کے آغاز میں سرحدی پولیس دستہ قائم کیا تھا۔ شروع میں اس کا

---

[1] فریڈم اسٹرگل ان یوپی، ج، ۲، ص، ۹۵

سالانہ خرچ ستر ہزار نو سو باسٹھ روپئے تھا۔[۱] امجد علی شاہ کے بعد واجد علی شاہ نے اس میں اضافہ کر دیا تھا۔ پر پیورنانند ورما نقل ہیں:

''بادشاہ امجد علی شاہ نے ۱۸۴۵ء میں اپنے دیس کے سرحد پر کمپنی سرکار (کی سرحد) کی طرف سے آنے والے چور ڈاکوؤں سے حفاظت کے لئے سرحدی پولیس تعینات کی تھی اس میں پانچ سو جوان تھے کپتان آر۔ ایس۔ کے۔ افسر اعلیٰ تھے وہ خود لکھتے ہیں: اودھ کی سڑکیں جنوری ۱۸۴۹ء میں میرے چارج لینے کے وقت سے اب بہت زیادہ محفوظ ہیں۔ سرحدی پولیس کا عملہ پہلے ۵۰۰ سپاہیوں اور ۱۵۰ سواروں کا تھا واجد علی شاہ نے اس کی تعداد ۷۵۰ سپاہی اور ۱۰۰ سوار کر دی۔''[۲]

اس دور میں مسافر خانوں کی ترمیم و تیاری پر بھی کافی توجہ مبذول کی گئی تا کہ مسافروں کی حفاظت و آسائش کا انتظام ساتھ ساتھ ہو سکے۔

## دینی خدمات

آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ محکمۂ شرعیہ کے دائرہ کار میں آب کاری کا شعبہ آتے ہی مکمل نشہ بندی کا حکم صادر ہو چکا تھا، بس ایک دوکان شراب کی رہ گئی تھی جس سے طبّی صداقت نامے کے بعد شراب دی جاتی تھی۔ یہ محض کاغذی حکم نہ تھا، معتبر عصری شہادت ہے کہ حکم کا نفاذ شدت اور سختی کے ساتھ ہوا۔ حکیم مرزا محمد کاظم بتاتے ہیں کہ:

''شراب خانے خراب اور منہدم کرا دیئے گئے، بھنگ کی دوکان تاراج، چرس کی چلمیں پامال اور تاڑ کے پیڑ قطع و مستاحل کرا دیئے گئے۔''[۳] (ترجمہ)

یہ حکم بلا شبہ مذہب کے زیر اثر تھا لیکن ہندوستانی مزاج کے اعتبار سے اسے بلا تردّد رفاہِ

---

[۱] ٹوکنگنس آف اودھ، ص، ۱۸۶

[۲] واجد علی شاہ اور اودھ راج کا پتن، ص، ۱۹۱

[۳] سوانح عمری، ص ۳۰

عامہ کے کاموں میں شمار کیا جانا چاہیئے۔

ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ خزانۂ شاہی سے زکوٰۃ ہر سال نکالی جاتی تھی۔ یہ رقم تین لاکھ روپئے سالانہ کی تھی۔ اس کے علاوہ دوسرے طریقوں سے امور خیر میں مصارف ہوتے تھے۔ اسی عہد میں سلطان العلماء کی تلقین و موعظت سے بہت سی زنان بازاری تائب ہو کے اور عقد کر کے گھریلو زندگی بسر کرنے لگیں۔

سیّدالعلماء مولوی سید حسین علیین مکان کے اثر اور بادشاہ جنت مکاں کی دینداری کی وجہ سے جو خدمت عتبات عالیات کی ہوئی اسے صاحب ورثۃ الانبیاء نے ظل ممدود مصنفہ مفتی میر عباسؒ کے حوالہ سے تحریر کیا ہے:

> ''ڈیڑھ لاکھ روپیہ کوشش کر کے شاہ اودھ سے حاصل کیا اور عراق وعرب میں نہر آصفی کی تعمیر[1] کے لئے آقا شیخ محمد حسن صاحب جواہر الکلام کی خدمت میں بھیجا۔ پندرہ ہزار تعمیر روضہ حضرت مسلم و ہانی ۱۲۶۳ھ میں دونوں قبوں اور نہر کی تعمیر سے فراغت ہوئی۔ بیس ہزار روپیہ حضرت عباس کے حرم کے دروازوں کی نقرہ کاری اور ایوان کی طلا کاری کے لئے آقا سید ابراہیم مصنف ضوابط الاصول کو بھیجا اور انھیں بزرگوار کو نہر حسینی کی تعمیر کے لئے بھیجا۔''[2] (ملخص ترجمہ)

یہ امور مفتی صاحب نے سید العلماء مولوی سید حسین علیین مکان کے خدمات میں ذکر کئے ہیں اس لئے بہت ممکن ہے کہ اس میں سے کوئی رقم عہد حضرت محمد علی شاہ میں دی گئی ہو۔ لیکن چونکہ سلسلۂ تعمیر ۱۲۶۲ھ تک چلا، جو امجد علی شاہ کا آخری عہد ہے اس لئے ان کی شرکت بہر حال رہی ہے۔ مولانا آغا مہدی صاحب اپنے سفرنامۂ عراق میں سید العلماء کے ایک مکتوب سے اقتباس دیتے ہیں:

---

[1] نہر آصفی نواب آصف الدّولہ نے کھدوائی تھی اس لئے تعمیر کی لفظ مطابق حال نہیں معلوم ہوتی مرمّت یا توسیع کے کام کو تعمیر سے تعبیر کیا گیا ہے۔

[2] ورثۃ الانبیاء، بحوالہ ''ظل ممدود'' از مفتی محمد عباس شوستری، ص ۱۷

''مبلغ پندرہ ہزار روپیہ سکہ بادشاہ جم جاہ تعمیر روضۂ امامین عسکرین علیہما السلام کے لئے منظور ہوا ہے اور اس رقم کی روانگی کا حکم بھی ہو چکا ہے۔ امید ہے کہ رسید اور جواب سے بہ عجلت مطلع کریں گے اور مبلغ پندرہ ہزار کی رسید، جس میں دس ہزار کی رقم تعمیر روضۂ حر کے لئے تھی ابھی تک نہیں آئی جلد روانہ فرمائیں۔''[۱] (ترجمہ)

## علمی کارنامے

عہد امجدی کا سب سے اہم علمی کارنامہ مدرسہ سلطانیہ کا قیام ہے جو وقف حسین آباد کی بدولت آج بھی خیر جاری کی صورت میں ان کی بقائے نام کا باعث بھی ہے اور ترویج روح کا ذریعہ بھی۔ ہندوستان میں اس درسگاہ کو مذہب امامیہ کی سب سے اہم درسگاہ کا منصب بلند میسر ہے۔ جیسا کہ پیش گفتار میں عرض کیا گیا، زیر نظر اوراق اسی مدرسے کے تذکرہ میں قلم بند کئے گئے ایک سلسلہ مضامین کے ایک مضمون کی بدلی ہوئی شکل ہیں۔ حیات و حالات نے رفاقت کی تو سب مضامین مجموعی شکل میں پیش کش اربابِ نظر ہوں گے۔

## رصد خانہ

رصد خانۂ اودھ دراصل عہد نصیر الدّین حیدر شاہ کے تاسیسات میں ہے۔ عہد امجدی میں اس کا ذکر بہت کم صاحبوں نے کیا ہے۔ مگر کمال الدین حیدر اس کی تکمیل اسی عہد برکت وسعادت میں بتاتے ہیں:

''دوسرے امر عمدہ یہ ہوا کہ تکمیل رصد خانہ سلطانی ہوئی۔ دس برس میں کرنل و لکاکس صاحب مہتمم نے کاہش جان سے کتب مشاہداتِ کواکب حسب سر رشتہ تیار کئے۔ چاہتے تھے الہ آباد میں چھپ کر مشہور ہر ولایت میں جا کر ہوں۔ سات ہزار روپیہ

[۱] ماہ نامہ الواعظ، لکھنؤ اکتوبر ۱۹۵۴ء، ص ۲۱

بھی خزانہ شاہی سے ان کے طبع کو ملا تھا اس عرصے میں صاحب نے انتقال کیا۔ کرنل رچمنڈ صاحب ریذیڈنٹ نے اس نیک و بدصرف سالہا سال کا خیال نہ کیا میجر برڈ صاحب کو صاحب سے سوء مزاجی ہوگئی تھی حضرت سلطان عالم کے عہد دولت مہد میں پایۂ تخفیف میں آ گیا۔ عملہ برطرف ہوگیا۔''[۱]

کمال الدین حیدر کی کتاب میں اتنا اشارہ معمولی بات نہیں کہ وہ ریذیڈنٹ تھے جنھوں نے صرف سالہا سال کا خیال نہ کیا ورنہ واجد علی شاہ کے عہد دولت میں پایۂ تخفیف میں آنے کی وجہ سے تخفیف کے ذمّہ دار بھی وہی ٹھہرائے جاتے۔

اس مقام پر مولانا مرتضیٰ حسین فاضل کا یہ تبصرہ دیکھ لینا مناسب ہوگا:

''اب تک جو چیزیں قائم ہوچکی تھیں ان کو فروغ دیا گیا۔ رصد خانہ چھ سات لاکھ روپئے کے خرچ سے مکمل ہوا اور کچھ کتابیں بھی چھپیں جس میں سائنس کی کچھ کتابوں کے ترجمے کمال الدین حیدر نے کئے۔ ایک جنتری شائع ہوئی جسے عرصہ ہوا میں نے کتب خانۂ مدرسۃ الواعظین (لکھنؤ) میں دیکھا تھا۔ اس میں ملک اودھ کا جغرافیہ اور اسی سے متعلق کچھ چیزیں ہیں۔ اس کے علاوہ دوسرے فنون کی کتابیں طبع ہوئیں۔ شاہی پریس نے بہت سی کتابیں مفت شائع کیں اس کے علاوہ رصد خانہ مقناطیسی قائم ہوا۔ بادشاہ اور جناب سلطان العلماء رصد خانے جاتے۔ بادشاہ عملے کو خلعت اور انعام دیتے تھے۔ چھ ہزار روپئے اشاعت کے لئے عطا کئے، رصد خانے سے زوال شمسی کی توپ چلتی تھی۔ بابو رسک موہن بنگالی نے ایک گھڑی بھی بنائی تھی۔''[۲]

واقعہ ہے کہ اس دور میں تصنیف وتالیف کا بڑا اہتمام رہا۔ بلکہ امجد علی شاہ اپنی ولی عہدی کے دور سے ہی اس خصوص میں بہت دلچسپی لے رہے تھے۔ اسی دور کا واقعہ ہے کہ مولانا سید علی (۱۲۵۹۔۱۲۰۰) خلف غفراں مآب کی ناتمام تفسیر توضیح المجید فی تنقیح کلام اللہ الحمید

---

[۱] سوانحات، ج ۱، ص، ۲۷۳

[۲] ہفت روزہ سرفراز لکھنؤ مورخہ ۱۷ / مارچ، ۱۹۵۱ء

کی تکمیل و اشاعت ہوئی۔ اس تفسیر کی یہ خصوصیت ہے کہ زبر و بینہ کے حساب سے مدح اہلبیتؑ میں ہم عدد فقروں سے تفسیر کی گئی ہے۔ اس کتاب کی طرف ولی عہد کو متوجہ کرنے میں امداد حسین خاں (امین الدولہ) کا بھی ہاتھ تھا۔ قبولؔ نے قطعہ تاریخ میں اس کی طرف صاف اشارہ کیا ہے۔ یہاں ہم تین شعر نقل کر رہے ہیں۔

ولی عہد فیاض زماں ست      نمود اکثر کتب بر اہل دیں وقف
ز امداد حسین این امر خیرست      شد از تحریک او ایں طبع و ایں وقف
قبولؔ از بہر سال وقف بنویس      بود تفسیر بہر طالبیں وقف(۱)

اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ولی عہدی کے زمانے ہی سے امین الدولہ کو امجد علی شاہ کے مزاج میں کافی رسوخ ہو گیا تھا اور امجد علی شاہ کا اعتماد انھیں حاصل ہو گیا تھا۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی رقمطراز ہیں:

''علامہ محمد باقر مجلسی کی کتاب حق الیقین امجد علی شاہ کے حکم سے مطبع سلطانی میں چھپی تھی۔ یہ بڑے سائز کی ۸۶۰ صفحوں کی ضخیم کتاب ہے............مولوی سید عبداللہ کی کتاب خلاصۃ الاعمال امجد علی شاہ کے حکم سے شاہی مطبع میں چھپی۔ ملانواں کے باشندے محمد بخش کا ذکر سعادت علی خاں، غازی الدین حیدر اور محمد علی شاہ کے ذیل میں کیا جا چکا ہے۔ امجد علی شاہ کے عہد میں انھوں نے بعض احباب کی استدعا پر سات مشہور قصوں کو اردو میں لکھ کر ان کا مجموعہ سبعۂ سیارہ کے نام سے مرتب کیا............''[۱]

اسی مضمون میں ادیبؔ مرحوم نے ثابت نامہ نوطرز کے دیباچے سے حاجی مرزا امداد علی کا ایک اقتباس لیا ہے۔ اسے مناسب حال اختصار کے ساتھ یہاں پیش کیا جاتا ہے:

''اس عاصی کو تمام شوق اور ذوق کتب تفاسیر اور احادیث اور کتب تواریخ کے دیکھنے اور لکھنے اور ترجمہ کرنے کا رہا............اکثر کتابیں اردو میں تالیف کیں............

---

[۱] ہفت روزہ کاروان حیات بمبئی مولا علی نمبر، ص ۱۷

منہج الصادقین کہ ملا فتح اللہ مغفور نے فارسی میں لکھی تھی بندہ نے اس کو ہندی میں ترجمہ کیا ہے..................اور کتابیں مثل نسخہ چہاردہ نور اور مسیّب نامہ اور مختارِ نامہ وغیرہ کے بہت سی کتابیں ترجمہ کی ہیں بعض احباب نے فرمائش کی کہ ترجمہ ثابت نامہ کہ اس میں حال امیر ثابت پسر مختار کا ہے اور وہ فارسی میں ہے، تم اس کو زبان اردو میں تحریر کرو۔ در عہد امجد علی شاہ ۱۲۵۹ھ ترجمے سے ثابت نامہ کے فارغ ہوا اور نام اس کا میں نے ثابت نامہ نوطرز رکھا۔''[۱]

علامہ احمد علی محمد آبادی مدرس اعلیٰ مدرسہ سلطانیہ اس عہد کے اکابر علماء میں شمار ہوتے تھے۔ غفران مآب کے نہایت جلیل شاگرد اور سید العلماء کے نہایت معتمد رفیق تھے۔ آپ کے حالات میں فاضل نوگانوی مولوی محمد حسین کا بیان ہے:

''اور زمانہ شاہی میں بادشاہ نے حکم دیا کہ تمام علماء احوال معصومینؑ میں علیحدہ علیحدہ کتابیں لکھیں تو بحکم سلطان العلماء آپ نے جناب رسول خدا صلعم کے حال میں تحفۃ المعجزات لکھی۔''[۲]

اسی عہد کے علماء میں مولوی امداد علی کیرانوی تھے۔ آپ کے ذکر خیر میں اسی تذکرہ نگار کا کہنا ہے:

''تا اینکہ عہد حضرت امجد علی شاہ میں اقتدار علماء کا اور بڑھا تو ایک روز بادشاہ نے اپنے دربار میں اپنے ہاتھ سے شربت کا پیالہ عطا فرمایا۔ اسی زمانے میں آپ نے بحر المصائب کی دو جلدیں تالیف فرمائی تھیں۔''[۳]

سید العلماء مولانا سید حسینؒ کو تو اس دور میں ایک طرح ریاست علمیہ تھی، آپ نے قلمی خدمات کا وافر و شاندار ذخیرہ چھوڑا ہے۔ جس کتاب کی نسبت بالیقین معلوم ہے کہ وہ شاہی

---

[۱] نذر ذاکر مضمون شاہان اودھ کا علمی ذوق، ص ۴۔ ۱۹۳

[۲] نذر ذاکر، مضمون شاہان اودھ کا علمی ذوق، ص ۴۔ ۱۹۲

[۳] تذکرۂ بے بہا، ص ۱۴

فرمائش سے معرض تصنیف میں آئی وہ حدیقہ سلطانیہ ہے۔ سید مہدی صاحب تذکرۃ العلماء سے صاحب ورثۃ الانبیا نقل کرتے ہیں:

''کتاب حدیقہ سلطانیہ در مسائل ایمانیہ فارسی میں ہے۔ اور محمد امجد علی شاہ کی فرمائش سے تصنیف فرمایا ہے۔ پہلا مقصد مذہب حقہ کے اصول وعقائد یعنی توحید وعدل ونبوت وامامت وقیامت کے بیان میں ہے۔ دوسرا مقصد، عبادات واطاعت پر مشتمل فروعی احکام کے بارے میں ہے۔ اور وہ کتاب بے مثل اور نہایت مفید ہے۔ لیکن مقصد اول ہی بحث نبوت کے خاتمے تک کہ ایک ضخیم جلد ہے ابھی صاف ہو کے لکھا جاسکا تھا اور مبحث امامت شروع ہوا تھا کہ بادشاہ دین پناہ نے اسی سال ۱۲۶۳ھ میں رحلت کی۔ بہر حال جناب بعون ایزدی کتاب کی تکمیل کا ارادہ رکھتے ہیں۔''[۱] ترجمہ

## ادبی فضا

اسی علم وادب نواز عہد کا یہ یادگار واقعہ ہے کہ میر انیسؔ مرحوم مستقل قیام کے لئے فیض آباد سے لکھنؤ گئے اور لکھنؤ کی علمی وادبی زندگی کو ہی نہیں اردو نظم کو آفاقیت میسر ہونے کی رفتار کو پر پرواز ملے۔ مرزا دبیرؔ مرحوم تشریف فرما تھے ہی، اب مقابلہ ومسابقت کی صورت ہوئی تو ان کی حریفانہ مگر صالح کوششوں سے مرثیہ کو جو رنگ وآہنگ میسّر آیا اس نے لکھنؤ کے نام کو بھی اونچا کیا۔ انیسؔ اور دبیرؔ نے لکھنؤ کے نام کو اونچا کیا تو اہل لکھنؤ نے بھی قدر دانی کی حد کر دی۔ آپ ایک اقتباس ملاحظہ کریں:

''سب سے بڑی معرکتہ الآراء بات عہد حکومت (امجد علی شاہ) میں ہوئی کہ مرثیہ گوئی کے درخشاں آفتاب ببر علی انیسؔ انھیں کے زمانۂ شہر یاری میں سکونت فیض آباد ترک کر کے لکھنؤ تشریف لائے اور شیدیوں کے احاطے میں فروکش ہوئے۔ یہ محلہ آہنی

---

[۱] تذکرۂ بے بہا، ص ۱۲۔ الانبیاء، ج ۱، ص ۱۵۶

پل کے مغرب جانب جس مقام پر ریل کا پل اور قبرستان ہے واقع تھا اسی قبرستان میں میر خلیقؔ مرحوم پدر انیسؔ کا مرقد ہے مگر اب اس کی شناخت محال ہے۔ اس وقت میر صاحب موصوف کی عمر زاید سے زاید ۴۲ سال تھی اور مرثیہ گوئی میں کافی شہرت حاصل کر چکے تھے مگر جس مکان میں میر صاحب قیام فرما تھے ان کی شان دیکھتے ہوئے بہت پست تھا۔ چنانچہ دیانت الدولہ نے جو میر صاحب کے بڑے عقیدت مند تھے اسی محلے میں ایک امام باڑہ اور محل سرا تیار کرائی۔ امام باڑے میں پہلی مجلس میر صاحب سے پڑھوا کر نذر کر دیا۔ ۱۸۵۷ء میں امامباڑہ محل سرا دونوں منہدم کر دیئے گئے۔''[۱]

میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کو اپنے ممدوحین کی عظمت اور اپنے کمال فن کی بدولت جو مقبولیت، مرجعیت اور منزلت میسّر تھی اس کی بناء پر سلاطین دنیا کی طرف کم ہی نظر نیاز اٹھاتے تھے۔ مرزا دبیرؔ کا دربار اودھ سے تعلق تو عہد غازی الدّین حیدر شاہ سے نظر آنے لگتا ہے۔ شاہی مجالس میں پہلی خوانندگی انھیں کے دور میں ہوئی، ایک مدحیہ بند نظم کر لیا تھا اسے پڑھا بھی تھا۔ مگر اس بند کو مرثیہ میں شامل نہیں کیا۔ پھر عہد نصیر الدین حیدر میں ان کے محل ملکۂ زمانیہ کی سرکار سے مرزا صاحب کا باضابطہ تعلق ہوا۔ مرزا صاحب کا معراج نامہ اسی مناسبت سے ممتاز نامہ کہا جاتا ہے کہ ممتاز الدہر ملکۂ زمانیہ کی فرمائش پر نظم ہوا تھا۔ سبب تصنیف کے بیان میں وہاں بادشاہ اور ملکہ کی ستائش بیشک ہے۔ لیکن مرثیے میں کسی بادشاہ کو جگہ دی ہو اس کا پتہ نہیں چلتا۔ یہ امجد علی شاہ کی خوش اعمالی کی خصوصیت ہے کہ مرزا صاحب نے اپنے مشہور مرثیے ؎

طغرا نویس کن فیکون ذوالجلال ہے[۲]

میں امجد علی شاہ کی مدح کی ہے۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ بند جن میں مدح ہے پیش

---

[۱] ہفت روزہ وثیقہ دار لکھنؤ محرم نمبر، ۳؍ستمبر ۱۹۵۴ء۔ ص، ۱۵

[۲] دفتر ماتم، ج،۱

کئے جائیں آپ پہلے اس سلسلے میں مرزا صاحب کے سیرت نگار میر افضل حسین ثابت کا تبصرہ دیکھ لیں:

''ان دیندار عدالت شعار بادشاہ کو مرزا صاحب اس مدح وثنا کے قابل سمجھتے تھے اس لئے مدح کی کہ دوسروں کو بھی نیک صفات اختیار کرنے کی رغبت ہو، بے جا خوشامد و طمع کے زنگ سے اپنے آئینہ شاعری کو آلودہ نہیں ہونے دیا۔''[۱]

اب آپ یہ بند ملاحظہ کریں اور محظوظ ہوں:

گوشیعوں پر ازل سے ہے افضال ذوالمنن — پر اب محیط اعظم رحمت ہے موجزن
اس عہد کی بہار ہے غیرت دہ چمن — شکر خدا سے غنچوں کا لب ریز ہے دہن
یہ یمنِ تاجداری ظل الہٰ ہے
امجدؔ علی سا شاہ فلک بارگاہ ہے

شاہوں کی زیب ہوتی ہے تخت وکلاہ سے — پر حُسن تاج وتخت ہے اس بادشاہ سے
گویا خمیر لب کا ہے ذکر الٰہ سے — مالوف سجدہ سر سے ہے سر سجدہ گاہ سے
سلطان کربلا کی ولا صاف دل میں ہے
سجے کی طرح یاد خدا آب و گل میں ہے

عالم پناہ ، شاہ زمان و ابو الظفر — انجم سپاہ وبدر نگین و فلک سپر
پرہیز گار منصف و فیاض و داد گر — مستجمع جمیع فضائل ،ملک سیر
شاہی کو بے عبادت حق بد سمجھتے ہیں
سجادۂ نماز کو مسند سمجھتے ہیں

ہر اک صفت میں فخر سلاطین ماسلف — یکتائے عہد ، گوہر شہوار نہ صدف
آدم کا یہ خلف ہے خلف کا ہے یہ شرف — سرتاج شیعیان جناب شہ نجف

---

[۱] حیات دبیرؔ، ج،۱،ص،۹

دریتیم معدن خوش گوہری یہ ہیں
خورشید آسمان بلند اختری یہ ہیں
بازار ہو کہ شہر، محل ہو کہ بوستاں ہر جا ہے روئے دل سوئے معبود دانس وجاں
صانع نے روبقبلہ بنا یا ہے ہر مکاں اس گھر سے اہل بیت کا اخلاص ہے عیاں
ممتاز اس قدر ہیں خدا کی جناب میں
آیا ہے لفظ قبلۂ عالم خطاب میں
سن کر سوال دیتے ہیں یوں سیم وزرشتاب جس طرح سے سلام کا بے ساختہ جواب
داد و دہش ہے دولت دنیا کی بے حساب خمس و زکوٰۃ سے بھی زمانہ ہے فیضیاب
حضرت کے اس عطیئے پہ ہم جان دیتے ہیں
بے دینوں کو یہ دین اور ایمان دیتے ہیں
سچ سے رازق حق سر دست آشکارہ ہے ہر دم مشیرِ شاہ زماں استخارہ ہے
پردے میں امرونہی خدا کا اشارہ ہے دانا کو دل سے ان کی اطاعت گوارہ ہے
ظاہر میں بادشہ کی رضا پر عمل کیا
باطن میں خاص حکم خدا پر عمل کیا
یہ جنس معدلت سے ہے معمور ہر دوکاں دلال کی جگہ نہیں سودے کے درمیاں
ہر شے کا فائدے سے مبدل ہوا زیاں سم رشک زہرمہرہ ہے اور نیش نوشِ جاں
اس عہد میں فساد کا زور بدن گیا
فتنہ بدل کے اپنا اثر عطر بن گیا
وہ دن گئے کہ کرتی تھی اندھیر چاندنی اب قصر زخم میں ہے بچھانے کی چاندنی
سوزن برائے بخیہ، کرن چاند کی بنی رہزن ہر ایک راہ میں بھولے ہیں رہزنی
ہر فعل ناسزا کی سزا بے دریغ ہے
رہ زن کے کونچے کاٹنے کو راہ تیغ ہے

مرزاؔ غالب کا مرکز امید لکھنؤ مدتوں سے تھا۔امجد علی شاہ کے زمانے میں بھی انھوں نے قصیدہ کہا اور پیش ہونے کے لئے بھیجا۔آپ یہ واقعہ خود مرزا غالبؔ سے سنیں:

''ایک حکایت سنو! امجد علی شاہ کی سلطنت کے آغاز میں ایک صاحب میرے نیم آشنا یعنی خدا جانے کہاں کے رہنے والے کسی زمانے میں وارد اکبرآباد ہوئے تھے۔ میرے یہاں دو ایک بار آئے پھر وہ خدا جانے کہاں گئے۔میں دلّی آ رہا کم و بیش بیس (۲۰) برس ہوئے ہوں گے۔امجد علی شاہ کے عہد میں ان کا خط ناگاہ مجھ کو بہ سبیل ڈاک آیا چونکہ ان دنوں میں دماغ درست اور حافظہ برقرار تھا میں نے جانا کہ یہ وہی بزرگ ہیں۔خط میں مجھ کو پہلے یہ مصرع لکھا!

ازبخت شکردارم و از روزگار ہم

آپ سے جُدا ہو کر بیس برس آوارہ پھرا......اب لکھنؤ آیا ہوں ............وزیر کو میں نے بہت آپ کا مشتاق کیا ہے۔اگر آپ کوئی قصیدہ حضور کی مدح میں اور عرضی یا خط مناسب چاہئے وزیر کے نام لکھ کر میرے پاس بھیج دیجئے گا،تو بیشک بادشاہ آپکو بلائیں گے اور وزیر کا خط مشعر فرمان طلب آپ کو پہونچے گا میں نے اس عرصے میں ایک قصیدہ لکھا تھا جس کی بیت اسم یہ ہے ؎

امجد علی شہ آن کہ بہ ذوق دعائے او
صد رہ نما ز صبح قضا کرد روزگار

متردّد تھا کہ کس کی معرفت بھیجوں۔توکلت علی اللہ بھیج دیا۔رسید آگئی صرف، پھر دو ہفتہ کے بعد خط آیا کہ قصیدہ وزیر تک پہونچا۔وزیر پڑھ کر بہت خوش ہوا۔بہ آئین شائستہ پیش کرنے کا وعدہ میں متوقع ہوں کہ میاں بدرالدین مہرکن سے میری مہر خطابی لکھوا کر بھیج دیجئے۔چاندی کا نگینہ مربع اور قلم جلی فقیر نے سرانجام کر کے بھیج دیا۔رسید آئی اور قصیدے کے بادشاہ تک گزرنے کی نوید بس۔ایک مدت کے بعد حال معلوم ہوا کہ اس بزرگ کا وزیر تک پہونچنا اور حاضر رہنا سچ بادشاہ کی ملازمت اور خطاب ملنا غلط، بہادری کی مہر تم سے

بہ فریب حاصل کر کے مرشد آباد چلا گیا............[1]

دوسرے خط میں سید مرزا کو لکھتے ہیں:

''جہاں پناہ کی مدح کی فکر نہ کر سکا یہ قصیدہ ممدوح کی نظر سے گزرا نہ تھا میں نے اس میں امجد علی شاہ کی جگہ واجد علی شاہ کو بٹھا دیا۔ خدا نے بھی تو یہی کیا تھا ''انوری'' نے بارہا ایسا کیا ہے اگر باپ کا قصیدہ بیٹے کے نام کر دیا تو کیا غضب ہوا۔''[2]

واجد علی شاہ نے غالب کی قدر دانی کی لیکن اس کی تفصیل کا اس مطالعہ سے تعلق نہیں۔ شیخ تصدق حسین[3] اور ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری کے مضامین[4] کی طرف رجوع کی جا سکتی ہے۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ امجد علی شاہ کے زمانے کی ایسی جان دار بہار ادبستان اودھ پر کبھی اور نہیں آئی جو ایک طرح سے گذشتہ و آئندہ کا نقطہ اتحاد یا سنگم تھا۔ شیخ امام بخش ناسخؔ کو اگر اس دور میں شامل نہ بھی کیا جائے کیوں کہ ان کا انتقال امجد علی شاہ کی اورنگ نشینی سے پہلے ہی ۱۲۵۴ھ میں ہو چکا تھا تو بھی خلیقؔ، دلگیرؔ، ضمیرؔ، فصیحؔ، دبیرؔ، عشقؔ، تعشقؔ، انیسؔ، انسؔ، مونسؔ، نیرؔ، اسیرؔ، برقؔ، قبولؔ، قلقؔ، رندؔ، رشکؔ، نسیمؔ دہلوی، دیا شنکر نسیمؔ، تسنیمؔ، مہرؔ، عرشؔ، شادؔ، سرورؔ، گویاؔ، اور معلوم نہیں کتنے شاعر و ادیب اپنے کمال کی بہار جان افزا دکھلا رہے تھے۔

خاندان اجتہاد کے رکن اور شاگرد علما کی تو بہت بڑی اور قابل جماعت موجود تھی ان میں سے بیشتر کے نام اس کتاب میں جا بجا آئے ہیں۔ غیر شیعہ علماء مولوی عبدالرزاق، مولوی ولی اللہ، مولوی عبدالولی، مولوی فضل حق خیر آبادی، مولوی حیدر علی فیض آبادی، مولوی عبدالعلی نگرامی، مولوی حافظ اولاد احمد سہسوانی، مولوی سراج احمد سہسوانی وغیرہ بھی

---

[1] خطوط غالب مرتبہ مہیش پرشاد ص ۱۵۰

[2] وہی ص ۱۶۴ / ۱۶۵

[3] ماہنامہ نیا دور یوم جمہوریت ۱۹۵۸ء

[4] تحقیقی نوادر، ص، ۱۰۸

اس دور کی علمی عظمت کا سرمایہ تھے۔ان میں سے بعض علماء حکومت اودھ سے بر شتہ ملازمت منسلک تھے۔

تاریخ اودھ میں علمی وادبی حیثیت سے یہ دور عصر زرّیں شمار کئے جانے کے قابل اور بجاطور پر ایک خصوصی مطالعہ کا مستحق ہے۔

## ثقافتی زندگی

امجد علی شاہ نہ صرف دیندار بلکہ متشرع بادشاہ تھے،جس قدر ممکن تھا حکومت کو منہاج شریعت پر چلانے کوشش کررہے تھے۔اس لئے لکھنوی ثقافت کے سبھی وقائع نگار جس میں عبدالحلیم شررؔ اور مسعود حسن ادیب بھی شامل ہیں اس دور کو ثقافتی سرگرمیوں سے خالی بتاتے ہیں۔شررؔ نے امجد علی شاہ کے رویئے کی تعبیر ''ارتقا کی خاموشی اور تمدنی غفلت و بے پروائی سے کی ہے۔''[۱]

ادیب کا فرمانا ہے کہ''اسلامی شریعت رقص وسرور کو حرام اور لہوولعب کو ناجائز قرار دیتی ہے اس لئے اس عہد میں بھی یہ چیزیں شاہی سرپرستی سے محروم رہیں۔''[۲]

ان بیانات کے مبنی بر حقیقت ہونے کے باوجود راقم کی رائے میں یہ صورت حال کا واقعی عکس نہیں ہے۔

سکرات وجسم فروشی کے سوا کسی چیز پر جو ثقافت میں مندرج ہوسکے پابندی یا انحطاط کی کوئی شہادت نہیں ملتی۔مگر اس کے لئے ہمیں بادشاہ کی ذاتی اور نجی سرپرستی اور سرکاری سرپرستی کے درمیان خط فاصل کھینچنا پڑے گا اور اس کے لئے ہمیں خارجی شہادت کی ضرورت نہیں ،ادیبؔ مرحوم کی تحقیق میں یہ سب موجود ہے۔ہم اسے مطلب خیز ترتیب کے ساتھ پیش کررہے ہیں پروفیسر صاحب فرماتے ہیں:

---

[۱] گذشتہ لکھنؤ ص ۹۶

[۲] لکھنؤ کا شاہی اسٹیج ص ۶۵

''واجد علی شاہ کے والد امجد علی شاہ بڑے مذہبی آدمی تھے ان کے عہد میں سلطنت کا سارا کاروبار علمائے مذہب کے ہاتھ میں تھا مگر ارباب نشاط کا محکمہ ان کے یہاں بھی موجود تھا۔''[۱]

پروفیسر صاحب کے مذکورہ بالا ارشاد کا ماخذ سلطان عالم واجد علی شاہ کا یہ بیان ہے:

''اس کے بعد داروغہ ارباب نشاط نے جس کا نام مہدی تھا اور جنت مکان (امجد علی شاہ) کے عہد میں اس عہدے پر ممتاز تھا۔''[۲]

بہ آسانی سمجھا جا سکتا ہے کہ بادشاہ منہیات سے کنارہ کش اور لہولعب سے لاکھ محتاط سہی لیکن سلطنت کوئی ایسا اقدام کیسے کر سکتی تھی جس سے ریذیڈنسی کی رنگ رلیوں میں بھنگ پڑ جائے۔ ریذیڈنسی کی تقریبوں میں ساز و آواز کی ضرورت رہتی ہی تھی۔ ڈاکٹر صفی احمد ایک انگریز لیوپولڈ وان آرلیک کی زبانی بیان کرتے ہیں:

''جیسے ہی ناچ شروع ہوا بادشاہ اٹھ گئے''[۳]

اور بات محض ریذیڈنسی تک محدود ہو یہ بھی نہیں تھا خود محل شاہی میں ایسی تقریبیں ہوتی رہتی تھیں پروفیسر صاحب نے ابھی اس کا حوالہ دیا ہے۔ آپ واجد علی شاہ سے تفصیل کے ساتھ سنیں:

''نواب خاص محل کے یہاں ایک لڑکا مثل ماہ درخشاں پیدا ہوا......اس تہنیت میں ایک جشن جمشیدی منعقد کیا گیا محفل نشاط آراستہ ہوئی۔ پریاں جواہرات بیش بہا نفیس نفیس پیشوازوں و نیز کار چوبی بروں سے گوئے، پر زرقباؤں حبوں سے مالا مال ہوئے۔''[۴]

---

[۱] لکھنؤ کا شاہی اسٹیج، ص ۲

[۲] محل خانہ شاہی، ص ۴۲، ۴۳

[۳] ٹوگنگس آف اودھ، ص ۵۳

[۴] محل خانہ شاہی، ص، ۵۷

یہ بات بھی نہیں کہ یہ سب تقریباً مواقع پر ہوتا تھا۔اس غلط فہمی کے ازالے کے لئے واجد علی شاہ کا دوسرا بیان ملاحظہ فرمائیے۔ذکر اس واقعے کا فرما رہے ہیں کہ وزیرن طوائف خود ان پر بھی اور ان کے چھوٹے بھائی مرزا اسکندر حشمت دونوں پر بیک وقت ڈورے ڈال رہی تھی۔آگے کی داستان آپ خود بادشاہ سے سنیں:

''ایک روز میں نے اس سے کہا کہ تو میرے بھائی سے بھی اپنی محبت جتاتی ہے اور میری بھی خواہش کرتی ہے۔ چپڑی اور دو دو کیوں کر ہوسکتا ہے۔ یہ سنتے ہی اس نے قسم کھائی مجھے تمھارے بھائی سے کوئی تعلق نہیں۔ ایک روز کا ذکر ہے محفل عیش وطرب آراستہ تھی چاندنی کھلی ہوئی تھی خوش گلو گانے والیوں کی آوازیں عاشقوں کے دلوں پر نشتر کا کام کررہی تھیں۔ رنگ برنگی مردنگیاں اور کنول شیشہ آلات موقع موقع سے سجائے گئے تھے جس سے محفل چوتھی کی دولھن کی طرح آراستہ تھی۔ باغبانوں نے نفیس نفیس پھولوں کے گلدستے جا بجا قاعدے سے چن دیئے تھے۔جن سے وہ بزم رشک دہ باغ ارم بن گئی تھی۔ میرے رفیق مصاحب دونوں جانب صف بستہ بیٹھے اور قسم قسم کی نقل و حکایات وثنا وصفت کررہے تھے اس وقت میرے بھائی مرزا اسکندر حشمت بہادر بھی اس محفل میں شریک تھے۔ میں نے اُن سے پوچھا وزیرن سے تم سے ملاقات ہے یا نہیں۔انھوں نے جواب دیا وہ اکثر خطوط عاشقانہ میرے عشق میں اپنی تباہ حالت کے اظہار میں میرے پاس بھیجا کرتی ہے جو ابھی تک میرے پاس موجود ہیں۔ میں نے جواب دیا اسنے میرے ساتھ بھی یہی طریقہ اختیار کیا ہے۔آخرالامر یہ بات طے پائی کہ اس محفل عیش وانبساط میں جہاں سینکڑوں آدمی باوضع اور شریف مجتمع ہیں۔ ہم دونوں شخصوں میں سے جس کا ہاتھ وزیرن پکڑ لے وہ اسی کی سمجھی جائے دوسرے کو شکوہ و شکایت کا موقع نہ رہے۔الحاصل اس بے مثل رقاصہ نے ایک مرتبہ ناچ میں پیش قدمی کرکے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔''[1]

---

[1] محل خانہ شاہی،ص،۴۵

یہ سب بیانات اس بات کا قطعیٔ ثبوت ہیں کہ ثقافتی زندگی کو امجد علی شاہ کی مذہبیت سے کوئی نقصان نہیں پہونچا۔

ایک بات جسے اس مبحث میں نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے وہ یہ ہے کہ جن چیزوں کا سرانجام خزانہ عامرہ سے ہوتا ہو، بادشاہ بہ نفس نفیس لاکھ بےتعلق سہی، ان چیزوں کو سلطنت کے دائرۂ تعلق سے خارج نہیں کیا جا سکتا۔ ولی عہد سلطنت کی گرمِ سرگردگی میں ان چیزوں کو اس عہد میں پھلنے پھولنے کا بہت اچھا موقع ملا۔ پروفیسر مسعود حسن نے اپنی مہتم بالشان کتاب لکھنؤ کا شاہی اسٹیج میں ولی عہدی اور بادشاہی، دونوں حیثیتوں میں ناٹک اور موسیقی سے واجد علی شاہ کی دلچسپی کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے اور پھر اس نتیجے پر پہونچے ہیں:

''اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے۔ اس سے بخوبی واضح ہوجاتا ہے کہ اردو ڈرامے کا آغاز، اس کی ابتدائی ترقی، اس کی مقبولیت اور عام رواج کا سہرا واجد علی شاہ کے سر ہے اور اس کے لئے اردو زبان ہمیشہ ان کی ممنون رہے گی۔''[1]

ہم اسی محقق بزرگ سے یہ معلوم کر چکے ہیں کہ واجد علی شاہ کے زمانے تک اردو میں ڈرامے کا وجود نہ تھا۔ اس اہم صنف ادب کی بنیاد ڈالنے کا فخر ان کے لئے اٹھ رہا تھا۔ انھوں نے ولی عہدی کے دنوں میں رادھا، کنھیا کی داستان محبت پر مبنی ایک چھوٹا سا ناٹک لکھا جو ہماری خوش قسمتی سے اب تک موجود ہے۔[2]

اس لئے یہ ادعا بے جا نہ ہوگا کہ اردو ڈرامہ عہد امجد علی شاہ کی دین ہے اور ان کے دور میں لکھنؤ کی معروف ثقافتی زندگی کو کوئی گزند نہیں پہونچی بلکہ اردو ناٹک کی بنیاد انھیں کے دور میں پڑی، جس سے ایک عام پسند ثقافتی دلچسپی کا اضافہ ہوا۔ ہرچند کہ بادشاہ خود مشروع اور محتاط زندگی بسر کرتے رہے۔

❑❑

---

[1] لکھنؤ کا شاہی اسٹیج، ص ۱۸۶

[2] وہی، ص ۲۱



عکس مہر قبلہ و کعبہ، سلطان العلماء



عکس مہر امجد علی شاہ

## (۵)

# انگریزوں سے تعلقات اور انتقال

ہندوستان سے انگریزوں کے تعلق کی کہانی اتنی جانگداز ہے کہ اس کے چھوٹے سے چھوٹے حصّے کا بیان بھی آسان نہیں۔ اودھ سے انگریزوں کے روابط اس داستان خونین کا بہت خفیف حصّہ ہیں لیکن یہ بھی اتنے تفصیل طلب ہیں کہ ان کے لئے مستقل مجلدات کی ضرورت ہے۔ اس باب میں کسی طرح ان کی سمائی نہیں ہوسکتی۔ اس لئے ہم بہت مختصر طریقے سے اس سوال پر یہاں نظر ڈالنے کی کوشش کریں گے اور صرف ان دو گورنر جنرلوں کے کارناموں کا جائزہ لیں گے جن سے امجد علی شاہ کا سابقہ رہا۔

ہر چند کہ ہماری نصابی کتب تاریخ میں ہر گورنر جنرل ایک مستقل عنوان کی طرح پیش کیا جاتا ہے اور اس کے کارناموں کا مجموعی بیان ہوتا ہے لیکن اودھ کی تاریخ نگاری کی ستم ظریفیوں میں یہ ایک زبردست ستم ظریفی ہے کہ یہاں محض ریذیڈنٹ اور بادشاہ کے تعلقات سے اس طرح بحث کی جاتی ہے کہ جیسے ریذیڈنٹ نہایت مخلص استاد رہنما اور شفیق اتالیق ہوں کہ جن کی ایک ایک سانس سلطنت اودھ کی بھلائی میں صرف ہوتی ہو اور اودھ کے باشندوں اور حکمرانوں کی اصلاح و فلاح کے سوا کوئی اور بات ان کے پیش نظر ہو ہی نہیں اور اسی کے ساتھ بادشاہوں کی سیرت کی عکاسی ایک کند ذہن، غبی، نافرمان اور کام چور شاگرد کی طرح کی جاتی ہے جن پر اس ''سراپا اخلاص اور مجسّمۂ خیر اندیشی معلم کامل'' کی تعلیم و تربیت کا اثر ہی نہیں ہوتا تھا۔ یہ ایسی چیز نہیں ہے کہ جو محتاج ثبوت ہو۔ اس لئے مثالوں سے طوالت بڑھانے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ اودھ پر ماضی قریب میں ہماری

یونیورسٹیوں کے جو تحقیقی کام سامنے آئے ہیں ان سب کی کم و بیش یہی کیفیت ہے۔ اگر پروفیسر مسعود حسن ادیبؔ، پنڈت سندر لال، بابو پری پورنا نندورما، رئیس احمد جعفری اور ایسے ہی کچھ نام اور نہ ہوتے تو اودھ کی تاریخ ایسے اندھیرے گھپ میں قید ہوجاتی کہ جو یائے حق کو راہ ملنا ممکن نہ رہ جاتا۔ ہم مطالعے کا آغاز لارڈ ایلن برا سے کرتے ہیں۔

## لارڈ ایلن برا

ہندوستان پر مسلط ہونے سے پہلے کمپنی کے کنٹرول بورڈ کے چیئرمین رہ چکے تھے۔[۱] پہلی افغان جنگ میں شکست کھا جانے کے بعد انگریز پریشانیوں کے شکار تھے اور انھیں ہندوستان میں اپنی حالت سنبھالنے کے لئے زیادہ ہوشیار نمایندے کی ضرورت تھی۔ سیاسی حکمت عملی میں ان کے استاد وہ ویلزلی برادران تھے جن میں سے ایک گورنر جنرل مارکویس آف ویلزلی کے نام سے اور دوسرا جنرل ولزلی اور بعد میں دو ڈیوک آف ویلنگٹن کے نام سے برطانوی سامراج کی تاریخ میں مشہور ہوا۔[۲]

لارڈ ایلن برا فروری ۱۸۴۲ء میں گورنر جنرل ہوکر ہندوستان پہونچے تھے۔ یہاں پر یہ دیکھ لینا مناسب ہوگا کہ وہ کن خیالات کے حامل تھے۔ گورنر جنرل کی حیثیت سے ہندوستان آنے کے تقریباً ۹ سال قبل برطانوی دارالامارہ میں ۵ رجولائی ۱۸۳۳ء کو آپ نے ہندوستان کے بارے میں جو خیالات ظاہر کئے تھے ان کا اقتباس پنڈت سندر لال نے اس طرح پیش کیا ہے:

> ''کوئی بھی شخص جس کا ہوش ٹھکانے ہے ہندوستان کے اندر سیاسی اور فوجی طاقت ہندوستانیوں کے ہاتھ میں دینے کی تجویز نہیں کرسکتا..................
>
> ہندوستان کے اندر ہمارا وجود ہی اس بات پر منحصر ہے کہ اس ملک میں اہل ملک کو

---

[۱] ودیا دھر اور ساوتری مہاجن برٹش کالین بھارت کا اتہاس، ص ۱۷۲

[۲] بھارت میں انگریزی راج، ص ۱۵۷

فوجی اور سیاسی اختیارات سے بالکل دور رکھا جائے............ہم نے ہندوستانی سامراج تلوار سے جیتا ہے اور تلوار ہی سے ہمیں اسے قائم رکھنا ہوگا............''[۱] ترجمہ

پنڈت جی نے ایلن برائی ذہنیت کا پول چابک دستی سے کھولا ہے وہ سب کا سب یہاں دوہرایا نہیں جاسکتا۔ لیکن مسلمانوں پر جن میں اودھ کے بادشاہ بھی تھے لاٹ صاحب کی نظر التفات کس درجہ کی تھی اسے آپ پنڈت جی کے قلم سے ملاحظہ فرمائیں:

''لارڈ ایلن برا مسلمانوں کو انگریزوں کا خاص دشمن سمجھتا تھا اس لئے وہ ہندوؤں کو خوش کر کے انھیں مسلمانوں کے خلاف انگریزوں کی طرف ملائے رکھنا چاہتا تھا۔ جنگ افغان کے وقت ہندوؤں کو خوش کرنے کا لارڈ ایلن برا کو ایک اچھا موقع ہاتھ آیا۔''

## سومناتھ مندر کے دَروازے

''گیارہویں صدی عیسوی میں کہا جاتا ہے کہ محمود غزنوی سومناتھ کے مندر کے دو خوبصورت جڑوا کواڑ اپنے ساتھ غزنی لے گیا تھا۔ ان کواڑوں کی نقاشی اتنی حسین تھی کہ وہ بعد میں محمود کے مقبرے پر لگا دیئے گئے۔ لارڈ ایلن برا نے حکم دیا کہ یہ پرانے دروازے غزنی سے ہندوستان لاکر ایک شاندار جلوس کے ساتھ سارے ہندوستان میں گشت کرائے جائیں اور آخر میں سومناتھ کے مندر میں پہونچا کر اپنی قدیم جگہ پر قائم کردیئے جائیں۔''[۲] (ترجمہ)

لاٹ صاحب کے حکم کی تعمیل ہوئی، کہیں سے دروازے لائے گئے۔ جلوس بھی نکلا۔ وہ آگرے تک پہونچا بھی۔ ہندو راجاؤں، مہاراجاؤں میں ۱۶/نومبر ۱۸۴۲ء کا ایک اعلان بھی تقسیم ہوا کہ انگریز سرکار ہندوؤں اور ہند و دھرم کی بڑی ہمدرد ہے اور دروازے پھر لگا دیئے جائیں گے۔ مگر یہ سب خالص سیاسی عیاری تھی۔ اس کا بھانڈہ بھی

---

[۱] بھارت میں انگریزی راج، ج،۲، ص۶۔۱۵۷

[۲] بھارت میں انگریزی راج، ج،۲، ص۷۔۱۶۷

پنڈت جی کے ہی ہاتھوں سے پھوٹا ہے بتاتے ہیں:

''قارئین کو حیرت ہوگی کہ جب افغانستان پر حملہ کرنے والی ساری انگریز فوج میں سے صرف ایک انگریز زندہ بچ کر ہندوستان لوٹ سکا تب وہ پرانے کواڑ افغانستان سے یہاں کس طرح آگئے اس میں سب سے زیادہ طلسمی بات یہی ہے کہ جو کواڑ اتنی دھوم دھام سے جلوس کے ساتھ آگرے لائے گئے وہ ایلن برا کے حکم سے جلال آباد میں بنائے گئے تھے۔ کمپنی کے عمال کی سیاسی عیاری کی اس سے اچھی مثال اور کیا مل سکتی ہے۔''[1] ترجمہ

ان عیارانہ چالوں سے جنگ افغان جیتی گئی اس جیت کے ہیرو جنرل پالک تھے۔ جن کے کارناموں کی اطلاع دیتے ہوتے ایلن برا ڈیوک آف ولنگٹن کو لکھا: کابل پہنچ کر جنرل پالک نے اپنی فوج کو حکم دیا کہ کابل کے خاص بازار اور وہاں کے دو خوبصورت مسجدوں کو آگ لگادی جائے۔ حکم کی تعمیل بھی ہوئی۔[2]

## اودھ کی طرف سے امداد

اس جنگ میں اودھ نے جو تعاون کیا اس کی واقعی تفصیل اس وقت دستیاب نہیں ہے محض سیّد امیر علی کے اجمالی بیان پر اکتفا کرنی پڑ رہی ہے:

''سرکار برطانیہ کے ساتھ اس بادشاہ بلند پائے گاہ (امجد علی شاہ) کو اتحاد و وداد کا بہت خیال و لحاظ تھا اور اسی لئے جب برطانیہ کی فوج ظفر موج جنرل پالک بہادر کی سرکردگی میں کابلستان کی طرف روانہ ہوئی اور جب مہم لاہور پیش آئی، سینکڑوں گھوڑے ہدیہ کئے اور نیز لاکھوں روپیہ دیا۔ اس وقت کیا اس کے بعد اس دولتِ بلند صولت کے عمال کو دئے گئے کہ جن کے منافع مستمرہ سے محلات و شہزادگان فارغ البال و خوش حال

---

[1] بھارت میں انگریزی، راج، ۲۔ ص ۳

[2] وہی، ص ۱۹۷

ہیں..................''[۱] ترجمہ

نقد قرض کے بارے میں ۱۶/دسمبر ۱۸۴۲ء کو ایلن براڈیوک آف ولنگٹن کو خوشخبری دیتے ہیں اس میں لفظ ''اور'' استعمال کرتے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ پہلے بھی وصول کر چکے ہیں:

''میں نے اودھ کے بادشاہ سے اور دس لاکھ روپئے بطور قرض وصول کر لیئے ہیں۔''[۲]

کل رقم قرض جو امجد علی شاہ نے کمپنی کو عطا کی اس کی تفصیل ہم اس باب کے آخر میں پیش کریں گے۔ یہاں آپ ایلن برا کی ان سرگرمیوں کا ایک سرسری مطالعہ ملاحظہ فرمالیں جو وہ اودھ کے باہر دکھار ہے تھے۔ تا کہ یہ سمجھنے میں آسانی ہو کہ وہ اودھ کی صلاح وفلاح کے مساعی پر مامور نہ تھے۔ ہندوستان میں انگریزوں کی آمد اور تسلّط، حکم رانی، نفع اندوزی تبلیغ مذہب کے لئے تھی اور اس کے لئے وہ کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتے تھے اور بدنظمی وبدامنی پھیلانے سے ہی ان کا کام بنتا تھا۔

ایلن برا صاحب کے کارناموں میں سندھ حیدر آباد دکن، گوالیار، کیتھل اور جیت پور پر ہاتھ صاف کرنا بھی ہے۔ اودھ اگر ان کے دست تعدی سے بچ گیا تو یہ ان کے رحم و کرم کی بنا پر نہ تھا۔ اس وقت وہ اودھ کے محتاج اور دست نگر تھے ورنہ وہ اتنے حوصلہ مند صاحب بہادر تھے کہ ''دلّی کے شہر اور قلعے پر قبضہ کر کے اسے برطانوی ہند کی راج دھانی بنانا چاہتے تھے''۔

مگر ان کے سیاسی گرو نے دوسرا سبق دیا۔ وہ یہ تھا کہ ''مغل شہنشاہ اور ان کے خانوادے کے اعزاز واحترام میں اس سے زاید مداخلت انگریزی راج کے لئے خطرناک ثابت ہوسکتی ہے۔'' یہ خط ۲۷/ستمبر ۱۸۴۲ء کا ہے۔ ۲۸/دسمبر ۱۸۴۲ء کے خط میں اپنے گرو سے اتفاق کرتے ہوئے بھی لال قلعے پر دانت جمائے ہیں۔ لکھتے ہیں:

---

[۱] وزیر نامہ ص ۸۷

[۲] بھارت میں انگریزی راج، ج، ۴، ص ۷۵۴

''میں پہلے ہی آپ کی طرح اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ کوئی ایسا کام کرنا، جس سے یہ معلوم ہو کہ ہم ضعیف شہنشاہ کے ساتھ ظلم کر رہے ہیں مناسب نہ ہوگا یہ ممکن ہے کہ میرا جانشین شہنشاہ کے جانشین سے ایسا سمجھوتہ کر سکے جس سے دلی کا قلعہ ہمارے ہاتھوں میں آجائے۔ سلطنت کی پرانی راجدھانی کا ہمارے ہاتھوں میں ہونا اور ہمارا وہیں سے بیٹھ کر سلطنت چلانا مجھے سدا سے ایک بہت بڑا نصب العین محسوس ہوتا ہے۔''[۱] ترجمہ

یہ تھے لارڈ ایلن برا اور ان کے عزائم جن میں سے کچھ کو پورا کر کے، کچھ ادھورے چھوڑ کے انہوں نے یکم اگست ۱۸۴۴ء کو اپنے جانشین کے لئے جگہ خالی کی۔

یہ جانشین سر ہنری ہارڈ نگ تھے۔ ان کا تعارف ایلن برا ۱۷/جون ۱۸۴۴ء کے خط میں اپنے ایک دوست میجر براڈ فٹ سے کراتے ہیں:

''تم نے سنا ہوگا کہ ڈائریکٹروں نے مجھے واپس بلا لینا مناسب سمجھا ہے۔ میرا جانشین میرے تمام ارادوں کو پورا کرے گا۔ وہ میرا نہایت قابل اعتبار دوست ہے اور پچھلے انیس سال سے سب عوامی مسائل پر میں اس سے خط و کتابت کرتا رہا ہوں۔''[۲] ترجمہ

ہنری ہارڈ نگ نے سب سے پہلے پنجاب پر ہاتھ صاف کیا۔ بڑی سخت معرکہ آرائی کے بعد جس کی تفصیل میں یہاں جانے کی ضرورت نہیں ۱۸۴۶ء میں پہلا سمجھوتہ ہوا جس کے ذریعے کچھ علاقہ انگریزی راج میں شامل کیا گیا اور باقی پر ایک غدار وطن لال سنگھ کو وزیر کی حیثیت سے مسلط کر دیا گیا۔[۳]

یہ بھی ایک فرنگی چال تھی کہ اگر سلطنت پر براہ راست قبضہ نہ ہو سکے تو اپنے پٹھوؤں کو وزیر مقرر کرا کے در پردہ اپنا اُلّو سیدھا کیا جائے۔ ہمارے ہم وطن بعض ارباب تاریخ پتہ نہیں کیسے اس مغالطے کا شکار ہیں کہ انگریز اودھ میں ملک و مَلِک کے خیر اندیشوں کو وزیر

---

[۱] بھارت میں انگریزی راج، ج ۳، ص ۷۵۵

[۲] بھارت میں انگریزی راج، ج، ۲، ص ۷۵۵

[۳] وہی، ص ۷۵۶

مقرر کراتے تھے۔

لاہور کی کامیابی کا انعام سر ہارڈنگ کو ''لارڈ'' کے خطاب اور تین ہزار پونڈ سالانہ حیاتی پنشن کی شکل میں دیا گیا۔''[۱]

## اودھ کے ساتھ سلوک

لاہور میں انگریزوں کی کامیابی اودھ کے تعاون کی پوری حد تک نہیں تو بہت بڑی حد تک رہین منت تھی۔ برڈ'' ہاؤ ٹو میک اینڈ ہاؤ ٹو بریک اے ٹریٹی'' کا اقتباس نقل کرتے ہیں:

''اودھ کی طرف سے کمپنی کو بڑی خوشی سے فوجی امداد دی گئی۔ سوار اور پیدل فوج کی ساری طاقت کمپنی کو سونپ دی گئی یہ خالی گپیں نہیں بلکہ مشہور و معروف حقیقی واقعات ہیں......''[۲]

لیکن اس حسن سلوک کا بدلہ اودھ کے بادشاہ کو کس طرح دیا گیا اس کا دیکھنا بھی ضروری ہے۔ کمال الدّین حیدر رقمطراز ہیں:

''خلاصہ جب عشرۂ محرّم میں خبر فتح لاہور آئی، صاحب نے میر حسن علی سفیر سے فرمایا کہ توپ کی سلامی ہو۔ ان سے تبلیغ رسالت میں کچھ خلاف مزاج صاحب سرزد ہوا۔ برہم ہو کر کہا انھیں عہدہ سفارت سے موقوف کیا اور پھر بتاکید تمام سلامی توپ کو کہلا بھیجا۔ عذر عشرۂ محرم نہ مانا ہر چند کہ یہ امر خلاف حکم شاہی تھا۔ رات کو توپ سلامی کی چلی۔''[۳]

یہ تھا سفید فام، سیاہ باطن فرنگی کا اپنے محسن کے ساتھ حسنِ سلوک کہ مذہبی جذبات کو مجروح کرنے پر اکتفا نہیں ہوئی ایک بے گناہ کو روزگار سے بھی محروم کر کے دم لیا۔

---

[۱] وہی، ص ۶۸۷

[۲] اودھ کی لوٹ، ص ۶۵

[۳] سوانحات، ج ۱، ص ۳۸۴

# ریذیڈنٹ

اب ہمیں ان ریذیڈنٹوں کی کارگزاریوں پر نظر ڈالنا ہے جو دربار میں کمپنی کے نمایندے، گورنر جنرل کے ترجمان اور بقول ایلن برا کے ان کے خیالات کے امین ہوتے تھے۔[1] ان کا سرکاری اور علانیہ مصرف تو دربار اور کمپنی کے درمیان رابطہ یا متوسط کا ہوتا تھا۔ مگر ان میں سے بعض اتنے حوصلہ منداور عزم پرور ہوتے تھے بہت سے کام کھلم کھلا ایسے کرڈالتے تھے کہ بظاہر جو ان کے آقاؤں کے خلاف مرضی معلوم ہوتے تھے۔

لیکن دراصل ان کا منصب دربار میں سازشیں کرنا، نظم ونسق میں مداخلت کاری کے ذریعہ بدانتظامی پیدا کرنا، اور دربار کو جس حد تک لوٹا جاسکے لوٹنا اور جتنا کمزور کیا جاسکے کمزور کرنا ہوتا تھا۔ اس حقیقت کو انگریز چھپاتے بھی نہیں تھے۔ سرجان شور وزیر علی آصف جاہ کی معزولی جن کی گورنر جنرلی کا خاص کارنامہ ہے خود معترف ہیں:

''دیسی درباروں میں ریذیڈنٹ کے قیام کا خفیف سے خفیف فائدہ بھی تلاش کرنا حد درجہ مشکل ہے۔ اس لئے یہ یقین ہوتا ہے کہ شاید اس کاروائی سے مختلف ریاستوں میں محض بدنظمی اور ابتری ہی پھیلانا مقصود ہے تاکہ ہم ان پر قبضہ جمانے کے مواقع اور کچھ تاویلیں مہیّا کرسکیں۔''[2]

سرہنری لارنس اس سے زیادہ صاف گوئی سے کام لیتے ہیں۔ پنڈت جی نے ان کا قول نقل کیا ہے:

''اگر کہیں بدانتظامی کو قائم رکھنے کی کوئی پکی ترکیب کی جاسکتی ہے تو وہ یہ ہے کہ فرمانروا دیسی ہو اس کا وزیر دیسی ہو، دونوں کی مدد کے لئے بدیسی سنگین ہوں اور ایک

---

[1] ٹوکنگس آف اودھ، ص ۶۴

[2] لکھنؤ کی تہذیبی میراث، ص ۱۴۰

انگریز ریذیڈنٹ انھیں پیچھے سے چلانے والا ہو۔''[۱] ترجمہ

لارنس کا یہ قول پنڈت جی نے کلکتہ ریویو فروری ۱۸۴۵ء سے لیا ہے اور یہ امجد علی شاہ کا عہد حکومت تھا۔ اب آپ ایک دوسرے سابق گورنر جنرل لارڈ ہسٹینگز کا اعتراف ملاحظہ کریں:

''درحقیقت عوام کے لئے راحت رساں نظم ونسق قائم کرنے کا محض ایک ہی سچا اور کارگر ڈھنگ یہی ہوسکتا تھا کہ انگریز ریذیڈنٹ کو واپس بلا لیا جاتا اور نواب کو اپنے راج کے انتظام میں آزاد چھوڑ دیا جاتا، اس لئے اس علاقے میں بے اطمینانی کا سارا قصور کمپنی کے سر ہے۔''

یہ ہے ریذیڈنٹ کے بارے میں خود انگریزوں کا اعتراف حقیقت اور یہ بتاتا ہے کہ دیسی ریاستوں میں بدنظمی اور بے اطمینانی کا اصل سبب کون تھا! فرماں روا یا ریذیڈنٹ۔ ہم میں سے جو لوگ ریذیڈنٹ کو اتالیق شفیق اور مخلص رفیق کی شکل میں دیکھتے ہیں وہ انصاف سے کام نہیں لیتے یا خود ناقص اور ایک طرفہ مطالعے کا شکار ہیں۔ اودھ میں ریذیڈنٹ کا تقرر عہد شجاع الدولہ میں ہوا تھا۔ ابتداء میں اس کے طرز بود و باش کے بارے میں پنڈت جی لکھتے ہیں:

''بھارت کے سب راج درباروں میں اس وقت انگریز ریڈنٹ ہندوستانی ڈھنگ سے رہتے تھے، ہندوستانی پوشاک پہنتے تھے اور اپنے یہاں ہندوستانی منشی نوکر رکھ کر ان سے ہندوستانی زبانیں اور ہندوستانی رہن سہن کے طریقے سیکھتے تھے۔''

پنڈت جی سلسلۂ بیان میں ریذیڈنٹوں کی حرکتوں کے بارے میں بتاتے ہیں:

''ان ریذیڈنٹوں کا خاص کام ہر ہندوستانی دربار کے اندر وہاں کے فرماں روا کے خلاف سازش کرنا اور دربار میں آپسی پھوٹ ڈلوانا ہوتا تھا۔ دھیرے دھیرے اودھ کے

---

[۱] بھارت میں انگریزی راج، ج، ۲، ص، ۷۹۹

اندر بھی ریذیڈنٹ کی سازش اور اس کا اثر بڑھتا چلا گیا۔''[۱] ترجمہ

اب آپ ان ملاحظات کی روشنی میں امجد علی شاہ کے عہد کے ریذیڈنٹوں کی تفصیل ملاحظہ فرمائیں۔ اس کا بیشتر حصّہ ڈاکٹر صفی احمد کی کتابوں ٹوکنگس آف اودھ اور برٹش ریذیڈنٹس سے اعتراف وشکر گذاری کے ساتھ لیا جا رہا ہے۔

## جان لو

بادشاہ کی حیثیت سے سب سے پہلا سابقہ امجد علی شاہ کو کرنل جان لو سے پڑا۔ ان کی عظمت مصلحت شناسی، معاملہ فہمی اور بے جا مداخلت کھلم کھلا کرنے سے احتراز کی حکمت عملی کے باعث دربار سے کسی ٹکراؤ کا نشان نہیں ملتا۔ اگر چہ انھوں نے اپنے ہونے والے جانشین میجر جزل ولیم ناٹ کے نام کے ۲۹/اکتوبر ۱۸۴۲ء خط میں ریذیڈنٹ کے فرائض اور دائرہ کار کا جو تعارف کرایا ہے اس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ وہ اس سے مطمئن نہ تھے اور اختیارات میں اضافہ کی تجویز بھیج چکے تھے۔ کہتے ہیں:

''اس وقت تک کورٹ سے کوئی جواب نہیں موصول ہوا، لہٰذا ریذیڈنٹ کے فرائض میں کوئی فرق نہیں پڑا ہے۔''[۲]

یہی جان لو ہیں جن کے زمانے میں نصیر الدّین حیدر شاہ کو زہر دیا گیا۔ شہزادہ منّا جان محروم رہے اور محمد علی شاہ نے ایک نئے معاہدے پر دستخط کرنے کی فراخ دلی دکھا کے تخت وتاج حاصل کیا۔ یہی خاص وجہ تھی کہ امجد علی شاہ کے استحصال کی انہیں ہمت نہیں پڑی اور کوئی کشاکش نہیں ہوئی اور کھلم کھلا کشاکش انہیں پسند بھی نہ تھی۔

---

[۱] بھارت میں انگریزی راج، ج، ۱، ص، ۳۵۱

[۲] برٹش ریذیڈنسی ایٹ دی کورٹ آف اودھ، ص، ۱۶۷

## ولیم ناٹ

جان لو نے سر ولیم ناٹ کو اپنے عہدے کی ذمہ داریاں سونپ کے آخری بار ۳۰ر نومبر ۱۸۴۲ء کو لکھنؤ سے کوچ کیا۔[۱]

سر ولیم ناٹ فوج میں کیپٹن کے رتبے کے ایک افسر تھے۔ جنھیں یہ سفارتی منصب پہلی جنگ افغان (۴۲-۱۸۳۹) میں نمایاں خدمات کے عوض انعام میں ملا تھا۔ مگر وہ تین مہینہ کی رخصت علالت پر ایک مہینہ کام کرنے کے بعد چلے گئے۔ اس مدت میں شیکسپیئر اسسٹنٹ ریذیڈنٹ نے قائم مقامی کی۔

## شیکسپیئر

پرانے افسر تھے، دربار کے نشیب و فراز خوب سمجھتے تھے۔ مگر میعاد عہدہ اتنی مختصر تھی کہ زیادہ ہاتھ پاؤں چلانے کا موقع نہیں تھا۔ یہ بھی نواب شرف الدّولہ کی وجہ سے امین الدولہ کی مخالفت کرتے رہے۔[۲]

مگر زمانہ وہ ہے کہ جنگ افغان میں امداد و استقراض کی وجہ سے اودھ کے بار احسان سے کمپنی زیر بار ہے اس لئے بھی شاید ان کی در اندازی پوری طرح کامیاب نہ ہوئی ہو۔

## ناٹ

۲۱ر فروری ۱۸۴۳ء کو واپس آئے۔ کم و بیش دس مہینے کام کیا اور جان لو کے نقش قدم پر چلتے ہوئے یکم دسمبر ۱۸۴۳ء کو رخصت ہو گئے۔[۳]

---

[۱] وہی

[۲] سوانحات، ج ۱، ص ۳۸۷

[۳] برٹش ریزنڈنٹ، ص ۱۷

# پولک

ناٹ کی جگہ قائم مقام ایلچی کی حیثیت سے پولک نے سنبھالی۔ یہ وہ وقت تھا کہ امین الدولہ برطرف اور منور الدولہ وزارت پر منصوب ہو چکے تھے۔ پولک ''امجد علی شاہ کو برطانیہ کے ساتھ روابط میں مخلص سمجھتے تھے اور ان کے خلوص کی قدر کرتے تھے''۔ لیکن جب منور الدولہ کو ہٹا کے بادشاہ نے امین الدولہ کو پھر بحال کیا تو یہ صاحب کو ناگوار ہوا۔ منور الدولہ مشہور ''مقبول سرکار'' تھے بات ناگوار ہونے والی ہی تھی۔ پولک نے مصلح الدولہ (میر حسن سفیر) کی برطرفی اور لکھنؤ بدر کر کے کانپور بھیج دینے کی سفارش کی دربار نے اسے بھی نہیں مانا۔ اس کشاکش میں گورنر جنرل نے احتجاج کیا کہ ''ریذیڈنٹ کی مشورت کو منظم طریقے سے رد کیا جانا معاہدہ کی خلاف ورزی ہے'' مگر ۱۱/اگست کو یہ احتجاج نامہ آیا اور ۱۳/اگست ۱۸۴۴ء کو پولک روانہ ہو گئے، بات جہاں کی تہاں رہ گئی۔

# پھر شیکسپیئر

شیکسپیئر[۱] کے نام پھر قرعۂ فال نکلا۔ یہ قائم مقامی تیرہ مہینے کی طویل مدّت تک چلی۔ ڈاکٹر صفی احمد کی رائے میں ''پہلی سکھ لڑائی کی وجہ چابک دست افسروں کو اس جگہ کے لئے خالی نہیں کیا جا سکتا تھا۔[۲]

ظاہر ہے ایسے عالم میں اودھ میں کسی بڑی تبدیلی کا امکان ہی نہ تھا۔ ورنہ شکسپیئر صاحب اور دربار میں چپقلش بڑھ رہی تھی۔ مگر احتجاجی مراسلات کے علاوہ کمپنی سے کچھ کرتے دھرتے بن نہیں پڑ رہا تھا۔ مگر ریذیڈنٹ کو بادشاہ کی تاجپوشی کے سالانہ یادگاری جشن میں احتجاجاً شرکت سے منع کر دیا گیا۔ بات زیادہ بڑھنے نہ پائی تھی کہ مستقل

---

[۱] وہی، ص، ۱۹

[۲] برٹش ریزیڈنٹس ص ۱۷

ریذیڈنٹ آ گیا اور شیکسپیئر صاحب اپنے ٹھکانے پہنچ گئے۔

## ڈیوڈسن

یہ مستقل سفیر تھامس ریڈ ڈیوڈسن تھے جنھوں نے ۷/اکتوبر ۱۸۴۵ء کو چارج لیا۔ انھوں نے امین الدولہ کے بارے میں اچھی رائے قائم اور اپنے مراسلات میں ان کی صفائی پیش کی۔ بادشاہ کے بارے میں بھی لکھا کہ ''انہوں نے میرے مشورے کو بڑے پاس ولحاظ کے ساتھ سن کر عمل کیا۔''[1]

لیکن بااین ہمہ عشرہ محرم میں توپ کی سلامی اور مصلح الدولہ حسن علی کی سفارت سے برطرفی انہیں کے زعم برتری کی یادگار رہے۔

## رچمنڈ

ڈیوڈسن نے ۱۵/جنوری ۱۸۴۷ء کو لکھنؤ چھوڑا، کرنل رچمنڈ اُن کے جانشین ہوئے۔ ابھی یہ حالات کا جائزہ لے رہے تھے کہ ۱۳/فروری ۱۸۴۷ء کو امجد علی شاہ کا دور حیات مستعار تمام ہو گیا۔

اب پایاں مبحث میں ان رقوم کو بھی دیکھ لیجئے جو کمپنی نے بطور قرض وصول کیں اور ان کے منافع سے بادشاہ نے اپنے متوسلین کے وثیقہ کا بندوبست کیا۔ کمال الدین حیدر روایت کرتے ہیں:

''حضرت جنت مکان نے محلات معلیٰ اور اپنے متوسلین کے واسطے کاغذ نوٹ بطریق قرضہ موبد جمع کل ۳۸ لاکھ (کے لئے)۔''

---

[1] ٹوکنگس آف اودھ، ص، ۸۔۷/۶

# تفصیل صاحبان پنشن نوٹ

| | |
|---|---|
| نواب فغفور محل صاحبہ ملکہ کشور | ماہواری دو ہزار روپے |
| نواب خسرو بیگم | دو ہزار روپے |
| مرزا محمد جواد جنرل سکندر حشمت بہادر | پانچ سو روپے |
| نواب امین الدولہ | پانچ سو روپے |
| نواب معین الدولہ | نو سو روپے |
| افسر بہو صاحبہ | دو سو پچاس روپے |
| نواب تاجدار بہو صاحبہ | دو سو پچاس روپے |
| بھیجو بیگم استانی جی | سو روپے |
| سید محمد میر شمشیر الدولہ | پچاس روپے |
| حسن علی خاں چیلہ | پچاس روپے |

# دفعہ تقسیم نوٹ آٹھ لاکھ

| | |
|---|---|
| نواب تاج آرا بیگم | دو ہزار، باون روپے، پانچ آنے چار پائی |
| جناب عالیہ مریم مکانی | نو سو تیس روپے، پانچ آنے چار پائی |
| نواب فغفور محل صاحبہ | چار سو سولہ روپے، ایک آنہ، آٹھ پائی[۱] |

# انتقال

اس خیر مجسم بادشاہ نے اس عالم فانی میں تقریباً بہ حساب قمری اڑتالیس سال کی زندگی اور پانچ سال کا دور فرمانروائی گزار کے ۲۶ صفر ۱۲۶۳ھ مطابق ۱۸۴۷ء یوم شنبہ چار

[۱] سوانحات، ج ۱، ص ۳۸۵

بجے سہ پہر کو وفات پائی۔

کمال الدین حیدر سرطان کو بہانہ موت کہتے ہیں۔[۱] ڈاکٹر بھٹناگر برطانوی ریکارڈ کے حوالے سے بتاتے ہیں:

''بادشاہ پر ہلکے درد سینہ کا حملہ ہوا جس کے بعد ان کے منھ سے خون آ گیا تھوڑی دیر بعد انھوں نے پیٹھ میں آماس اور درد کی شکایت کی''[۲]

''۲۷ صفر روز یکشنبہ موتی محل کے نیچے دریا میں غسل دیا گیا میدان رمنہ میں مجتہدین نے بجماعت کثیر نماز پڑھی خود (غالباً واجد علی شاہ) پیادہ پا ساتھ ہوئے جلوس شاہانہ کثرت خلائق از حد تھی۔ چھاونی مینڈو خاں رسالہ دار میں خیمہ نصب تھا وہیں دفن کیا۔''[۳]

سعادت مند جانشین نے ریذیڈنٹ کے مشورے سے جنت مکان لقب تجویز کیا اور دس لاکھ روپیہ مقبرہ کے لئے منظور کیا۔ مناسب ہوگا کہ باپ کے انتقال پر بیٹے کی تاثرات کی یاد تازہ کر لی جائے۔ واجد علی شاہ لکھتے ہیں:

''جب میرے والد ماجد حضرت جنت مکان راہی گلزار جناں ہوئے اور اس غم جاں کاہ سے زمانہ تیرۂ و تار ہوا۔ پنجۂ غم والم سے ملازموں نے گریبان صبر جیب سحر کی طرح پھاڑ ڈالے۔ گلستان لکھنؤ جو حقیقت میں رشک دہ باغ ارم ہے، سموم غم والم مثل گلزار خزاں رسیدہ کے ویران ہوا۔ طائر راحت آشیانۂ دل سے اڑ گئے۔ آہوئے آرام آدمیوں کے حرم جاں سے بھاگے، صدف چشم آنسو کے موتیوں سے بھر گئے۔ صدائے آہ و بکا سے کروبیاں کے کان بہرے ہو گئے۔ ہر سینہ دست ماتم سے آشنا ہوا۔ آہوں کے دھوئیں سے آسمان کے نیچے ایک اور آسماں پیدا ہو گیا۔ اشکوں کے سیلاب نے نوح؏

---

[۱] سوانحات، ج ۱، ص ۳۸۵

[۲] اودھ انڈر واجد علی شاہ، ص ۹، حاشیہ نمبر ۱

[۳] سوانحات، ج ۱، ص ۳۸۶

کا طوفان ظاہر کیا۔ علی الخصوص بندہ جوان جناب سے عشق رکھتا تھا ان کے فراق کا صدمہ سوہان روح ہو گیا۔ دل بیتاب شغل گریہ وزاری سے ایک دم خالی نہ تھا۔ جس وقت میں گلستان ارم میں داخل ہوا تو بڑے صاحب سے گفتگو ہوئی۔ اب اس مسیر خلد کو کس نام سے یاد کرنا چاہیئے۔ میں نے کہا میرے جد امجد کا لقب فردوس منزل تھا۔ اس بلبل جناں کو (جنت مکاں) کہنا چاہیے۔''[۱]

مقبرہ کی تعمیر کے سلسلے میں کمال الدّین حیدر کہتے ہیں:

''دس لاکھ روپیہ کا ارشاد ہوا کہ جمع خزانہ عامرہ سے سات لاکھ میں تعمیر مقبرۂ سبطین آباد حضرت جنت مکان اور تین لاکھ روپیہ کا نوٹ گورنمنٹ مصارف مقبرہ لے لو۔''[۲]

مگر خود سلطان عالم خریداری نوٹ کا تذکرہ نہیں فرماتے اس لئے کمال الدین حیدر کے بیان کی تصدیق نہیں ہوتی۔ لکھتے ہیں:

''مبلغ دس لاکھ روپیہ حضرت جنت مکان کے مقبرے کی تیاری کے واسطے خزانہ عامرہ سے علی خاں پدر رضا خاں کو نجیب الدولہ بہادر کے خطاب اور سکندری پلٹن کی کمیدانی پر سرفراز تھا، عنایت اور ان کی ہمراہی میں اس کی تیاری اور کارفرمائی کے واسطے بشیر الدّولہ بہادر کو بھی حکم ہوا۔''[۳]

بہر حال مقبرہ اور عزاء خانہ تعمیر ہو کے سبطین آباد سے نامزد ہوا۔ یہ امجد علی شاہ کے آباد کردہ محلے حضرت گنج میں واقع ہے۔ آرام گاہ ظل اللہ، سے سال تکمیل برآمد ہوتا ہے۔

## زہر خورانی

بھٹنا گر نے مس سڈنی ہے کا حسب ذیل بیان اس کی کتاب 'ہسٹارک لکھنؤ' سے نقل کیا ہے:

---

[۱] محل خانہ شاہی، ص ۱۲۴

[۲] سوانحات، ج ۱، ص ۳۸۶

[۳] محل خانہ شاہی، ص ۱۲۶

''پھوڑے کی اذیت میں مبتلا بادشاہ کو ضرور زہر دیا گیا۔ غالباً کسی معالج نے ایسے شخص سے رشوت لے کر یہ حرکت کی جسے ان کی موت سے سب سے زیادہ فائدہ ہونے والا تھا۔''[۱] ترجمہ

لیجئے! باپ کے ساتھ ہمدردی کی آڑ میں بیٹے کے کردار کو بھیانک طور پر مشکوک کرنے کا موقع مس صاحبہ نے تلاش کرلیا۔ لیکن انھوں نے جو پیمانہ پیش کیا ہے اس کی معقولیت میں شک نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا یہ دیکھ لینا چاہیے کہ بادشاہ کی موت سے زیادہ فائدہ جانشین کا ہوتا تھا یا ایسٹ انڈیا کمپنی کا۔ برڈ کہتے ہیں:

''کسی ولی عہد کی مسند نشینی ان مواقع میں سے ایک موقع ہوتی تھی جب کمپنی اپنی حالت سدھارنے سے نہیں چوکتی تھی۔''[۲]

ٹی پی چند نے کمپنی کی اس ذہنیت پر زیادہ بہتر روشنی ڈالی ہے۔ رقمطراز ہیں:

''اس سرسری بیان سے یہ بات واضح ہوگئی کہ جب سے انگریزوں کا اودھ سے تعلق ہوا ہر نئے حکمراں سے ان کا ایک نیا معاہدہ ہوا جس کے ذریعے یا تو امدادی رقم میں اضافہ ہوا یا اودھ کے اندرونی معاملوں میں اختیار کا انگریزوں کے سیاسی کنٹرول، اور اندرونی معاملات میں ان کی حد سے بڑھی ہوئی دخل اندازیوں نے سلطنت کو کمزور کردیا اور ایک سیاسی و اقتصادی بحران کو جنم دیا۔ اودھ کے حکمراں بے یار مددگار اپنی سلطنت کے انحطاط کو دیکھتے رہے۔ کرنل سدرلینڈ نے بجا طور پر یہ رائے قائم کی ہے کہ ہندوستان میں کوئی اور ریاست ایسی نہ تھی جس کی حکومت میں ''ہم نے اتنی منظم اور اتنی ہی فضول دخل اندازی کی ہو جیسی کہ اودھ کے ساتھ کی۔''[۳]

ان سب سے بالاتر یہ کہ اگر زہر خورانی میں واجد علی شاہ کا ہاتھ ہوتا تو فقیہان فرنگ

---

[۱] اودھ انڈر واجد علی شاہ، ص ۹، حاشیہ ۱

[۲] اودھ کی لوٹ، دوسرا باب، ص ۱۳

[۳] دی ایڈمنسٹریشن اودھ، ص ۹

اسلامی وراثت کے قانون سے ناواقف نہ تھے فوراً مسئلہ منع ارث کی ڈھال لے کر کھڑے ہوجاتے کہ اپنے باپ کا قاتل بیٹا، مقتول باپ کا وارث کیسے ہوسکتا ہے اس طرح کی دلیل سے وہ فائدہ اٹھا چکے تھے۔ نصیر الدّین حیدر شاہ مرحوم کی وراثت سے شہزادہ منا جان کو محروم کرنے کے بعد ان کے چچا نواب شمس الدولہ کو محروم رکھنے کے لئے مسئلۂ حجب کی صفاء دے کے محمد علی شاہ کو وارث شرعی ثابت کیا گیا تھا۔[1]

مادہ تاریخ وفات مدرسہ سلطانیہ کے ایک مدرس اعلیٰ مولانا سید احمد علی محمد آبادی نے ''عطر اللہ مضجعہ، سے برآمد کیا۔''

اب ہم کو امجد علی شاہ کے وزیر اعظم امین الدولہ اور ان کے بعد سلطان العلماء مولانا سید محمد صاحب کا حال دیکھ لینا چاہیے جس کے بغیر امجد علی شاہ کی تقدیر و تعیین مکمل نہیں ہوسکتی اور سب سے آخر میں اس دور سلطنت پر الزامات واتہامات کا جائزہ لینا ہے اور اس ضمن میں تاریخ نگاری میں انگریزوں کی کارستانی کا نظارہ کرنا ہے۔ اب آیئے امین الدولہ کی طرف ملتفت ہوں۔

❑❑

---

[1] واجد علی شاہ اور اودھ راج کا پتن، ص ۵۰

# اَمِیۡنُ الۡمِلّٰةِ وَالدِّیۡن

بجا آر در حق محسن سپاس
که شکر خدا نیست بے شکر ناس

که در ملک و دولت امین ست او
خداوند دنیا و دین است او

زبس خلق از دستش آرام یافت
چه خاص وچه عام ازوے انعام یافت

من احسان او را چه احصا کنم
مگر شرح کشافی انشا کنم

مفتی میر عباس سیدؔ



امین الدولہ امداد حسین خاں

(۶)

# امداد حسین خاں (امین الدولہ)

## ابتدائی حالات

جب مولوی امداد حسین خاں سلطنت اودھ کی وزارت عظمیٰ پر فائز ہو کے ''رکن رکین خلافت و جہانداری، اعتقاد سلطنت وشہر یاری، زبدۃ الامراء، مدارالمہام، وزیرالمما لک امین الدّولہ، عمدۃ الملک امداد حسین خاں بہادر ذوالفقار جنگ یار وفادار سپہ سالار فدوی خاص جاں نثار محمد امجد علی شاہ خلد اللہ ملکہ وسلطنتہٗ'' ہوئے[۱] اس وقت کے حالات تو تفصیل سے ملتے ہیں۔ خاندانی حالات بھی منشی مظفر علی اسیرؔ نے اپنی مثنوی 'معارج الفضائل' میں اور پھر اپنے خودنوشت حالات میں ذکر کئے ہیں۔ لیکن ابتدائی حالات کہیں تفصیل سے میری نظر قاصر سے نہیں گزرے۔ متفرق بیانات جو ادھر ادھر بکھرے پڑے ہیں وہ جہاں تک دستیاب ہوسکے انہیں پر بھروسہ کرنا پڑ رہا ہے۔

اسیرؔ کے بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ امین الدولہ کے اجداد فرخ آباد کے امراء وشرفا میں تھے اور بنگش دربار میں ذی عزت مناصب پر فائز رہے۔ آپ ان کا حال اسیرؔ کے منظوم بیان میں ملاحظہ فرمائیں:

جد ان کے جو اعلیٰ ہیں باعزو شاں — وہ ہیں قوم بنگش سے شہباز خاں
حکومت کا ساماں خدا داد تھا — وطن کشور فرّخ آباد تھا

---

[۱] شیخ تصدق حسین، مضمون الواعظ لکھنؤ بابت ستمبر ۱۹۴۲ء، ص، ۱۶

وہ نواب جن کا کہ احمد تھا نام چو، جاں قوم بنگش میں ذی احترام
یہ مختار تھے ان کی سرکار میں معزّز مکرم تھے دربار میں
خدا نے دیئے تین ان کو پسر شجاعت میں جرأت میں تھے شیر نر
اگر ایک کا نام بازید خاں تو تھے خان منگل بھی یکتا جواں
شجاعت سے خاں کا جو ہو الیتام تو فرزند ثالث کا روشن ہو نام
سوا ان کو سب سے لیاقت ملی انہیں کو پدر کی ریاست ملی
گئے خان احمد جو زیر زمیں ہوا ان کا فرزند مسند نشیں
عیاں نام اس کا بھی ہو بے درنگ جو لفظ مظفر سے باہم ہو جنگ
خلل دیکھ کر رنگ دربار میں یہ آئے نجف خاں کی سرکار میں
ہوئے اکبر آباد کے قلعہ دار ملا توپ خانہ کا بھی اقتدار
کئے کارشایاں بحسنِ تمام ہوئے ان کے گھر میں مدار المہام
سنو! ان کی اولاد کا بھی شمار پسر تین تھے، بیٹیاں ان کے چار

اس کے بعد لڑکیوں اور دامادوں کا ذکر چند اشعار میں کر کے بیٹوں کا حال بیان کرتے ہیں:

جہاں سے گئے لاولد دو پسر عیاں پور ثالث سے نام پدر
ملے بخش سے خاں تو ظاہر ہو نام جو آخر بہادر، تو اوّل مسام
وہ خان بہادر بڑے ذی وقار فلک شاں، فلک قدر، عالی تبار
کہ وہ خان ذیشان فلک احترام کہ ہے نام میں جن کے بخش و امام
سوئے لکھنؤ آئے تھے ایک بار کہ تھا آصف الدّولہ کا اقتدار
علاقہ انھیں آیا کڑہل کا ہاتھ ہوئے ناظم الملک شوکت کے ساتھ
ہوئے ان کے دو پور عالی نژاد کہ ہے جن سے سرسبز نخلِ مراد
کلاں خان والا کے جو نور عین وہ خان بہادر عطائے حسین
ملے لفظ دولہ سے گر اعتبار وہ نام خطابی بھی ہو آشکار

خلف دوسرے ان سے سن میں جو کم     تو ممدوح نواب عالی ہمم
ہوئی ان کی تائید رب دست گیر     خدا نے کیا ان کو اعظم وزیر[۱]

اس کے بعد اسیرؔ نے خود امین الدّولہ کے فضائل شروع کر دیئے ہیں اور ان کے لکھنؤ آنے کے جو حالات نظم کئے ہیں وہ درست نہیں معلوم ہوتے۔ بہر حال کڑہل کی نظامت کے بعد امام بخش خاں، سعادت علی خاں کے سب سے چھوٹے فرزند نواب جلال الدولہ شجاع الملک مرزا مہدی علی خاں شجاعت جنگ کے یہاں تیر اندازی سکھانے میں ملازم رہے۔[۲]

امداد حسین خاں کی تاریخ پیدائش معلوم کرنے میں کامیابی نہیں ہوئی ابتدائی تعلیم کے بارے میں بھی کوئی تفصیل دستیاب نہیں ہوئی مگر ان کے بعض اساتذہ کے نام ملتے ہیں جن سے تعلیمی حالت کا ایک سرسری اندازہ ضرور ہوجاتا ہے۔ امداد حسین خاں کے ایک استاد میر باقر علی تھے جنھیں اپنی وزارت کے زمانے میں میر حسن علی لندنی مصلح الدولہ کی برطرفی کے بعد ریذیڈنسی میں وکیل شاہی مقرر کرایا اور حفیظ الدّولہ کا خطاب دلوایا تھا۔[۳]

ایک اور استاد مولانا حافظ علیم اللہ نگرامی[۴] تھے حکیم سید علی اکبر کشمیری نے اپنی کتاب سبیکۃ الذہب میں دعویٰ کیا ہے کہ امین الدولہ نے مجھ سے بہت سی فقہ اور کلام کی کتابیں پڑھی ہیں۔[۵]

قیاس کا قرینہ ہے کہ ان کو ابتدائی تعلیم میر باقر علی نے دی ہوگی۔ جس کے بعد امداد حسین خاں نگرام گئے ہوں گے اور وہاں حافظ علیم اللہ صاحب کے سامنے زانوئے ادب

---

۱ معارج الفضائل، ص ۱۰۳
۲ شیخ تصدّق حسین مضمون الواعظ ستمبر ۱۹۴۰، ص ۱۶
۳ سوانحات سلاطین، ج ۱، ص ۳۸۴
۴ مولانا یونس نگرامی ندوی مضمون ضمیمہ قومی آواز لکھنؤ مورخہ، ۹ فروری، ۱۹۷۵
۵ ص، ۷۷

تہ کر کے معقولات اور دوسرے علوم کی تحصیل کی ہوگی۔ کیونکہ میر باقر علی ایسے صاحبان علم میں نہیں پائے جاتے جن کے یہاں متوسطات یا منتہیات کی تعلیم ہوسکتی رہی ہو ورنہ ضعیف العمری یا پختہ سالی میں حکیم علی اکبر کشمیری سے فقہ اور کلام کی تحصیل کی ضرورت نہ پڑتی۔ کیونکہ مولانا کشمیری فرماتے ہیں قد قراء علیّ فی عزلہ[۱] اس کے دو معنی ہوسکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ انھوں نے اپنے زمانۂ معزولی میں مجھ سے پڑھا یا تنہائی میں مجھ سے پڑھا۔ اگر زمانہ معزولی میں پڑھا تو ضعیف العمری میں کوئی شک نہیں اور اگر تعلیم میں پردہ داری برتی گئی تو بھی یہ پختہ سالی ہی کی عمر ہوسکتی ہے۔ لیکن قیاس کا زبردست قرینہ یہی ہے کہ حکیم اکبر کشمیری سے انھوں نے وزارت سے برطرفی کے بعد ہی اکتساب کیا ہوگا اس قیاس آرائی کے دو سبب ہیں۔ ایک تو یہ کہ اگر یہ تلمذ بہ صیغۂ راز تھا تو مولانا میں اسے فاش کرنے کی حالت نہ تھی کیوں کہ حکیم صاحب امین الدّولہ کے ورثاء کے بھی بڑے نیاز مندوں میں معلوم ہوتے ہیں اور اسی طرح ان کا ذکر کرتے ہیں۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ حکیم صاحب امین الدولہ جو حلیہ بیان کرتے ہیں وہ ان کے مجروح ہونے کے بعد کا ہے ''ان کا بایاں ہاتھ کمزور اور جھولا ہوا تھا''۔[۲]

اس لئے یہی ماننا چاہیے کہ حکیم علی اکبر سے اکتساب اس زمانہ کا واقعہ ہے جب امین الدولہ وزارت سے سبک بار ہو کے فرصت کی زندگی گزار رہے تھے اور اپنی دینداری اور علم دوستی کی وجہ سے حدیث فقہ اور کلام کی تکمیل کر رہے تھے کیونکہ معقولات میں تکمیل کر چکے تھے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ واجد علی شاہ کو انھوں نے میزان الطب اور شرح اسباب کا سبق دیا تھا۔

امین الدولہ کی دینداری کے ثبوت ان کی تعمیر کردہ کربلا کے علاوہ اور اور بہت سے ملتے ہیں۔ حکیم علی اکبر بیان کرتے ہیں:

''موصوف ہر سال اپنے اموال کی زکوٰۃ اور نذر و نیاز کا روپیہ سید العلماء مولانا سید

---

[۱] سبیکۃ الذہب، ص ۷۸-۷۷

[۲] وہی، ص ۷۸

حسین صاحب کی خدمت میں روانہ کیا کرتے تھے۔ ہر پنجشنبہ کو سید العلماء کے مختار میر محمد حسین ایک فرد لے کر آتے تھے جس میں مستحقین فقراء کے اسماء ہوتے تھے اور نواب ان کے لئے پانچ سو روپئے عطا کیا کرتے تھے۔ اپنی ہر بنا کردہ مسجد میں امام جماعت اور موذن مقرر کر رکھا تھا۔''[۱]

امین الدولہ نے علمی خدمات کے بھی پائیدار آثار یادگار چھوڑے ہیں۔ جناب مفتی میر عباسؒ کو افضلیت سرور انبیا میں اپنی فارسی کتاب 'نصر المومنین' کی تصنیف کا خیال امین الدولہ کی ہی گفتگو سے آیا تھا۔ مفتی صاحب امین الدولہ کے زبردست مداح ہیں۔ ان کی مداحی شاعرانہ مبالغہ نگاری نہیں، شہادت عادل کا رتبہ رکھتی ہے۔ یہ اعتراف فضائل نظم ونثر میں کثرت سے ہیں آپ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

نہ تنہا قشونش سپاہی بود معینش جناب الٰہی بود
حصیر مساجد حصارش بود دل اہل دل قلعہ دارش بود
ز بس گشتہ ز وار با کام جاں سوئے منزل مقصد خود رواں
بشب نعرہ در دشت و ہاموں زنند کہ بر دشمنانش شبے خوں زنند
شکستے کہ از بہر اعدائے اوست نہ دشمن خبر دارد از وے نہ دوست[۲]

جس دور میں علمی سرگرمیوں نے تحریک کی شکل اختیار کر لی ہو اس کے لئے یہ طے کرنا کہ کس تصنیف یا تالیف میں سرکاری حمایت یا اعانت شامل ہے بہت دشوار کام ہے لیکن ایک کتاب کے بارے میں لکھنؤ کے علمی ماہنامے ''الواعظ'' کا یہ نوٹ قابل ملاحظہ ہے:

''امین الدولہ کے آثار باقیہ میں اس وقت ایک کتاب ''اعمال الصالحین'' بھی موجود ہے جو اردو کا قدیم شاہکار ہے۔ اس کتاب کو وزیر موصوف نے اپنے دربار کے فاضل اہل قلم سیّد مصطفی ابن مولوی سید علی اصغر صاحب سے فرمائش کر کے مرتب کرایا

---

[۱] نصر المومنین، ص ۳
[۲] سبیکۃ الذہب، ص ۷۹-۷۸

تھا۔ اس زمانہ میں اہل علم کے لئے اردو میں تالیف وتصنیف کا کم شغل تھا جو قلم اٹھاتا تھا وہ فارسی یا عربی میں، نواب نے حکم دیا کہ ایک کتاب اعمال ماہ محرم وصفر اور نوافل پنجگانہ میں بزبان اردو ایسی تالیف کی جائے جن کو عوام اور عورتیں بھی سمجھیں اور بہ آسانی پڑھ لیں۔ اس تالیف میں مولف نے اپنی عرق ریزی کا پورا اجر نواب موصوف کے لئے قرار دیا ہے۔''[1]

معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کے مولف وہی سید مصطفی ہیں جنھیں شیخ تصدق حسین نے امین الدولہ کا داروغہ کتب خانہ بتایا ہے۔ کتب خانے کی نسبت کوئی تفصیل تو نظر قاصر سے نہیں گزری لیکن داروغہ کتب خانہ کا ہونا بجائے خود اس بات کا شاہد ہے کہ امین الدولہ اچھے خاصے ذخیرۂ کتب کے مالک تھے۔ امین الدولہ کا یہی علمی ذوق اور دینی رجحان انھیں معلمی کے پیشے کی طرف لے گیا اور معلمی نے مسند وزارت تک پہونچایا۔

امداد حسین خاں کا تعلق دربار اودھ سے امجد علی شاہ کے صاحبزادوں کے معلم واتالیق کے طور پر ہوا۔ ڈاکٹر صفی احمد کو کمال الدین حیدر کی عبارت سمجھنے میں مسامحہ ہوا۔ اس لئے وہ امداد حسین خاں کو امجد علی شاہ کا استاد بتاتے ہیں دراصل وہ واجد علی شاہ اور ان کے بھائی کی تعلیم کے لئے مقرر ہوئے تھے۔ کمال الدین نے بھی یہی لکھا ہے اور شیخ تصدّق حسین کسی قدر ربط کے ساتھ یہی بتاتے ہیں:

''امداد حسین خاں اولاً شہزادہ مرزا سلیماں شکوہ کے یہاں بطور معلم ملازم ہوئے پھر سلطان عالم واجد علی شاہ اور ان کے چھوٹے بھائی سکندر حشمت مرزا جواد علی و دیگر شہزادگان کی تعلیم پر آغاز سلطنت حضرت محمد علی شاہ میں مامور ہوئے۔ بعد اس کے رفتہ رفتہ ولی عہد سلطنت ثریا جاہ مرزا امجد علی خاں کے دل میں جگہ کر کے ان کے رفیق خاص ہو گئے۔ امابعد محرم راز ہو کر داروغہ کاروبار ہوئے تنخواہ میں بتدریج اضافہ ہوتا گیا۔ وقار بھی بڑھا۔ صاحب سواری بھی ہوئے۔ روز سیوم محمد علی شاہ ان کے فرزند وجانشین نے

---

[1] ماہ نامہ الواعظ لکھنؤ، ستمبر، ۱۹۴۶ء، ص ۲۰۷۱

ان کو امین الدولہ امداد حسین خاں بہادر ذوالفقار جنگ خطاب دے کر سر بلند کیا اور خلعت ہاتھی پالکی جھالر دار، شمشیر ولایتی سے بھی سرفراز فرمایا اور بروقت چائے پانی کرسی نشینی کی اجازت ملی اور زمرۂ امراء میں شریک ہار و عطر رخصتی ہوئے۔"[۱]

اس سے پہلے کہ ہم امین الدولہ کی وزارت کی طرف متوجہ ہوں ایک سبق آموز واقعہ کی یاد تازہ کر لیں۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی فرماتے ہیں، ذکر واجد علی شاہ کی تعلیم و تربیت کا ہے:

"جب یہ بچہ (واجد علی شاہ) سن تمیز کو پہنچا تو نواب امین الدولہ امداد حسین خاں اس کے اتالیق مقرر ہوئے۔ وہ ایک سنجیدہ، ثقہ اور دیندار آدمی تھے اور اسلامی شرع کے مطابق ناچ گانے کو حرام سمجھتے تھے مگر مرشد زادہ کو بچپن ہی سے ناچنے گانے کا بیحد شوق وہ سبق پڑھتے وقت اکثر تال کے ساتھ اپنے پیروں کو حرکت دیا کرتا تھا استاد نے کئی دفعہ منع کیا۔ جب مرشد زادہ اس حرکت سے باز نہ آیا تو ایک دن غصّہ میں ایک طمانچہ کنپٹی پر اس زور سے مارا کہ ادھر کے کان سے کچھ کم سنائی دینے لگا۔ ایک معتبر راوی سے سنا ہے کہ واجد علی شاہ استاد کی اس عنایت کا کبھی کبھی ذکر کیا کرتے تھے۔"[۲]

اس واقعہ سے اس بات کی طرف ذہن جاتا ہے کہ امین الدّولہ سے سلطان عالم کے تکدر کی وجہ سے یہ طمانچہ بھی ہوسکتا ہے جو انھیں اپنی گراں گوشی کے احساس کے ساتھ ہمیشہ یاد رہتا ہوگا۔ امین الدولہ کے دوسرے حالات کے بیان کو موخر کر کے اب ہمیں ان کے دَورِ وزارت کو دیکھ لینا چاہیئے۔

امین الدولہ، شرف الدولہ محمد ابراہیم خاں بہادر کے جانشین ہوئے، ان کی سبکدوشی کے اسباب کی تفصیل آگے آتی ہے۔ کیونکہ سبکدوشی کے اسباب کو سمجھنے کے لئے ہمیں شرف الدولہ کے تقرر اور اس کے بعد کے حالات دیکھنا ہوں گے۔ جب اپنے چوتھے وزیر نواب

---

[۱] ماہنامہ الواعظ لکھنؤ ستمبر، ۱۹۴۶ء، ص، ۱۶۔
[۲] لکھنؤ کا شاہی اسٹیج، ص ۶۶

مَنّورالدّولہ احمد علی خاں کی دوسالہ کارگزاری سے محمد علی شاہ بالکل مایوس ہو گئے تو ریذیڈنٹ کالفلیڈ کی موجودگی میں انھوں نے منورالدولہ سے مطالبہ کیا کہ یا تو وزیر نظم و نسق میں اصلاح کریں یا عہدہ خالی کردیں۔[۱]

جب اصلاحات کے نفاذ میں منورالدّولہ ناکام رہے۔ مال گذاری بقایا میں پڑنے لگی اور ریاست کا نظم و نسق بگڑنے لگا تب منورالدولہ نے بادشاہ کا دوسرا مطالبہ تسلیم کرلیا اور سفر زیارت عتبات عالیات کے حیلے سے وزارت سے الگ ہو گئے۔[۲]

منورالدولہ کے ہٹ جانے کے بعد بادشاہ اور ریذیڈنٹ میں مختلف اشخاص کی صلاحیتوں کے بارے میں جو اس منصب کے لئے موزوں ہو سکتے تھے تبادلۂ خیال ہونے لگا اور بقول ڈاکٹر صفی احمد سات نام زیر غور آئے۔ روشن الدولہ، مرزا حاجی، سبحان علی خاں، تاج الدّین حسین خاں، مفتی خلیل الدین خاں، شرف الدولہ، محمد ابراہیم خاں، آخر میں جب سب نام کسی نہ کسی وجہ سے مسترد ہو گئے تو یہ طے ہوا کہ ولی عہد (ثریا جاہ امجد علی خاں) کو وزیر اعظم اور شرف الدولہ محمد ابراہیم خان ان کے ڈپٹی مقرر کئے جائیں اور ۲۴ر جولائی ۱۸۴۰ء کو اس تجویز پر عملدرآمد ہو گیا۔[۳]

بدنصیبی سے تعاون عمل کے بجائے وزیر اور ڈپٹی میں کشاکش اور گروہ بندی ہونے لگی اور اس میں ڈپٹی کا پلہ بھاری ہونے لگا اور عملاً سارا کاروبار شرف الدولہ انجام دینے لگے اور صورت حال میں اتنا الجھاؤ پیدا ہوا کہ کرنل جان لو ریذیڈنٹ نے چھٹی سے آنے کے بعد دونوں سے اتحاد عمل کی فرمائش کی۔[۴]

لو کے خط کا اقتباس آگے آئے گا۔

---

[۱] ٹوکنگس آف اودھ، ص ۶۳
[۲] ٹوکنگس آف اودھ، ص ۲
[۳] وہی، ص ۳۳
[۴] وہی، ص ۲۹

مگر صورت حال میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی یہاں تک کہ محمد علی شاہ کا چراغ حیات گل ہو گیا۔ معلوم نہیں کہ شرف الدّولہ کس ذہنی کیفیت میں مبتلا یا کن اثرات کا شکار تھے کہ انھوں نے امجد علی شاہ کی تخت نشینی کے بعد حد درجہ مجہول رویہ اختیار کیا۔ یعنی نہ انھوں نے بادشاہ سے اپنے روابط ہموار کرنے کی ضرورت محسوس کی اور نہ رضا کارانہ طور پر عہدہ خالی کر دینے کی۔ بادشاہ کے ریذیڈنٹ کے بار بار اصرار کے باوجود تین مہینے تک انتظار کر کے امین الدولہ کو خلعت پیش دستی دیا۔[1]

## وزارت

یہ واقعہ ۹/رجب ۱۲۵۸ء مطابق ۱۷/اگست ۱۸۴۲ء کا ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ تخت نشینی کے بعد جس دن امداد حسین خاں کو خطاب و اعزاز ملا تھا، اسی دن اپنی مادر محترمہ ملکہ آفاق کے رشتے کے بھائی میر عنایت علی کو معین الدولہ کا خطاب اور دوسرے اعزاز دیئے تھے۔ امین الدولہ کے تقرر کے ساتھ امراء و حکام کا جو نیا بندوبست ہوا اس میں معین الدولہ اپنے حسب دل خواہ جگہ نہ پا سکے۔ معین الدولہ کو ملکہ آفاق کی زبردست حمایت حاصل تھی اور بادشاہ کو ماں کا نہایت احترام ملحوظ تھا۔ اس لئے معین الدولہ وزیر کو کب خاطر میں لاتے اور ان کے لئے دردسر بنے رہے، ایک دوسرے عہدیدار میر احمد علی جو امجد علی شاہ کی ولی عہدی میں داروغہ دیوان خانہ ہوئے تھے، پہلے امین الدولہ کے بڑے دوستوں میں تھے۔ لیکن اب وہ بادشاہ کے اتنے مقرب ہوئے کہ وزیر سے کھٹک گئی۔ مگر وہ مخبوط الحواس ہو گئے اور خودکشی کر لی۔ لیکن معین الدولہ نے اپنی چول ریذیڈنسی کے ساتھ بٹھائی۔ امین الدولہ نے صورت حال کی اصلاح کے خیال سے معین الدولہ کو اپنا ڈپٹی مقرر کیا۔ یہ تدبیر بھی دیر پا ثابت نہیں ہوئی اور امین الدولہ نے تنگ آ کر اپنا استعفا لکھ کے معین الدولہ کے حوالے کر دیا اور بقول کمال الدین حیدر:

---

[1] سوانحات، ج۱، ص، ۲۷۳

''انھوں نے خوب نون مرچیں لگا کر بادشاہ کو گزرانا۔''[۱]

آگے کی داستان کچھ قطع و برید کے ساتھ کمال الدین حیدر کے ہی بیانات سے ماخوذ ہے:

''صبح روز[۲] سہ شنبہ یازدہم شہر ذیقعدہ ۱۲۵۹ھ نواب امین الدولہ نے اپنی بے خبری سے پوشاک دربار طلب کی۔ دفعتاً مرزا وصی علی خاں نے عرض کی کہ رات کو حکم بادشاہ پہونچا معین الدولہ کو کہ امین الدولہ بے اجازت سوار نہ ہوں سب کو معلوم ہوا کہ نواب صاحب خانہ نشین ہوئے فقراء و مساکین جو تحسین گنج سے در دولت تک آس لگا کر بیٹھے تھے اتنی دور میں پانچ روپئے خیرات ہوتے وہ سب بیچارے مایوس ہو کر اٹھ گئے۔ دوسرے دن چوبدار سلطانی خزانۂ عامرہ سے تنخواہ نواب لاکر دے گیا۔ تیسرے دن بادشاہ کو پرچہ اخبار گزرا کہ نواب نے مفارقت قدم مبارک سے کھانا نہیں کھایا ہے۔ بادشاہ نے خوان اونش اور ایک پرچہ ایک سطر سے دستخط' مربی بیارد و مربیٰ بخور' ایک اچاری مربّا بھی عنایت فرمائی اور فرمایا کہ منصوبی و معزولی ہماری مرضی پر موقوف ہے، تم اطمینان سے گھر میں بیٹھے رہو۔ نواب نے اس کا ادائے شکر کیا اور جانا کہ بادشاہ کو میرا خیال مرکوز خاطر ہے۔ اب جان میری دشمنوں سے بچے گی۔ نواب نے عرض داشت اپنے قیام دواب کے واسطے بھیجی کہ اب خانہ نشینی میں اس کا خرچ مجھ پر بار ہے۔ امیدوار ہوں کہ داخل دواب سرکار ہوں ارشاد کیا کہ تم پھر نہ سوار ہوگے؟ اس ارشاد سے زیادہ تقویت ہوئی۔ بادشاہ کو چھ لاکھ روپئے قبل از خانہ نشین گزرانے کا یہ حضور کی بدولت حاصل ہوا ہے۔ یہ مال سرکار ہے۔ اپنی دیانت اور امانت ظاہر کی۔ حالانکہ تین لاکھ علیحٰدہ رکھ لئے تھے۔ اس میں سے بادشاہ نے لاکھ روپئے تعمیر عمارت کو عنایت فرمائے۔ جب بادشاہ نے دیانت امین الدولہ کا ذکر صاحب ریذیڈنٹ سے کیا جواب دیا کہ اگر وہ مال

---

[۱] سوانحات، ج ۱، ص ۳۶۷

[۲] رجب علی سرورؔ نے یہ تاریخ ۹؍ ذیقعدہ بتائی ہے۔ فسانۂ عبرت، ص ۷۰۔ چونکہ فسانۂ عبرت کی تازہ طباعت سے پہلے پروفیسر مسعود حسن رضوی مرحوم نے تاریخوں پر نظر تصحیح ڈالی ہے اس لئے یہی تاریخ درست ہے۔

سرکار کو بڑھاتے تو اس سے دیانت ثابت ہوتی ہے مگر اس میں احتمال شق ثانی ہے۔''[۱]

آپ ملاحظہ فرمائیں حضرت کمال الدین حیدر نے تین لاکھ کی بد دیانتی کا الزام اتنے وثوق سے جڑ دیا کہ جیسے رقوم تغلب کا سیاہہ انھیں کے ہاتھوں ہوتا تھا۔ بچارے کوئی موقع جس میں بادشاہ یا وزیر کو رسوا کر سکیں، چھوڑنا نہیں چاہتے یہاں امین الدولہ کی بد دیانتی ظاہر کرتے ہیں۔ اس سے پہلے آپ ملاحظہ فرما چکے کہ روشن الدولہ اور غازی الدین حیدر کے ذکر میں اس پر کہ ایک لاکھ ہی دیئے، کل کے کل نہیں بخش دیئے۔ اعتراض فرما چکے ہیں اور اسے وقت کی تاثیر (بد)[۲] سے تعبیر کیا ہے۔

اس طرح امین الدولہ بہادر سبکدوش تو ہو گئے مگر معین الدولہ کی مراد نہیں بر آئی۔ ریذیڈنسی سے ان کی لاکھ موافقت سہی مگر وفاداری وتقرب میں وہ منورالدولہ کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ منورالدولہ سو فیصدی ریذیڈنسی کے اپنے آدمی تھے یہ ان کا موروثی گن تھا۔ حکیم مہدی کی صلاحیتوں سے زیادہ ان کی کامیابی کا مدار ریذیڈنسی کے ساتھ ان کے نیازمندانہ تعلقات پر تھا۔ جب منورالدولہ ان کو سمجھاتے تھے کہ ''آپ کی طرف سے بادشاہ بہت بدگمان ہو گئے ہیں خدا خیر کرے اب غافل نہ رہنا چاہیئے۔ اس کا جواب دیتے تھے کہ تم لڑکے ہو اگر بادشاہ مجھے موقوف کر دیں گے ان کی سلطنت بھی مٹ جائے گی۔''[۳]

سلطنت مٹا دینے کی تدبیر بھی ہو رہی تھی مگر لارڈ ولیم بنٹینگ نے اس میں بہت دلچسپی نہیں لی۔ ریذیڈنٹ نے زہر دلا کے اپنا کام بھی نکال لیا اور بادشاہ کی بھی پردہ پوشی کر دی۔

منورالدولہ میں اگر چچا کی فہم وفراست، حالات کی نبّاضی اور چارہ گری رہی بھی ہو گی تو افیون کی چسکیوں سے تحلیل ہو گئی ہو گی۔[۴] انگریز بھگتی میں وہ سپوت ثابت ہوئے اور ۸/دسمبر

---

[۱] سوانحات، ج ا، ص ۳۶۶، ترجمہ اردو

[۲] سوانحات، ج ا، ص ۲۵۹

[۳] وہی، ص ۳۴۰

[۴] راجہ درگا پرشاد مہر سندیلوی تاریخ اجودھیا، ص ۹۹

۱۸۴۲ء کو خلعت وزارت سے مشرف ہوئے۔

ریذیڈنسی کے فیض سے معین الدولہ اور منورالدّولہ کی پٹری جم گئی لیکن یہ حدیقہ امید زیادہ بار آور نہیں ہوسکا۔ مئے خانہ یورپ کے انداز نرالے ہیں اس لئے اگر نتائج امید نکلیں تو حیرت و استعجاب کا محل نہیں۔ ایک دن منورالدولہ نے ریذیڈنٹ سے استدعا کی کہ وہ بادشاہ تک معین الدولہ کی کارگزاریاں پہونچادیں ریذیڈنٹ نے فرمائش پوری کی۔[۱]

یہ تیر الٹا پڑا۔ جو سبز باغ معین الدولہ نے دکھایا تھا وہ بھی بے ثمر ثابت ہو چکا تھا۔ لہٰذا اب یہ جوڑی بادشاہ کے لئے نا قابل برداشت ہوگئی۔ معین الدولہ نظامت خیرآباد کے محاسبے میں دھرے گئے اور خانہ قید ہوئے اور چار دن کی چاندنی ختم ہوگئی مگر بادشاہ ابھی منورالدولہ کو سنبھلنے کا موقع دینا چاہتے تھے اس لئے معین الدولہ کی جگہ پر منورالدولہ کے داماد مرزا ابوتراب سرفراز نیابت ہوئے[۲] ڈاکٹر صفی احمد مرزا ابوتراب کو منورالدولہ کا لڑکا بتاتے ہیں۔[۳]

مگر اس میں طباعت کی غلطی کا قوی امکان ہے لیکن منورالدّولہ اس مہلت سے حقیقی فائدہ اٹھا کے دربار اور ریذیڈنسی میں توازن نہ قائم کر سکے اور کم و بیش آٹھ مہینے کے بعد ۱۱/ جولائی ۱۸۴۴ء (۲۴/ جمادی الثانی، ۱۲۶۰ھ) کو معزول کر دیئے گئے۔[۴]

ڈاکٹر بھٹنا گر یہ تاریخ ۲۷/ جون ۱۸۴۴ء بتاتے ہیں[۵] اور ماخذ صفی احمد اور بھٹنا گر دونوں کا ایک ہی ہے یعنی کمال الدین حیدر نے جنھوں نے روز پنجشنبہ آخر شہر جمادی الثانی لکھا ہے۔[۶]

---

[۱] ٹوکنگس آف اودھ، ص ۴۴

[۲] سوانحات سلاطین، ج، ا، ص ۳۸۰

[۳] ٹوکنگس آف اودھ، ص، ۴۴

[۴] وہی، ص، ۴۵

[۵] اودھ انڈر واجد علی شاہ ص ۲

[۶] سوانحات، ج، ا، ص ۳۸۰

مجموعہ صد سالہ جنتری شام لال مطبوعہ لا پریس کان پور بماہ اکتوبر ۱۹۰۶ء (ذخیرۂ پروفیسر مسعود حسن رضوی مرحوم) کی رو سے ڈاکٹر صفی احمد صاحب کی دی ہوئی تاریخ درست ہے۔

## پھر وزارت

کمال الدین حیدر تفصیل یوں بتاتے ہیں:

''اہتمام الدولہ حیدر حسین خاں کی معرفت بادشاہ نے پہلے نواب منورالدولہ سے سکۂ وزارت منگوا بھیجا اسی وقت منورالدولہ جنرل پالک ریذیڈنٹ کے پاس دوڑے صاحب بھی اس خیال میں تھے کہ بے ہمارے صلاح بادشاہ نہ کریں گے ادھر میر حسن علی لندنی سفیر نے پیام شاہی پہونچایا ریذیڈنٹ نے جواب دیا کہ ہم ہفتے کو حضور میں آئیں گے۔ جیسا مناسب وقت ہوگا بالمشافہ عرض کریں گے ادھر سے جواب بھیج دیا گیا کہ مجھ کو آج کے خلعت دینے کو استخارہ خوب آیا ہے اور اس واسطے خلعت میں تامل نہیں ہوسکتا۔''[۱]

اس طرح امین الدولہ دوسری بار مسند نشین وزارت ہوئے۔ ریذیڈنسی کے رد عمل کے بارے میں کمال الدین حیدر کا کہنا ہے کہ ''صاحب بھی امور خانگی سمجھ کے چپ ہو رہے۔''[۲]

یہ دیدہ و دانستہ ریذیڈنسی کی پردہ پوشی اور بیچ ہے یہ تو تصور بھی نہیں ہوسکتا کہ کمال الدین حیدر کے مددگاران تصنیف حقیقت حال سے بے خبر اور انگریزی ریکارڈ سے ناواقف رہے ہوں گے۔ البتہ ڈاکٹر صفی احمد اور ڈاکٹر بھٹناگر جنھوں نے برطانوی ریکارڈ کا اچھا مطالعہ کیا ہے۔ ریذیڈنسی کھلبلی کی پوری تفصیل دیتے ہیں۔ لیکن بھٹناگر صاحب نے برطانوی ریذیڈنٹ کے سکریٹری امور خارجہ کے نام خط کا جو اقتباس دیا ہے۔[۳] اس میں غلط فہمی

---

[۱] وہی، ص ۳۸۱

[۲] سوانحات، ج ۱، ص ۳۸۱

[۳] اودھ انڈر واجد علی شاہ، ص ۲۔۲۱

معلوم ہوتی ہے یا تو یہ دربار کے نام گورنر جنرل کا احتجاج نامہ ہو یا ریذیڈنٹ کا مجوزہ مسودہ ہو، جبھی اس جملے کی کہ ''گورنر جنرل دکھ کے ساتھ اظہار کرتے ہیں'' کی گنجائش نکلتی ہے۔

ڈاکٹر بھٹنا گر ایک ضروری کڑی بھی چھوڑ گئے ہیں۔ یعنی میر حامد علی خاں دہلوی کی مدبرالدولہ منشی جوالا پرشاد کی تجویز سے پیش دستی پر تقرری۔[۱]

صفی صاحب نے سلطان الحکایات کے حوالے سے حامد علی خاں کی برطرفی کی اور سعیدالدولہ کے تقرر کی تاریخ ۲۶ نومبر ۱۸۴۴ء بتائی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حامد علی خاں کی برطرفی اور سعیدالدولہ کی تقرری کے بعد ریذیڈنسی حرکت میں آئی یا سرگرمی بڑھی۔ ڈاکٹر بھٹنا گر نے یہ اقتباس مارچ ۱۸۴۵ء کے ریکارڈ سے لیا ہے۔ اس سے بھی اس خیال کی تقویت ہوتی ہے۔

سعیدالدولہ بھی سال بھر سے زیادہ نہ چل سکے۔ انگریز امین الدولہ کے اس لئے مخالف تھے ہی کہ وہ شرف الدولہ کی جگہ پر مقرر کئے گئے تھے اب منورالدولہ کا بھی ہٹ جانا ناقابل تحمل ہو گیا، پھر بھی اب امین الدولہ کو کام کرنے کا کچھ نہ کچھ موقع ملا۔ ڈاکٹر بھٹنا گر تبصرہ کرتے ہیں:

> ''امین الدولہ نے نظم و نسق میں ضروری اصلاحات کا نفاذ بہ نفس نفیس شروع کیا اب مملکت کی فوج اور انتظامیہ پر ان کو اختیار کلی میسر ہوا۔ لیکن نظم و نسق میں بہت معمولی سدھار ہوا اور مال گذاری کی وصولی بھی باقاعدہ نہیں ہو سکی۔ نواب اپنی ضعیف العمری کے باعث اتنا کمزور ہو گئے کہ عمائد و عوام سب کا اعتماد کھو بیٹھے تھے۔''[۲] ترجمہ

ڈاکٹر بھٹنا گر نے گورنر جنرل کے ساتھ ریذیڈنٹ ڈیوڈسن کی مراسلت کی طرف التفات نہیں کیا کیونکہ ان کی تحقیق کا دائرہ عہد واجد علی شاہ تھا ڈیوڈسن امجد علی شاہ کی زندگی ہی میں واپس چلا گیا تھا۔ لیکن چونکہ وہ امین الدولہ کی کارگزاریوں کا جائزہ لے رہے تھے

---

[۱] سوانحات، ج ۱، ص ۳۸۱

[۲] اودھ انڈر واجد علی شاہ، ص ۲۳

اور وزیر کی حیثیت سے قدر و قیمت متعین کر رہے تھے اس لئے اگر وہ عہد واجدی سے پہلے امین الدولہ کے حالات کا تفصیلی مطالعہ بھی کرتے تو زیادہ مستحکم بنیادیں رائے قائم کرنے کی مہیا ہوسکتی تھیں۔ ڈاکٹر صفی احمد نے چونکہ عہد محمد علی شاہ وامجد علی شاہ پر تحقیقی کام کیا ہے اس لئے انھوں نے ڈیوڈسن کی امین الدولہ کے بارے میں رائے کا تذکرہ کیا ہے اور اس کے خط کے چند جملے نقل کئے ہیں۔ صفی احمد کہتے ہیں:

''ڈیوڈسن نے گورنر جنرل سے اپنی خط وکتاب میں امین الدولہ کی صفائی اس دلیل کے ساتھ پیش کی کہ امین الدولہ کے مشکلات کی اصل وجہ یہ تھی کہ انھیں ریذیڈنٹ کا اعتماد کبھی حاصل نہیں رہا اور اس طرح کی امداد بغیر اودھ میں کوئی نظم ونسق کامیاب نہیں ہوسکتا۔''

ڈیوڈسن نے حالات کے مطالعے سے اپنی رائے قائم کی اور ایک حد تک اپنے پیش روؤں کو معمولی معمولی فروگزاشتوں کے لئے خطاوار ٹھہرایا، اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہ

''معمولی آداب کا دیسی درباروں میں نہ برتا جانا بغض اور سوہان روح کا زیادہ باعث ہوتا ہے۔ بالا دست قوت کے سخت ترین حکام کے جبریہ نفاذ کے مقابلے میں۔''[۱] ترجمہ

ہوسکتا ہے کہ ڈیوڈسن کو برطانوی مفاد کے وقتی مصالح ومطالبات نے اس اظہار حقیقت پر مجبور کیا ہو۔ لیکن اس کے ایک ایک حرف کے سچ ہونے میں شک کی گنجائش نہیں۔ لیکن ڈاکٹر صفی احمد کا ڈیوڈسن کے اس تجزیئے کے بارے میں تبصرہ نہ صرف دلچسپ بلکہ سبق آموز بھی ہے آپ پہلے تبصرہ ملاحظہ فرمایئے:

''اس صفائی کی تائید کسی طرح امین الدولہ کے معاصرین کے بیان سے خواہ وہ غیر ملکی ہوں یا ملکی نہیں ہوتی۔ آرلک ان کے کردار کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ امین الدولہ

---

[۱] ٹو کنگس آف اودھ، ص، ۹-۶۸

بادشاہ کے وزیر اعظم اور مقرب عوام کے نچلے اور پست طبقے سے اٹھ کے اس بلند منصب تک پہونچے تھے۔''[۱] ترجمہ

آیئے اب! تبصرے کی دلچسپی اور سبق آموزی بلکہ عبرت خیزی کا تجزیہ کریں اور دیکھیں کہ عصبیت اور جذباتی انداز نظر معقولیت کا کس درجہ دشمن ہوتا ہے۔ صفی احمد صاحب بڑے وثوق سے فرماتے ہیں کہ ڈیوڈسن کی تائید کوئی معاصر نہیں کرتا لیکن کم و بیش ہر ریذیڈنٹ کی مخالفت کا ذکر خود فرماتے ہیں۔ آپ اسے ایک ایک کر کے ملاحظہ فرمائیں:

☆ امین الدولہ کے پہلے تقرر کے چھ ماہ بعد کرنل شیکسپیئر قائم مقام ریذیڈنٹ کی اس مخالفانہ رائے کا ذکر فرماتے ہیں:

''............ یہ سب باتیں سختی کے ساتھ ان کو (امین الدولہ) اس منصب کے لئے نااہل ٹھہراتی ہیں۔''[۲] ترجمہ

☆ جب منورالدولہ کی معزولی کے بعد (امین الدولہ) کی تقرری ہوئی جنرل پالک ریذیڈنٹ کے ردعمل کا بیان اس طرح کرتے ہیں:

''یہ میرا پختہ عقیدہ ہے کہ امین الدولہ کی دوبارہ تقرری ایک ایسا قدم ہے جو بالکل غلط صلاح پر مبنی ہے اور یہ تقرری نہایت نامسعود ساعت میں کی گئی ہے۔''

☆ پولک کے جانے کے بعد پھر شیکسپیئر آئے ان کی امین الدولہ سے مخالفت بلکہ ضد کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے پھر بھی بیان یہ ثابت کرتا ہے کہ صفی احمد مخالفتوں کے خود راوی ہیں۔ دیکھئے:

''شیکسپیئر کی میعاد عہدہ کے درمیان بادشاہ سے اختلاف کے کئی موقع آئے دوسرا موقع اس فرمان کے نکلنے پر آیا جس کے ذریعے بادشاہ کی طرف سے، ریذیڈنٹ کو پہلے سے اطلاع کئے بغیر وزیر امین الدولہ اور ان کے ڈپٹی کو غیر معمولی اختیارات تفویض

---

[۱] ٹو کنگس آف اودھ، ص، ۹۔۶۸

[۲] وہی، ص، ۴۹

کئے گئے تھے۔''[۱]

یہی موقع تھا جب احتجاجاً بادشاہ کی تخت نشینی کی سالگرہ کے جشن میں شرکت سے ریذیڈنٹ کو روکا گیا تھا۔

☆ چوتھے ریذیڈنٹ کرنل ناٹ تھے، ان کی پالیسی کھلم کھلا مداخلت کی نہیں تھی پھر یہ اس زمانے میں تھے جب کمپنی جنگ میں مبتلا تھی اور اودھ کے دربار کی اعانت کی سخت محتاج تھی اس لئے ان کی کھلی ہوئی مخالفت کا کوئی معاملہ معلوم نہیں ہے۔

آخری ریذیڈنٹ رچمنڈ محض ایک مہینہ کام کر سکے ہوں گے کہ امجد علی شاہ کا انتقال ہو گیا۔ اتنی مختصر مدت میں کسی واقعے کا ظہور نہیں ہوا۔ لے دے کے ایک ڈیوڈسن بچا، جس نے امین الدولہ کی حمایت کی جس کے قول کی تائید کی تلاش خود ان سب بیانات کے بعد بھی ڈاکٹر صفی احمد کو ہے۔ طرفہ تماشہ یہ ہے کہ خود اس کی تصریح کرتے ہیں کہ ''ڈیوڈسن کسی نہ کسی وجہ سے امین الدولہ کا ہمدرد ہو گیا تھا۔''[۲]

ڈیوڈسن کی ہمدردی کا ذکر خود شاہد ہے کہ ڈاکٹر صفی احمد کسی اور ریذیڈنٹ کو امین الدولہ کا ہمدرد نہیں سمجھے۔ لیکن ڈیوڈسن کے بیان کو بے داغ نہیں چھوڑنا چاہتے تھے اس لئے خود فراموشی کر کے یہ تبصرہ کر دیا۔ اتنا ہی نہیں امین الدولہ پر مجموعی حیثیت سے تبصرہ کرتے ہوئے جہاں ان کی نااہلیوں، کا جائزہ پیش کیا ہے وہاں یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ:

''ان کی اصل کمزوری اس حقیقت میں مضمر ہے کہ وہ ریذیڈنٹ کی حمایت حاصل کرنے میں ناکام رہے۔''[۳]

رہا آرلک کا بیان کہ وزیر اعظم امین الدولہ سماج کے پست طبقے کے آدمی تھے یا اسی طرح کی رائے کا پولک ریذیڈنٹ وغیرہ کی طرف سے اظہار، اسیرؔ کے اس بیان کی تردید

---

۱ ٹوکنگس آف اودھ، ص، ۴۵

۲ وہی، ص ۶۷

۳ وہی، ص، ۴۶

نہیں کرسکتا جو امداد حسین خاں کی عالی نسبی اور امارت خاندانی کے بارے میں ہے۔

لیکن اگر اسیرؔ کا بیان نہ بھی ہوتا تو اس سے امین الدولہ کی نسبی و حسبی کیفیت مخفی نہ رہتی۔ آرلک یا پولک نہیں جانتے تو نہ سہی، ڈاکٹر صفی احمد بلکہ تاریخ کے ہر ہندوستانی طالب علم کو ضرور جاننا چاہیئے کہ شاہان مغلیہ کے فیل بان اسی لئے سید ہوتے تھے کہ ان کے ماسوا کسی دوسرے قبیلہ کی فرد کو بادشاہ کی طرف پشت کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی تھی، استاد و اتالیق کا مرتبہ تو شاگردوں سے بہر حال برتر ہوتا ہے۔ کون اس بات کا تصور کرسکتا ہے کہ شہزادہ سلیمان شکوہ اپنے بچے کا معلم جسے جسمانی سزا تک دینے کا اختیار ہوتا ہے کسی پست طبقے یا سماج کی تلچھٹ سے تلاش کر کے لائیں گے۔ یا محمد علی شاہ کو اپنے پوتوں کی تعلیم و تربیت کے لئے عالی نسب و ذی حسب افراد کا ملنا محال ہوجائے گا کہ وہ گرے ہوئے سماج سے اتالیق کا انتخاب کریں گے۔ محمد علی شاہ کا عہد فرنگی محل اور خاندان اجتہاد کے فیضان سے ذی علم افراد سے نہیں علماء کبار سے معمور تھا اور اگر امداد حسین خاں کی نسبی و حسبی حالت ویسی ہی ہوتی جیسی انگریزوں نے بیان کی ہے تو بادشاہ عصر کے پوتے کو طمانچہ مارنے کی جرأت ہی نہیں پیدا کر سکتے تھے اور اگر جرأت کرتے بھی تو اس واقعے کے بعد ایک لمحہ اپنی جگہ پر برقرار نہیں رہ سکتے نہ کہ اتنا مقرب ہوں کہ وزارت تک پہونچ جائیں۔

شہزادہ سلیماں شکوہ بھی معمولی آدمی نہ تھے ان کے رکھ رکھاؤ کا یہ حال تھا کہ نواب سعادت علی خاں تک سے اپنے بھائی شہزادہ سکندر شکوہ کی بے تکلفی کو خلاف شان سمجھتے تھے۔ شیخ تصدق حسین کہتے ہیں:

> ''جب مرزا جواں بخت کے بیٹے مرزا عالی قدر کی شادی مرزا سلیماں شکوہ کی بیٹی سے ہوئی تو آخر الذکر ہندوستان کی رسم کے مطابق محفل میں حاضر نہ تھے۔ جب نواب سعادت علی خاں شریک محفل ہوئے تو مرزا سکندر شکوہ ایسی وسیع الاخلاقی سے پیش آئے کہ نواب سعادت علی خاں بہت خوش ہوئے اور ان کے بڑے بھائی کی عنایتوں کو بھی بھول گئے۔ بلکہ چند روز میں ایسے ہم نوالہ و ہم پیالہ ہوگئے کہ بقول سید کمال الدین حیدر

مصنف قیصر التواریخ مرزا سلیمان شکوہ نے بھائی کو بہ تہدید لکھا کہ وزراء وامراء سے اس طرح ملنا ہمارے خاندان کی توہین ہے۔''[۱]

سعادت علی خاں جتنے شان وشوکت کے فرماں رواسہی وزیر ہی تھے۔ ان کے فرزند غازی الدین حیدر کو جب انگریزوں نے تخت شاہی پر براجمان کردیا تو بھی سلیمان شکوہ نے انگریزوں کے شدید دباؤ کے باوجود غازی الدین حیدر سے مساویانہ ملاقات بہ کراہت کی۔ ایسی سرکار کے باب میں یہ تصور کرنا کہ اس کے نونہالوں کی تربیت گری پڑی فرد کو سونپی جائے گی، ایسی قیامت ہے جو انگریز ہی برپا کرسکتے ہیں۔

اتنا ہی نہیں، بعد میں شہزادہ سلیماں شکوہ کے صاحبزادے مرزا عباس شکوہ کے امین الدولہ سمدھی بھی ہوئے[۲] مگر یہ نہ معلوم ہوسکا کہ اس رشتے کی تفصیل کیا ہے۔

بہرحال ڈیوڈسن اور رچمنڈ کا زمانہ امین الدولہ نے سکون کے ساتھ بسر کیا کہ واجد علی شاہ کا عہد حکومت آ گیا۔

## عہد واجدی

اس دور میں امین الدولہ نے کنارہ کش ہوجانے کا فیصلہ کیا حقیقی اسباب جو بھی رہے ہوں ان کی نسبت کوئی قرین قیاس بات بہت زور دے کر نہیں کہی جاسکتی۔ لیکن امین الدولہ نے دلیل یہ دی کہ ''باپ کا نوکر کبھی بیٹے کے کام کا نہیں ہوتا'' اور بادشاہ، ریذیڈنٹ، ملکہ آفاق ملکۂ کشور سبھی کی خدمت میں سبک دوشی کا معروضہ پیش کیا۔ اب ریذیڈنسی اور گورنر جنرل پر بھی امین الدولہ کی لیاقت وصلاحیت کا جوہر کھل چکا تھا۔ اس میں کوئی بھی مصلحت رہی ہو لیکن اُنھیں امین الدولہ کو جن کے تقرر اور توسیع اختیار کے خلاف احتجاج کے طور پر ریذیڈنٹ کو جشن سالگرہ میں شرکت کی ممانعت ہوگئی تھی، اب ہٹنے کی اجازت دینا صاحب

---

[۱] شیخ تصدق حسین الواعظ لکھنؤ فروری ۱۹۴۸ء، ص، ۴۰

[۲] شیخ تصدق حسین الواعظ لکھنؤ ستمبر ۱۹۴۶ء، ص، ۲۰

کی مصلحت نہیں تھی۔ کمال الدین حیدر کہتے ہیں:

''بادشاہ نے وفور عنایت سے اپنے گلے لگا لیا اور فرمایا کہ میں تمھیں بجائے حضرت جنت مکان سمجھتا ہوں تم مجھے ایسے وقت میں چھوڑتے ہو! نواب مطمئن ہوئے۔''[۱]

کمال الدین حیدر اسے ظاہر داری دنیا بتاتے ہیں۔ ڈاکٹر بھٹنا گر اس کی تعبیر ''روایتی تکلّف اور لکھنؤ کے اخلاق''[۲] سے کرتے ہیں۔ مگر مجھے یہ روایت سرے سے غلط معلوم ہوتی ہے۔ ہر وہ شخص جسے سلطان عالم کی مزاجی کیفیت، جو ان کے رشحات قلم سے پھوٹی پڑتی ہے، کے مطالعے کا موقع ملا ہے وہ اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہے کہ سلطان عالم کو اپنے جذبات وخیالات یا کمزوریوں کو چھپانے کی مطلق خواہش نہ تھی۔ کوئی ان کی بے جا ستائش بھی کرتا تھا تو اپنی کمزوری کا پردہ خود فاش کر دیتے تھے اپنے حسب ونسب کے ایک مداح پر طنز فرماتے ہیں۔

سیادت ، شرافت ، نجابت لکھی
مگر میری پر نانی تھی ڈومنی

ایسی صورت میں یہ توقع کرنا بے جا ہے کہ انہوں نے کسی دنیاوی ظاہر داری، روایتی تکلف یا مصنوعی اخلاق سے کام لیا ہوگا۔

محل خانہ شاہی میں ان کے متعدد بیانات ایسے ہیں جو ان کے منشا پر روشنی ڈالتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ وہ ولی عہدی ہی میں وزارت کے لئے علی نقی خاں کا انتخاب ہی نہیں کر چکے تھے بلکہ نواب سے وعدہ اور اللہ سے عہد کر چکے تھے۔ بیان ۸۶ کا یہ اقتباس دیکھئے:

''چونکہ علی نقی خاں کی چندیا پر بال کم تھے میں نے ایک روز مذاقاً کہا نواب صاحب سر پر بالوں کا کم ہونا وزارت کی علامت ہے۔ انھوں نے عرض کی حضور کے

---

[۱] سوانحات، ج ۱، ص ۸۱

[۲] اودھ انڈر واجد علی شاہ، ص ۲۴، حاشیہ ۲۲

تصدق میں یہ بھی ہو جائے گا۔ یہ بات میرے دل میں چبھ گئی اور میں نے اپنے دل میں کہا: پروردگارا! میں نے جھوٹ نہیں کہا ہے۔ اگر تو چاہے گا تو اپنے وقت پر اس کلمہ کا حال بخوبی ظاہر ہو جائے گا۔"[۱]

اس کے بعد اپنی تخت نشینی کا ذکر کرتے ہوئے اپنے عزم بالجزم کا پھر اظہار کرتے ہیں:

"دوسرے روز سب مصاحبان خاص وغیرہ کو عمدہ تلواروں اور معقول خطابوں سے سرفراز فرمایا چونکہ اس زمانے میں میرے استاد امین الدولہ بہادر مدار الہام تھے اور میں علی نقی خاں کو یہ عہدہ دینے کا خیال رکھتا تھا اس وجہ سے انہیں خطاب سے سرفراز نہ فرمایا کہ سمجھا جائے گا۔"[۲]

اور اسے کسی اور نے سمجھا ہو یا نہ سمجھا ہو امین الدولہ نے ضرور سمجھا اور وزارت سے الگ ہو جانے کے لئے کوشش کرنے لگے۔ سلطان عالم کی اتنی صاف تصریحوں کے بعد کمال الدین حیدر کی روایت کا یقین کرنا بہت مشکل ہے۔ ڈاکٹر بھٹنا گر کی رائے ہے:

"واجد علی شاہ کو چند مہینوں کے اندر یقین ہو گیا کہ یہ ضعیف وزیر نہ تو نظام مال گذاری کی اصلاح کر سکتے ہیں نہ سلیقے سے اپنی انتظامی ذمّہ داریاں پوری کر سکتے ہیں۔ اس احساس نے بادشاہ کو سنجیدگی کے ساتھ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ وہ وزیر کی جگہ میر مہدی کو مقرر کر دیں جوان کی ولی عہدی کے زمانے میں معتمد مصاحب ثابت ہوئے تھے۔ ولی عہد کی حیثیت سے بادشاہ نے امیر الامرا کا خطاب دیا تھا............"[۳] ترجمہ

اس کے بعد مندر کے سلسلہ میں میر مہدی کی زیادتی کا واقعہ بیان کرتے ہیں اور میر مہدی کی محرومی کو اسی کا ثمرہ بتاتے ہیں۔ ڈاکٹر بھٹنا گر کمال الدین حیدر کے جال میں پھنس گئے اور بادشاہ کے بیانات کی طرف ملتفت ہونے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ میر مہدی کی وزارت کا

---

[۱] محل خانہ شاہی، ص ۶۔۹۵

[۲] محل خانہ شاہی، ص ۹۵

[۳] اودھ انڈر واجد علی شاہ، ص، ۲۴

افسانہ غالباً اس لئے گڑھا گیا ہے کہ مندر کے انہدام کا ناگوار واقعہ کسی معمولی افسر کے نہیں، وزیر سلطنت یا امیدوار وزارت کے سر تھوپا جا سکے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ میر مہدی کو خطاب جو بھی مل گیا ہو، واجد علی شاہ نے ان کے بارے میں جو رائے ظاہر کی ہے اس کو نظر میں رکھ کے یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ بادشاہ کی رائے میں وزارت کے اہل رہے ہوں گے۔

سب سے بڑی بات تو وہی ہے جو ابھی عرض کی گئی کہ بادشاہ کی نظر میں علی نقی خاں کے سوا کوئی اور تھا ہی کب! بادشاہ میر مہدیؔ کے باب میں اپنے رائے ظاہر کرتے ہیں:

''یہ میر مہدی، امین الدولہ امداد حسین خاں میرے والد جنت مکان کے عہد حکومت میں وزیر اور میرے استاد بھی تھے انہوں نے مجھے میزان وشرح اسباب کا سبق دیا تھا۔ میر مہدی مرد سادات اور اس سے قبل میرے والد ماجد حضرت جنت مکان کے زمانے میں ایک تمن کے تمندار تھے اور پندرہ روپیہ ماہانہ پاتے تھے۔

یہ نہایت پاک باطن اور صاف دل آدمی تھے مگر اس کے ساتھ مغرور و متکبر بھی تھے۔ جو اسی رعونت اور نخوت کی وجہ سے اپنے عہدے سے علیحدہ کئے گئے ورنہ ان کا معزول ہونا امر محال تھا............ذرا ظہور لکھے پڑھے بھی تھے۔ ان کو امین الدولہ امداد حسین خاں نے از راہ دوستی میری سرکار میں بعہدہ داروغگی ملازم رکھوایا تھا۔''[1]

ظاہر ہے کہ جو اپنی رعونت کی وجہ سے پندرہ روپئے ماہوار کی تمنداری کا متحمل نہ ہو سکے اسے وزارت اودھ کا بارگراں سونپنے کا خیال کسے آ سکتا تھا! دوسرے اگر میر صاحب میں ادنیٰ جذبۂ شرافت ہوتا تو وہ امین الدولہ کے مقابلے میں اس عہدۂ جلیلہ کی تمنا خود ہی نہ کرتے۔ پھر 'ذرا ظہور پڑھے لکھے تھے' کا جملہ ان کی لیاقت کے بارے میں واجد علی شاہ کی صحیح رائے کا پتہ دیتا ہے اور علی نقی خاں کے تقرر کے لئے عہد شرعی کر لینے کے بعد یہ میر مہدی بچارے بیچ میں کہاں آتے۔ امین الدولہ کی برطرفی تو مقصود بالذات تھی ہی

[1] محل خانہ شاہی، ص ۹-۲۸

نہیں کہ جانشین کے نام پر غور ہوتا۔ وہاں تو اصل نصب العین علی نقی خاں کی تقرری تھی اور ذریعہ تھی امین الدولہ کی برطرفی۔ ریذیڈنٹ، دادی اور ماں کا پاس ولحاظ نہ ہوتا تو بادشاہ سلامت کا مکنون خاطر سہولت اور سلیقے سے پورا ہوجاتا مگر چاہے اسے اتفاق کہہ لیجئے یا ریذیڈنسی کی دراندازی کا ناپاک نمونہ مان لیجئے یا امیدوار وزارت کی سازش سمجھ لیجئے۔ برڈ کے ہندی مترجم راجیندر پانڈے اسی نتیجے پر پہونچے ہیں:

''واجد علی شاہ کا وزیر امین الدولہ بہت قابل منتظم تھا اس لئے انگریز اسے ہٹانے اور من مطابق وزیر بنانے کی سازش کرنے لگے۔''[1]

بہرحال جو بھی سبب رہا ہو امین الدولہ ایک ناگواری واقعے سے دوچار ہوئے اس کے بارے میں جتنے منھ ہیں اتنی باتیں ہیں۔ ہم یہاں سب سے پہلے ڈاکٹر بھٹناگر کے بیان کا خلاصہ پیش کرتے ہیں۔ بھٹناگر صاحب نے واقعات انگریزی ریکارڈ سے لئے ہیں جن کا دعویٰ ہے کہ یہ واقعہ خود امین الدولہ کا بیان کردہ ہے۔ اس حادثے کے آخری حصّے کے چشم دید گواہ برڈ بھی تھے، محروی کی بات ہے کہ اپنی کتاب میں انھوں نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ بھٹناگر بیان کرتے ہیں:

''۸/اپریل ۱۸۴۷ء کو وزیر اپنی بگھی پر اپنے مکان تحسین گنج سے دربار میں حضوری کے لئے جارہے تھے کہ راہ میں ملکہ زمانی کی مسجد کے پاس گولہ گنج میں اچانک چار افراد گاڑی کے آگے کھڑے ہوگئے۔ ان میں سے تفضّل نامی ایک شخص نے گھوڑے کی گردن پکڑ لی اور چلّا کر اپنی بقایا تنخواہ کا مطالبہ کرنے لگا۔ شروع میں نواب نے یہ خیال کہ یہ لوگ شاید حکومت کے تخفیف شدہ عملے میں سے ہیں جس کی تنخواہ باقی ہے۔ اتنے میں ۳/آدمی گاڑی میں داہنی طرف سے گھسے۔ جب وزیر کے ایک محافظ ہلاس نے انھیں اپنے آقا کو گھیرے دیکھا تو اس حرکت سے باز رہنے کی تنبیہ کی۔ ایک حملہ آور نے

[1] اودھ کی لوٹ، ص، ۵

فوراً اس پر بندوق چلادی مگر وار خالی گیا دوسری گولی فوراً دوسرے حملہ آور فضل علی نے داغی جو ہلاس کو لگی، ہلاس نے گرتے گرتے تلوار کا وار کر کے تیسرے حملہ آور حیدر خاں کو زخمی کر دیا اور چل بسا۔ حیدر خاں خنجر لے کے گاڑی میں گھسا۔ وزیر اس کا داہنا ہاتھ جس میں خنجر تھا پکڑ کے بائیں طرف ڈھکیل دینے میں کامیاب تو ہو گئے مگر خود بھی ساتھ ہی اس پر آ پڑے۔ تفضّل اپنے ساتھی حیدر خاں کی مدد کے لئے آیا تو وزیر نے اُسے بائیں سے دھر لیا اس کش مکش میں مجرموں کا ایک اور ساتھی گاڑی میں گھسا اور وزیر کے بائیں کندھے اور بازو کو گھائل کر دیا۔ اس طرح انھیں اپنی گرفت ڈھیلی کرنے پر مجبور کر دیا۔ وزیر کا ایک اور ملازم امان علی کب زخمی ہوا وزیر دیکھ نہ سکے۔ لیکن زمین سے اٹھنے پر امان علی انھیں سڑک پر پڑا ملا۔ شاہ میر دوسرا ملازم جو خود بھی زخمی ہو چکا تھا تقریباً ۲۰ رگز دور کھڑا ہوا شور مچا رہا تھا کہ بدمعاش وزیر کو مارے ڈال رہے ہیں۔

اب چاروں حملہ آوروں نے وزیر کو گھیر لیا مگر یہ یقین دلاتے رہے کہ ان پر کسی راہ گیر نے حملہ نہ کیا تو وہ وزیر کو قتل نہیں کریں گے۔ خون کافی بہہ جانے سے وزیر میں کھڑے رہنے کی حالت نہیں رہ گئی تھی اس لئے انھیں سڑک کے کنارے ایک چبوترے پر لیٹ جانے کی مہلت تو دے دی مگر تفضّل اور علی محمد بدستور ان کے سینے پر کٹاریاں تانے بیٹھے رہے۔

جب ریذیڈنٹ نے وزیر پر اس جسارت آمیز حملے کی خبر سنی تو انھوں نے چھاؤنی سے فوجی دستہ طلب کرنے کی فوری ہدایت جاری کی اور پھر اپنے اسٹنٹ لیفٹینٹ برڈ کے ساتھ موقع پر پہونچ گئے اور دیکھا کہ پاس والی گلی لوگوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی ہے دو بدمعاش انھیں بندوق لئے روکے ہیں اور وزیر ایک چبوترے پر چت لیٹے ہوئے ہیں اور دو بدمعاش دونوں طرف سے ان پر کٹاریاں تانے ہوئے ہیں۔''

لیفٹینٹ برڈ وہاں بڑھ گئے جہاں وزیر لیٹے ہوئے تھے۔ بدمعاشوں نے ان کو مخاطب کر کے کہا:

''اب سرکار میں اچھے لوگ ملازمت نہیں پاتے ہمارے پاس کوئی ذریعۂ معاش نہیں ہے۔ اور ہم نے یہ سب اسی لئے کیا ہے۔تب انھوں نے وزیر سے پچاس ہزار روپیئے اور ریذیڈنٹ سے یہ تحریری ضمانت طلب کی کہ انھیں کسی طرح کی پریشانی کے بغیر کانپور چلے جانے کی اجازت دے دی جائے گی۔

ریذیڈنٹ نے کسی تحریری سمجھوتے میں پڑنے سے انکار کردیا اور کہا کہ وہ اگر وزیر کوقتل کرنا ہی چاہتے ہیں تو ان کو بھی فوراً موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔لیکن اب اگر وہ مزید کسی حرکت سے باز رہیں گے تو جان بخشی کی جائے گی۔ریذیڈنٹ نے یہ بھی کہا کہ وہ ان لوگوں کو اپنے ساتھ ریذیڈنسی لے چلنے کے لئے تیار ہیں۔ جہاں نہ وہ خود قید کریں گے اور نہ قید کے لئے اودھ سرکار کے حوالے کریں گے۔ روپیہ دینے کا سوال ریذیڈنٹ نے کلیتاً وزیر پر چھوڑ دیا۔ چنانچہ وزیر کے اقارب تین چار ہاتھیوں پر پچاس ہزار روپیہ لائے۔تب غنڈوں نے ریذیڈنسی کے معالج ڈاکٹر لوگن کو اس بات کی اجازت دی کہ وہ مجروح وزیر کو طبی امداد دیں۔ان تین حملہ آوروں کو بھی جو وزیر کے محافظوں کے ہاتھوں زخمی ہو گئے تھے طبی امداد دی گئی۔تب بدمعاش وہاں سے ہٹا کے ریذیڈنسی لائے گئے اور انہیں دفتر کے ایک نچلے کمرے میں رہنے کی اجازت دی گئی اور رقم کی حفاظت کے لئے ایک مسلح محافظ مقرر کر دیا گیا۔ بدمعاشوں کا مقصد وزیر کو بلیک میل کرنے کے سوا کیا ہوسکتا ہے۔اسی دن دو پہر کے قریب ریزیڈنٹ نے بادشاہ سے ملاقات کی جو اس حادثے سے بہت طیش میں تھے اور ان بدمعاشوں کو سزائے موت دے کے ایک مثال قائم کرنا چاہتے تھے۔لیکن ریذیڈنٹ نے یہ کہہ کر باز رکھا کہ میں جان کی سلامتی کا وعدہ کر چکا ہوں۔ بعد میں ملزم باضابطہ عدالتی کاروائی کے لئے اودھ سرکار کے حوالے کئے گئے اور ان کے مقدمہ کی سماعت کے لئے منشی ظہیر الدین مولوی شتاب علی (مفتی عدالت) مخلص حسین امین اور منصف الدولہ مولانا محمد باقر پر مشتمل ایک عدالت بنائی گئی۔ وزیر نے بھی ایک عرض داشت کے ذریعے استدعا کی کہ سزایابی سے قبل ملزموں

کے ساتھ خراب سلوک نہ کیا جائے۔ ان میں تین تفضّل حسین، حیدر خاں، اور فضل علی پر جرم ثابت ہوا اور انھیں حبس دوام کی سزا دی گئی چوتھا ملزم علی احمد پیلی بھیت کا باشندہ تھا جو وہاں سے بدچلنی کی وجہ سے شہر بدر کر دیا گیا تھا اور یہاں اس کی نقل و حرکت کی حکام نگرانی کرتے تھے۔ اعتراف جُرم کی تصدیق و تائید ملزموں کے رشتہ داروں اور دوستوں کی شہادت سے ہوئی۔

نواب امین الدولہ کا علاج ڈاکٹر لوگن نے کیا۔ وہ مہینہ بھر میں پوری طرح تندرست ہو گئے۔ جب ۱۳رمئی ۱۸۴۷ء کو وہ باریاب سلطانی ہوئے تو بادشاہ نے بڑی ہمدردی سے ملاقات کی اور خلعت سے سرفراز کیا۔ حضوری میں وزیر کے ساتھ ڈاکٹر لوگن بھی تھے۔ انھیں علاج میں شریک دوسرے افراد کو انعام واکرام سے نوازا گیا۔''[1] ترجمہ

اگرچہ شفایابی کے بعد وزیر کی آؤ بھگت بادشاہ نے حسب معمول لطف سے کی لیکن اب وہ وزیر کی برطرفی کو ختم کر چکے تھے۔ علی نقی خاں بھی وزیر کی معزولی کے لئے ہر ممکن تدبیر سے کام لے رہے تھے۔ بڑی تاخیر سے، ۳۱رمئی ۱۸۴۷ء کو ریذیڈنٹ نے گورنر جنرل کو اطلاعی کیفیت بھیجی۔ ہدایت آئی کہ امین الدولہ کی پوری حمایت کی جائے اور باریاب ہو کے گورنر جنرل کا تعلق خاطر ریذیڈنٹ کے صلاح دینے کے حق اور از روئے معاہدہ اس صلاح پر کاربند ہونے کی جو ذمہ داری ہے اس کو بادشاہ سلامت سے مودبّانہ طور پر ظاہر کر دیں۔[2]

اب طرفین سے تحریر کی آمدورفت کا سلسلہ شروع ہوا۔ ریذیڈنٹ نے وزیر کی حمایت اور چند مقربین شاہی کی شکایت کی۔ بادشاہ نے وزیر کے قصور اور دوسروں کی صفائی پیش کی لیکن آخری میں بادشاہ ایسا داؤں چلے کہ ریذیڈنٹ کے پاس اس کا توڑ تھا ہی نہیں۔

یہ تھی امجد علی شاہ جنت مکاں اور اس وقت کے (قائم مقام) ریذیڈنٹ کیپٹن جے ایس

---

[1] اودھ انڈر واجد علی شاہ، ص، ۲۹۔۳۲

[2] اودھ انڈر واجد علی شاہ، ص، ۳۰۔۳۲

شیکسپیئر کی وہ مراسلت جس میں ریذیڈنٹ نے امین الدولہ کی بحالی کی مخالفت کی تھی تب صورتحال معکوس تھی یعنی امین الدولہ کو بادشاہ کی خوشنودی وحمایت میسر تھی اور شرف الدولہ کی وجہ سے ریذیڈنٹ مخالف تھا۔ اب اتفاقات نے جہاں پناہ کو برگشتۂ خاطر کر دیا تھا تو ریذیڈنٹ رام ہو گیا تھا۔ یہ بھی شاید ریذیڈنسی کی بازی گری کا ایک نمونہ ہے۔

۳/ جولائی ۱۸۴۷ء سے پہلے یہ بات ایک کھلا ہوا راز بن چکی تھی کہ نواب امین الدولہ اب برطرف ہو جائیں گے۔ یہ افواہیں ہر چند وزیر کے گوش گزار ہوتی رہیں مگر وہ در دولت پر حسب معمول حاضر ہوتے رہے۔ اس دن یعنی ۱۹/ رجب ۱۲۶۳ھ کو جو بہ تحقیق ڈاکٹر بھٹنا گر ۳/ جولائی ۱۸۴۷ء اور حسب بیان کمال الدین حیدر ۹/ جولائی ۱۸۴۷ء تھی امین الدولہ مہاراجہ بالکرشن وزیر مالیات اور راجہ کندن لال اشکی میر منشی کے ساتھ باریابی کے منتظر تھے کہ "مصاحب الدولہ نے آ کر کہا کہ بادشاہ نے مہاراج اور راجہ کندن لال میر منشی کو یاد فرمایا ہے پہلے انھوں نے جانے میں کچھ مکث کیا۔ دوبارہ پھر طلب ہوئے۔ نواب نے فرمایا کہ تم کیوں نہیں جاتے، عرض کی، آج خلاف معمول ہوتا ہے کس واسطے کہ ہر روز آپ کے ساتھ جاتے تھے اس عرصے میں ایک خواص نے نواب سے کہا کہ آپ کو حکم بر خواست ہوا ہے۔ نواب یہ سنتے ہی سوار ہو کر اپنے گھر چلے آئے۔ بعد دوپہر کے ایک چوبدار سلطانی نے شیخ اکبر علی دارغہ دیوان خانہ نواب سے کہا کہ حکم بادشاہ یہ ہے کہ نواب سوار نہ ہوں۔"[1]

صبح نو بجے یہ واقعہ پیش آیا ۱۰ بجے کے قریب بادشاہ نے اپنے پیش کار نجم الدولہ کو ریذیڈنسی بھیج کر امین الدولہ کی برطرفی اور علی نقی خاں کی تقرری زیر تجویز ہونے کی اطلاع دی۔ ریذیڈنٹ نے فوری ملاقات کا وقت مانگا اور ۱۱ بجے در دولت روانہ ہو گئے۔ بادشاہ نے ملاقات میں اپنی تجویز دہرائی ریذیڈنٹ نے امین الدولہ کی حمایت کے بارے میں

---

[1] سوانحات، ج، ۲، ص، ۲۰

گورنر جنرل کا حکم نامہ پڑھ کر سنایا مگر بادشاہ اپنے فیصلہ پر اٹل رہے۔ آخر کار گورنر جنرل کو اطلاع دی گئی اس نے ۲۴ / جولائی ۱۸۴۷ء کو لکھا کہ ایسا شخص مقرر کیا جا سکتا ہے جس پر ریذیڈنٹ کو اعتراض نہ ہو اور ساتھ ہی ساتھ بادشاہ پر واضح کر دیا جائے کہ از روئے معاہدہ ریذیڈنٹ کو محض صلاح دینے کا نہیں اس کو ماننے پر مجبور کرنے کا بھی حق ہے۔ ان مراحل کے بعد ۵ / اگست ۱۸۴۷ء کو علی نقی خاں نے جامۂ وزارت در بر کیا۔

ڈاکٹر بھٹناگر کی رائے ہے کہ:

''اگر تبدیلی ناگزیر تھی تو اسے خوش اسلوبی سے اور ریذیڈنٹ کی صلاح سے نافذ کیا جانا چاہیئے تھا۔''[1]

ڈاکٹر بھٹناگر انگریزوں کی طرف سے خوش فہمی میں مبتلا ہیں وہ سیلمن کے بارے میں خوش فہمی ہی رکھتے ہیں جن کو ہمیشہ یہ افسوس رہا کہ:

''لارڈ ہٹینگ کمزور یا اعتدال پسند شخص تھے ورنہ انھیں کی گورنر جنرلی کے وقت یعنی نصیر الدین شاہ کے زمانے ہی میں برٹش حکومت آ گئی ہوتی۔''[2]

اس کے علاوہ بھٹناگر صاحب نے اس طرف بھی دھیان نہیں دیا کہ یہ سب انگریزوں کی چال تھی۔ اگر امین الدولہ کو بچانے میں شیکسپیئر کے مراسلات کی وجہ سے ریذیڈنٹ کو دقت تھی لیکن وہ علی نقی خاں کا تقرر تو روک ہی سکتا تھا مگر مطلب سعدی دیگر تھا۔ اس لئے ریذیڈنٹ سے معاملہ کو خوش اسلوبی سے طے کرنے کی امید حقائق پر مبنی نہیں ہے۔

بہر کیف امین الدولہ اس کے بعد خانہ نشیں ہو گئے۔ اگر اس نظر سے کہ انھوں نے اپنے آقا کے مقاصد کے ساتھ کامل ہم آہنگی، لگن اور محنت کے ساتھ اپنے خدمات انجام دیئے، تعمیر و ترقی اور علم و ادب کی تحریکوں میں اپنے حسن وانتظام اور علم دوستی کا ثبوت دیا تو ان کا دور وزارت بڑی حد تک کامیاب شمار کیا جائے گا۔ ریذیڈنسی سے تعلقات کے اعتبار

---

[1] اودھ انڈر واجد علی شاہ، ص ۳۹

[2] واجد علی شاہ اور اودھ راجیہ کا پتن، ص، ۵۰

سے اگر پرکھ کی جائے تو اس کمی کو انھوں نے اپنے آخری دور میں پورا کرلیا تھا۔لیکن ان سطروں کے راقم کے پاس اس مکتب خیال کے حضرات کے سامنے امین الدّولہ کی صفائی میں پیش کرنے کے لئے کچھ نہیں ہے جو امجد علی شاہ کے رجحان مزاج و انداز حکومت کو ہی غلط اور ناروا سمجھتے ہیں۔لیکن یہاں ڈاکٹر بھٹنا گر کا ایک اقتباس پیش کیا جارہا ہے جس سے اس بات پر روشنی پڑتی ہے کہ اودھ کے وزرا، اودھ کے وزراء کی بھی تخصیص نہیں سبھی شخصی حکومتوں میں وزیر کو کس کشاکش کا سامنا رہتا تھا اور جو ذی شعور اس تبصرہ کی روشنی میں امین الدولہ کی قدر و قیمت معین کرے گا اور اگر ان کا مداح یا معترف نہ ہوگا تو بھی ان سے مطمئن ضرور ہوجائے گا۔ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

''ان حالات میں اودھ کے کسی بھی وزیر اعظم کو چار مختلف قوتوں کا بیک وقت سامنا کرنا ہوتا تھا پہلے بادشاہ کا جو اسے عہدہ پر مقرر کرتا تھا، دوسرے بادشاہ کے مقربین جن کی مدد کے بغیر کسی شخص کا اس عہدے پر برقرار رہنا ناممکن تھا۔اگر چہ بادشاہ نے امور مملکت میں اپنے مقربین کی مداخلت یا ان کے اثر کا ہمیشہ انکار کیا مگر یہ حقیقت ہے کہ اس کے مقربین حکام کے لئے بڑی دہشت بنے ہوئے تھے جن سے حکام بادشاہ کے مقابلے میں زیادہ ڈرتے تھے۔تیسرے ریذیڈنٹ جسے ۱۸۰۱ء کے معاہدہ کی رو سے نظم ونسق میں دخل اندازی کا خصوصی اختیار میسر تھا۔کسی وزیر اعظم کے لئے ریذیڈنٹ کی پشت پناہی کے بغیر پرسکون اور موثر طریقے سے کام کرسکنا ممکن ہی نہیں تھا۔وزیر اعظم کو ریذیڈنٹ کی بھی ناز برداری کرنی پڑتی تھی اور ساتھ ہی ساتھ دربار کے رجحان وخوشنودی کا لحاظ و پاس رکھنا پڑتا تھا۔دراصل بادشاہ اور ریذیڈنٹ توام آقا تھے جنھیں بیک وقت وزیر بہ مشکل ہی راضی رکھ سکتا تھا۔آخر میں سرکش تعلقداروں اور عوام سے بھی نپٹنا پڑتا تھا۔مندرجہ بالا دو طاقتوں میں سے اول الذکر کا اس کی کامیابی یا ناکامی میں بھی زیادہ ہاتھ رہتا تھا۔امجد علی شاہ کے دور میں امین الدولہ کو ریذیڈنٹ کا اعتماد حاصل نہیں تھا مگر اب وہ مقصد میں کامیاب تھے اور ریذیڈنٹ کا اعتماد بھی حاصل تھا مگر

ان کی اچانک برطرفی نے اودھ کے نظم ونسق کی پوری مشینری کو بدل ڈالا۔''[1]

## سبکدوشی کے بعد

حکیم مولوی سید علی اکبر کشمیری لکھتے ہیں کہ:

''امین الدولہ بہترین اخلاق و عادت کے مالک تھے دن رات کا زیادہ تر وقت عبادت میں بسر کرتے تھے اول صبح صادق نماز صبح پڑھ کر جسمانی ریاضت کے لئے گھوڑے کی سواری اور اپنے محل کے گرد چکر لگاتے تھے۔ پھر واپس آ کر وزیر منزل میں بیٹھتے تھے اور گھریلو معاملات کے بارے میں فیصلہ کرتے تھے۔ کسی کتاب کی ایک آدھ فصل یا باب کا مطالعہ کرتے تھے اتنے میں ہرکارہ آ کر امیدواران ملاقات کی آمد کی خبر دیتا تھا۔ ان میں جن سے چاہتے تھے ملاقات کرتے تھے جن سے ملاقات کرنا نہ چاہتے انھیں واپس کر دیتے تھے۔ یہ سلسلۂ ملاقات دوپہر تک رہتا۔ پھر کھانا کھا کر تھوڑی دیر قیلولہ کرتے تھے اور اس کے بعد نماز ظہرین بجالاتے تھے شام تک روزانہ کا حساب کتاب دیکھتے تھے۔ نماز مغربین کے بعد عمائد و رؤساء معززین شہر ملنے آتے تھے ان سے فارغ ہو کے زنان خانے میں دلبستگی کے لئے تھوڑی دیر کو تشریف لے جاتے تھے۔''

## حلیہ

حکیم صاحب امداد حسین خاں کا حلیہ بیان کرتے ہیں:

''پر رونق چہرہ، اونچی ناک، روشن پیشانی، سرمگیں آنکھیں، سفید اور منور ڈاڑھی، صورت شکل کے علاوہ اخلاق و عادات میں بھی ان سے بہتر کوئی میری نظر سے نہیں گزرا۔ مضبوط اور پر گوشت انگلیاں بھری بھری رانیں اور پنڈلیاں اور کلائی تھی۔ پتلی کمر

---

[1] اودھ انڈر واجد علی شاہ، ص ۳۶

چھوٹے پیر، کھلتا رنگ اور سر بڑا تھا۔''[۱] ترجمہ

## ازواج واولاد

امداد حسین خاں کی پہلی شادی نواب پیاری بیگم صاحبہ سے ہوئی جن کے بطن سے احمد حسین خاں کی ولادت ہوئی۔ یہ صاحبزادے گونگے بہرے تھے اور اسی مناسبت سے گونگے نواب کے عرف عام سے مشہور ہیں۔ ان کی تعلیم علامہ احمد علی محمد آبادی سے متعلق ہوئی[۲] اور ان کی تعلیم کا فیض سمجھئے یا ہماری اودھی بولی کی اس کہاوت کا مصداق کہ ''پوت بڑھے پتا کے دھرمے کھیتی اپجے اپنے کرمے'' کا مصداق سمجھ کر امین الدولہ کی خوش اعمالیوں کی برکت سمجھئے کہ ان کو لکھنے پڑھنے میں ایسی مہارت ہوگئی کہ:

''گونگے بہرے ہونے کے باوجود ان کے صاحبزادے نے قرآن مجید کی کتابت کرکے اپنے باپ کی خدمت میں پیش کیا۔ جس سے نواب بہت خوش ومسرور ہوئے اور انھوں نے چاہا کہ نسخۂ قرآن مجید کے آخر میں ایسی عبارت لکھی جائے جس سے پتہ چل سکے کہ لکھنے والا گونگا بہرا ہے۔ اکثر ادباء وفضلا نے اچھی اچھی عبارتیں بنائیں مگر نواب کے پسند خاطر کوئی نہ ہوتی۔ انھوں نے کہا کہ صراحت کے بجائے محض یہ اشارہ ہو کہ سمجھنے والے سمجھ بھی لیں اور تصریح بھی نہ ہو۔ آخر میں ان کے ایک مصاحب نے میری طرف اشارہ کرکے کہا کہ یہ کام یہی کرسکتے ہیں۔ میرے لاکھ عذر معذرت کے باوجود نواب نے مجھ سے اصرار کیا۔ جس کی وجہ سے میں اپنی جگہ بہت فکرمند ہوا۔ پوری رات نیند نہ آئی لیکن اللہ کی طرف سے مدد ہوئی اور خیال ہوا کہ آخر میں جناب موسیٰؑ کی دعا کا (قرآنی) ٹکڑا **واحلل عقدۃ من لسانی یفقھوا قولی** لکھوادوں۔ میری اس تجویز سے نواب بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ تجدید وزارت ہولے تو میں آپ کو پورا انعام

---

[۱] سبیکۃ الذہب، ص ۷۸-۷۷

[۲] تذکرۂ بے بہا فی تاریخ العلماء، ص ۱۵

دوں گا۔"[۱] ترجمہ

احمد حسین خاں کو اشرف الدولہ ضیغم الملک کا خطاب بھی ملا تھا۔ امین آباد میں گو نگے نواب پارک انھیں نواب احمد حسین خاں کی یادگار ہے۔ نواب نے سات اولادیں، جن میں تین بیٹیاں اور چار بیٹے تھے، اپنی یادگار چھوڑے۔ فرزند اکبر نواب حامد حسین اشرف الدولہ کے جانشین ہوئے۔ یہ برطانوی عہد میں سب جج کے عہدے پر مقرر تھے۔ اشرف الدولہ نے ۲ رجون ۱۸۷۲ء کو انتقال کیا۔[۲]

نواب امین الدولہ کی دوسری اہلیہ، ان کی پھوپھی کی لڑکی[۳] نواب عباسی خانم تھیں۔ ان کے بطن سے نواب امین الدولہ کی صاحبزادی نواب وزیر النساء بیگم پیدا ہوئیں جن کی شادی سلطان وصی علی شاہ عرف صاحب عالم بہادر سے ہوئی تھی۔ ہوسکتا ہے کہ انھیں صاحب عالم بہادر کے رشتے سے شہزادہ مرزا عباس شکوہ نواب امین الدولہ کے سمدھی[۴] ہوتے ہوں۔ وزیر النساء لاولد رہیں اور ۲۵ رجولائی ۱۹۱۱ء کو رحلت کی۔

امین الدولہ کی وفات کے بعد عباسی خانم نے پہلا عقد نواب مرحوم کے داروغہ کتب خانہ سید مصطفی صاحب سے کیا۔ ان سے ایک لڑکی مہدی بیگم پیدا ہوئی۔ اس کے بعد سید مصطفی کا انتقال ہوگیا اور پھر عباسی خانم نے تیسرا نکاح محمد باقر سے کیا۔[۵]

نواب بہو بسم اللہ بیگم نامی ایک معظّمہ بھی امین الدولہ کی زوجیت کی دعویدار تھیں اور حیدر حسین خاں نامی ان کے بیٹے فرزندی کے مگر نواب اشرف الدولہ اور ان کے صاحبزادے نواب حامد حسین خاں بہادر نے ان کا دعویٰ تسلیم نہیں کیا۔ اور معاملہ عدالت

---

۱ سبیکۃ الذہب، ص ۹-۸۷

۲ مکتوب نواب صادق حسین خاں متولی کربلائے امین الدولہ

۳ ماہنامہ الواعظ لکھنؤ بابتہ فروری ۱۹۴۸ء، ص ۴۱

۴ ماہنامہ الواعظ لکھنؤ ستمبر، ۱۹۴۶ء، ص ۹-۱۸

۵ الواعظ فروری ۴۸ء، ص ۲-۴۱

تک لے گئے اور کامیاب رہے۔ امین الدولہ کا وقف نامہ جو ۱۳؍اگست ۱۸۹۶ء کو مطبع اثنائے عشری سید عابد علی[1] سے شائع ہوا۔ سول جج لکھنؤ کی عدالت میں اسی مقدمے کی مثل سے لیا گیا تھا۔

ورثاء کی کثرت اور نزاع باہمی نے امین الدولہ کی کثیر جائداد غیر وقفی نیز وقفی کو نقصان پہنچایا۔ یہ جائداد غیر معمولی حیثیت کی تھی۔ جس میں آج کے قلب لکھنؤ کا عظیم الشان بازار امین آباد بھی تھا۔ امین آباد کی آباد کاری کو امین الدولہ کے خصوصی کارناموں میں شمار کیا گیا ہے اور امین الدّولہ کے ذکر کے ساتھ اس کا تذکرہ تقریباً التزام سے آتا ہے۔ لیکن زیادہ تر معلومات شیخ تصدق حسین صاحب کے بیانات سے بہم پہونچتے ہیں اور جستہ جستہ انہیں یہاں پیش کیا جاتا ہے:

''امین آباد کا بازار انہیں نواب امین الدولہ نے آباد کیا تھا۔ امین الدّولہ پارک واقع امین آباد کی آراضی ابتداء میں خدیجہ خانم نواب شجاع الدولہ کی نانی کی تھی انہوں نے اس میں ایک مسجد اور حمام وغیرہ معرفت مسماۃ جے کنور بنوایا تھا، جو ذات کی پڑائن تھیں مگر آغوش اسلام میں آ گئی تھیں۔

جس سال مسجد وغیرہ بن کر تیار ہوئی، اسی سال خدیجہ خانم کا انتقال ہو گیا۔ اس طور پر یہ باغ اور مسجد پڑائن کا باغ اور مسجد مشہور ہو گئی۔ خدیجہ خانم کی قبر اسی باغ میں ہے جس پر ایک پختہ چبوترہ بنا ہوا ہے۔ پہلے قبر پر ایک مقبرہ بھی بنا ہوا تھا جو تخمیناً ۱۹۱۶ء میں منہدم ہو گیا۔ امجد علی شاہ نے یہ کل املاک مع مسجد و دیگر عمارات متعلقہ باغ، نواب امین الدولہ کو بزمانہ وزارت مرحمت کر دی تھی۔ انہوں نے باغ کا نام تبدیل کر کے اپنے نام پر اس کا نام امداد باغ رکھا۔ اور اسی باغ میں ایک شاندار دومنزلی کوٹھی بنوائی جو کوٹھی کلاں کے نام سے مشہور ہوئی۔''

---

[1] راقم نے یہ کاغذ نواب صادق حسین کربلائے امین الدّولہ کے پاس دیکھا ہے۔

حضرت غازی الدین حیدر کے عہد حکومت میں مرزا عباس شکوہ کی بیگم نے بہ سبب ناموافقت مہر کا دعویٰ کیا کل املاک دین مہر میں قرق ہوگئی۔ نواب امین الدولہ نے تخمیناً اٹھائیس ہزار روپئے کو مول لی۔ شہزادہ موصوف ٹیپو خاں کے مکان میں اٹھ گئے۔ امین الدولہ نے اور آراضیات دوسرے لوگوں سے خرید کر باغ میں شامل کیں اور لاکھوں روپئے صرف کرکے امین آباد بازار وغیرہ بنوایا۔ کمال الدین حیدر نے مرزا عباس شکوہ کی املاک کی خریداری کا واقعہ عہد امجد علی شاہ[۱] کا بتایا ہے یہ درست نہیں ہے۔ شیخ صاحب کی تحقیق درست ہے۔ کیونکہ دیوان رندؔ میں امداد حسین خاں کے ایک باغ کی تاریخ ! ''باغِ ارم ''مستخرج کی گئی ہے۔ جس سے ۱۲۴۴ برآمد ہوتے ہیں۔ اس لئے یقینی طور پر یہ سودا غازی الدین حیدر شاہ کے زمانے میں ہوا۔

اس طرح پہلے امداد حسین خاں نے مرزا عباس شکوہ کی جائداد خریدی اور پھر پڑائن کا باغ بطور عطیہ شاہی انھیں ملا اور امین آباد کا بازار بسایا گیا۔ اسیرؔ کے بیان سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔[۲]

اب آپ امین آباد کی آبادی کی کچھ شاعرانہ تعریف ملاحظہ کریں۔

امین آباد کی لکھتا ہوں تعریف ہے بیشک وہ جگہ شایان توصیف
ثنائے او بہ عالم فرض عین است بنائے آں زامداد حسین است
نہ اس بازار کو بازار کہئے اگر کہئے تو پھر گلزار کہئے
کہوں میں کیا دکانوں کے قرینے نہ جلوے دیکھے یہ اب تک کسی نے
کوئی دیکھے جو صرافہ جہاں ہے تو مملو سیم و زر سے ہر دکاں ہے
جہاں سب پھول والوں کا ہے بازار حقیقت میں عجب تختہ ہے گلزار
بساطی کی دکانیں اک طرف ہیں ہزاروں مشتری واں زر بکف ہیں

---

[۱] سوانحات، ج ۱، ص ۱۷۵

[۲] معراج الفضائل

سلاح بازار میں ہتھیار نایاب ہر اک سے تیز تر ہے حکم نواب
وہاں انبار ہے خلقت کی بہبود سوائے ظلم، ہر اک شئے ہے موجود

چند ابیات وزیر کے قصر کی مدح میں بھی ملاحظہ فرمایئے۔

جو کوچہ ہے وہ دولت سے بھرا ہے وزیر ہند کی دولت سرا ہے
جلو خانہ میں وسعت اس قدر ہے کہ گویا سب جہاں پیش نظر ہے
در جنت سے ہر در ہے مشابہ صفا سے، آب کوثر ہے مشابہ
منبّت حسن سے خالی نہیں ہے فداہر نقش پر نقاش چیں ہے
منقّش سقف کا عالم کہوں کیا کہ پھولا ہے وہ ایک پھولوں کا تختہ [۱]

اس کے بعد میاں دلگیرؔ نے محل سرا کی آرائش وزیبائش کی کیفیت میں خوب زورطبیعت دکھایا ہے۔ ''مثنوی طرب'' جس سے یہ اقتباس کیا گیا رام پور کے کتب خانے میں محفوظ ہے اس کو ڈاکٹر اکبر حیدری نے منظومات دلگیرؔ میں شائع کر دیا ہے۔''

اب آپ اس کے علاوہ امین الدولہ کی دوسری جائدادوں کی کیفیت اور پھران کی بربادی کا حال دیکھیں۔ شیخ صاحب رقمطراز ہیں:

''ان جائدادوں کے علاوہ نواب امین الدولہ کی بہت سی املاکیں شہر لکھنؤ میں تھیں اور ایک سرائے سڑک کانپور پر واقع تھی۔ متعدد مکانات و محل سرائیں تھیں۔ فیل خانہ شتر خانہ کوٹھی وزیر منزل و حمام، الماس باغ، احاطہ پختہ وخام فقیر محمد خاں کی مساجد اور گنج موسومہ پھوٹہا نواب گنج واقع ضلع اناؤ یہ سب چیزیں ملکیت نواب تھیں۔ امین الدولہ پارک کے مقابل جانب جو امین آباد پارک ہے جس میں گھنٹہ گھر ہے، یہ بھی نواب امین الدولہ کے باغ موسومہ گلاب باڑی میں بنا ہے۔ اس باغ میں داخلہ کے لئے نظیر آباد کے چوراہے کے قریب ایک عالی شان پھاٹک تھا جس کو راقم الحروف (شیخ تصدق حسین

---

[۱] منظومات میاں دلگیر، ص ۱۱۱-۱۱۲

صاحب) نے بچشم خود دیکھا تھا۔ اس املاک کے علاوہ وہ کل جائداد جس پر ممتاز دارالیتامیٰ اور ورثاء جناب شیخ ممتاز حسین صاحب بیراسٹرائٹ لا بذریعہ بیع قابض ہیں، سب نواب امین الدّولہ کی ہی تھی۔''[۱]

## وقف امین آباد

امین الدّولہ نے اپنے اکثر مکانات املاک و باغات اپنے اولادو ازواج کو ہبہ کردیا تھا۔ بعد میں جو جائداد وقف کرنا منظور تھا اس کا دستاویز وقف نامہ تحریر نہیں کر سکے تھے۔ دستاویز وقف نامہ کی تکمیل اشرف الدّولہ نے اپنے والد ماجد کی نیابت میں انھیں کی مہر سے کی۔ اس میں امام باڑہ وسامان عزا، پائیں باغ، اس کے عقب کی ایک سو دو قطعہ دوکانیں جو امام باڑے کے تین اطراف میں واقع تھیں اور سمت مغرب میں واقع کوٹھی کو اپنی اولاد اور اولاد الاولاد کے لئے وقف کیا تھا۔ مصارف مجالسِ عزا اور تزئین و ترمیم کے لئے ۳۸/اڑتیس پختہ اور خام دکان وقف تھیں بقیہ جائداد بھی وقف تھی۔ متولی اشرف الدّولہ اور ان کے بعد ان کی اولاد کو متولی بنایا تھا۔ او رکوٹھی درباری چونکہ تقاریب شادی و دیگر ضروریات شرعیہ کے لئے اور باورچی خانہ، پالکی خانہ اصطبل وغیرہ متولی کی رائے اور تجویز کے مطابق مشترک استعمال کے لئے تھے۔ اس لئے وقف میں یہ گنجائش رکھی گئی تھی کہ اگر متولی کی رائے دوسرے افراد خاندان کو نامناسب معلوم ہو تو معاملہ مجتہدالعصر کے سامنے پیش کیا جائے اور مجتہدالعصر کی تجویز پر عمل کیا جائے۔[۲]

جائداد وقفی اشرف الدّولہ کے زمانے میں سلامت رہی لیکن ان کے فرزند و جانشین نواب حامد حسین خاں کو بھائیوں سے مقدمہ بازی کرنا پڑی اور وہ ۱۸۷۲ء میں اگرچہ متولی مقرر ہو گئے تھے لیکن مقدمہ بازی کا سلسلہ جاری رہا۔ اور جائداد وقف وغیر وقف کا شاید

---

[۱] ماہنامہ الواعظ لکھنؤ ستمبر، ۱۹۴۶ء، ص ۱۹۔۲۰

[۲] نقل وقف نامہ امین آباد مرسلہ صادق حسین صاحب متولی کربلائے امین الدولہ

ہی کوئی حصّہ آج محفوظ ہو۔ پوری تفصیل کا معلوم ہونا تو عملاً ممکن نہیں ہے۔ لیکن شیخ تصدق حسین نے جو معلوم تھا وہ نذر قرطاس کر دیا:

امین الدولہ کی زوجۂ ثانیہ عباسی بیگم کی رحلت پر ان کی جائداد میں ۴ (چار آنے) بطور حق شوہری محمد باقر کو ملے اور ۶/ (چھ آنے) وزیر النساء خانم، دختر کو جو نواب امین الدولہ سے تھیں اور باقی چھ آنے دوسری بیٹی مہدی بیگم کو ملے جو سید مصطفی سے تھیں۔ محمد باقر نے اپنا حصّہ بقدر ۴/ (چار آنے) علیحدہ کر کے وزیر منزل لے لی جو محل سرا کی نشست گاہ تھی اس کو آخر میں شیخ فرزند علی صاحب وکیل نے خریدا۔ محل سرا کو ۱۹۰۷ء میں افسر جہاں بیگم صاحبہ زوجہ جناب ممتاز حسین صاحب بیرسٹر نے دس ہزار روپے کو خریدا۔

۱۹۱۳ء میں جب میونسپل بورڈ لکھنؤ نے امین الدّولہ کی کوٹھی وغیرہ لے کر پارک بنانے کو کھود کر ہموار کر دی تو مسٹر ممتاز حسین نے امام باڑہ مرزا اسکندر شکوہ کی عمارت مبلغ تین ہزار روپے کو بحیثیت سکریٹری انجمن اصلاح المسلمین میونسپل بورڈ لکھنؤ سے بنام انجمن مذکور خرید کر اس میں یتیم خانہ قائم کیا جس کا نام بعد میں موصوف کی یادگار میں ممتاز الیتامیٰ رکھا گیا جو تا حال عمارت مذکور میں برقرار ہے اور کامیابی سے چل رہا ہے۔[1]

## کربلا اور اس کا وقف

عہد غازی الدین حیدر میں جب میر خدا بخش متوطن فیض آباد نے اپنی شبیہ کربلا میاں الماس علی خاں کی شبیہ کربلا کے متصل حسن علی کپتان کی چھاؤنی میں بنوانے کا عزم کیا۔[2] امداد حسین خاں نے استدعا کی کہ تعمیر کی لاگت میں کچھ رقم ان کی بھی شامل کر کے شریک ثواب کر لیا جائے۔ میر صاحب رضامند نہیں ہوئے اس بات کی چبھن انھیں برابر

---

[1] ماہنامہ الواعظ لکھنؤ، فروری، ۱۹۴۸ء، ص، ۴۲

[2] سوانحات، ج، ا، ص ۲۳۹

رہی اور انھوں نے موضع دریاپور یا دریا گنج سپہ میں وسیع رقبہ آراضی لے کر ۶۴ھ میں سلطان العلماء مولوی سید محمد[1] سے سنگ بنیاد نصب کرایا اور ۱۲۶۶ھ میں اس کی تعمیر مکمل ہوئی۔ اس تعمیر مبارکہ کی بہت سی تاریخیں نظم کی گئیں۔ شیخ تصدق حسین نے حسب ذیل تاریخیں اپنے معلوماتی مضمون میں نقل کی ہیں۔

کرد تعمیر چو نواب امین الدولہ
مرقد پاک علمدار شہ عرش مقام
برقِ تاریخ رقم کرد بامداد حسین
شد بنا مشہدِ عباس علمدار حسین

دوسری تاریخ یہ ہے۔

اِنَّ ھٰذا مرقد العبّاس

تیسری یہ ہے۔

امین الدولہ نواب فلک جاہ
کہ دارد الفت آل پیمبر
بنا فرمود چوں درگاہ عباسؑ
سلام حق برو تا روز محشر
چنیں تاریخ سالش گفت ہاتف
بناشد خواب گاہ ابن حیدر[2]

امین الدّولہ نے اس روضے کو اپنی اولاد، بعض ازواج، اقارب شیعہ و بعض سادات و مومنین کے لئے جو نیکی میں شہرت رکھتے ہوں وقف خاص قرار دے کر اپنے فرزند

---

[1] تحقیقی نوادر، حاشیہ (۱) ص، ۴۲۹
[2] ماہنامہ الواعظ لکھنؤ، ستمبر ۱۹۴۶ء، ص ۱۵

اشرف الدولہ احمد حسین خاں بہادر کو متولی قرار دیا۔ تولیت کو ان کی نسل میں جوان کا قائم مقام ہوا۔ اس کے لئے مخصوص کیا[1] لیکن بائیس ہزار روپۓ کے نوٹ جو اسی کربلا کی ضروریات کے لئے تھے جناب زبدۃ العلماء مولوی سیّد نقی صاحب کے نام خرید لئے۔ مگر وہ نوٹ زبدۃ العلماء کے پوتے مولوی سعادت حسین کے وقت میں ضائع ہو گئے۔ جس کی وجہ سے کربلائے امین الدولہ کی آمدنی بہت محدود ہے اور اخراجات بہ مشکل پورے ہوتے ہیں مگر سو بیگھا کے قریب زمین ایسی ہے جو شیعہ اموات کے دفن میں کام آتی ہے۔

وزارت سے سبکدوشی کے بعد امین الدولہ کی زندگی ایسی ہی مصروفیتوں میں گزری۔ امور سلطنت میں نواب امین الدولہ کا نام تب نظر آتا ہے جب سلطنت سے دست برداری کے دستاویز پر دستخط کے لئے سلطان عالم کو آمادہ کرنے کے لئے انھیں یاد کیا گیا۔ پری پورنانندورما لکھتے ہیں:

"انگریز چاہتے تھے کہ کسی طرح بادشاہ راضی نامے پر دستخط کر دیں تو دنیا کے سامنے انکی اخلاقی حیثیت پر آنچ نہ پہونچے۔ جب علی نقی خاں کوشش کر کے ہار گئے تو جنرل اوٹرم نے امین الدولہ کو بلا بھیجا۔ وہ بھی بادشاہ کو سمجھانے گئے پر سامنے جا کے کچھ کہنے کی ہمت نہ پڑی گھر واپس پہنچے تو ان پر لقوہ گرا۔ کچھ مہینے چارپائی سے لگے رہے اور چل بسے۔"[2]

## انتقال

انتقال کے بارے میں یہ تو یقینی طور پر معلوم ہے کہ یہ حادثہ ۱۲۷۳ھ میں پیش آیا۔ ان کے عہد میں دیوان خانہ وزارت کے منشی مظفر علی خاں اسیرؔ نے قطعہ تاریخ نظم کیا۔

---

[1] نقل وقف نامہ مرسلہ نواب صادق حسین صاحب

[2] دیوان اسیر ص، ۴۷۹

کوچ از منزل جہاں فرمود آنکہ او بود در وزارت صدر
سال تاریخ فوت گفت اسیرؔ خواب گاہ وزیر عالی قدر

آخری مصرع سے ۱۲۷۳ھ برآمد ہوتے ہیں۔

لیکن ماہ و تاریخ کی دریافت میں قطعیٔ اور یقینی بات معلوم نہیں ہوسکی۔ نواب صادق حسین صاحب متولی کربلائے امین الدولہ نے ازراہ کرم مجھے اطلاع دی ہے کہ ۹؍جمادی الثانی ۱۲۷۳ھ شب چہارشنبہ ۹ بجے شب میں انتقال فرمایا۔ لیکن اس تاریخ کو قبول کرنے میں اس لئے دقت ہے کہ اگر یہ تاریخ درست مانی جائے تو یہ انتزاع سلطنت کے تقریباً ایک سال بعد کا واقعہ ہوگا۔ اور انتزاع سلطنت کے بعد امین الدولہ کا سال بھر زندہ رہنا غالباً کسی مورّخ نے تحریر نہیں کیا ہے اس لئے جو تاریخ ڈاکٹر سید سلیمان حسین نے اپنے مجموعہ مضامین ''لکھنؤ کے چند نامور شعرا'' میں لکھی ہے اسے قرین قیاس ہونے کی بناء پر قابل قبول ہونا چاہیے۔ اعتماد کلی اس پر بھی نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ڈاکٹر سلیمان نے نہ تو اپنے مضمون میں ماخذ کا حوالہ دیا ہے اور نہ دریافت کرنے پر بتاسکے۔ بہرحال موصوف تاریخ وفات ۱۲؍محرم ۱۲۷۳ھ مطابق ۱۳؍ستمبر ۱۸۵۶ء بتاتے ہیں۔[۱]

چونکہ ڈاکٹر سلیمان، نواب حامد حسین خاں مرحوم کے نواسے ہیں اس لئے ہوسکتا ہے کہ انھیں یہ تاریخ اپنے بزرگوں سے معلوم ہوئی ہو مگر یہ راز رکھنے کی بات تو نہیں۔

❑❑

---

[۱] لکھنؤ کے چند نامور شعراء، ص، ۱۷۹

# سلطان العلماء

## سمی ختمِ رسل قبلۂ ملک آداب

بابش علی و ختم رسل جد امجد است
اسمش جناب حضرت سیّد محمد است
در راستی چو حرف نخستینِ ابجد است
بالا نشین منبر وایوانِ مسند است
ایمن شد است شهر ز طور جمالِ او
اے من فدائے نورِ چراغِ کمالِ او

مرزا اسلامت علی دبیرؔ

(۷)

# سلطان العلماء

## سمی ختم رسل قبلۂ ملک آداب

شمالی ہند میں تشیع کا احیا غفران مآب مولوی دلدار علی صاحب کا تاریخی کارنامہ ہے جو آپ نے نواب آصف الدولہ اور ان کے نائب سرفراز الدولہ حسن رضا خاں کی توجہ سے انجام دیا۔ لیکن آپ کے فرزند اکبر اور جانشین مولوی سید محمد کو حالات نے زیادہ عہد آفریں شخصیت ثابت کیا۔ آپ علمی دنیا میں سلطان العلماء کے شاہی خطاب سے مشہور ہوئے۔ دربار میں بہ اتباع شاہی قبلہ و کعبہ اور گھر میں بڑے آپ[۱] کہے جاتے تھے۔ عہد امجد علی شاہ اور بعد کی تاریخ میں مجتہد العصر اور بعد وفات رضواں مآب کے لقب سے یاد کئے گئے۔

## ولادت

مولوی سید دلدار علی نے اپنے سب سے بڑے فرزند کی ولادت سے قبل جو ۱۷ رصفر ۱۱۹۹ھ واوائل ۱۷۸۴ء کو واقع ہوئی، خواب میں دیکھا کہ حضرت حجتؑ (بارہویں امام عجل اللہ ظہورہ) فرماتے ہیں کہ اس مولود کی تربیت مجھ سے متعلق ہے۔ اسی[۲] بناء پر آپ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے فخر حاصل ہے اور میں بجا طور پر کہتا ہوں کہ امام منتظرؑ میری پرورش کے

---

[۱] تاریخ سلطان العلماء، ص ۱۱

[۲] تاریخ سلطان العلماء، ص ۱۷

کفیل ہوئے ہیں۔

## تعلیم و تربیت

مصنّف تاریخ سلطان العلماء کا فرمانا ہے کہ ایسے علماء کم ہوں گے جنھوں نے صرف اپنے والد ماجد سے تحصیل علم کی ہو۔[۱] جناب مصنّف کی حیثیت خاندان اجتہاد میں ''اہلبیت'' کی ہے اور یقیناً گھر کے حالات سے بہتر واقف ہوں گے۔ لیکن اسی کے ساتھ خاندان فرنگی محل میں اسی حیثیت کے مالک، مصنّف، بانی درس نظامی کا فرمانا ہے کہ مولانا سید دلدار علی نصیر آبادی کے فرزند مولانا سیّد محمد مجتہد نے مولانا حیدر علی سندیلوی سے پڑھا تھا۔[۲] ان متضاد بیانات پر محاکمہ فی الوقت میرے لئے ممکن نہیں ہے۔ بہر کیف جناب نے تحصیل علم میں ایسی جانفشانی کا مظاہرہ کیا کہ ۱۹ سال کی عمر میں تکمیل تحصیل ہوگئی اور مجسمہ علم و کمال باپ نے اس لائق پایا کہ اجازۂ اجتہاد عطا کریں۔

## والد کے شریک کار

اجازۂ اجتہاد سے مزین ہونے کے بعد آپ نے اپنے والد ماجد کی ذمہ داریوں میں ان کا ہاتھ بٹانا شروع کیا اور یہ چھوٹے بھائیوں کی تعلیم و تربیت میں آپ کا اشتغال تھا۔ اگرچہ اپنے پانچوں فرزندوں کی تعلیم کی اساس خود غفران مآب قائم کر چکے تھے مگر چار بھائیوں کی تکمیل سلطان العلماء کی مجلس درس میں ہوئی۔ چنانچہ خود حضرت سید العلماء اپنی ایک تحریر میں لکھتے ہیں ہم نے اور ان کی سب اولاد نے سلطان العلماء ہی کے انوار علوم سے فائدہ اٹھایا۔[۳]

---

[۱] وہی، ص ۱۷

[۲] بانی درس نظامی، ص ۱۲۹

[۳] تاریخ سلطان العلماء ص، ۲۳

سید العلماء مولانا سید حسین، آپ کے سب سے چھوٹے بھائی تھے جو آپ کے برابر کے شریک کار و معاون رہے۔ مولانا آغا مہدی صاحب مصنف تاریخ سلطان العلماء جو سید العلماء کی چھوتھی پشت میں ایک ذی علم اور بالغ نظر مصنف ہیں سلطان العلماء کو اعلم سمجھتے ہیں، اسی نقطۂ نظر کی وکالت موصوف نے اپنی تصنیف تاریخ سلطان العلماء میں فرمائی ہے ملاحظہ ہو۔[1]

مگر مفتی میر عباس شوشتریؒ جو سید العلماء کے جید تلامذہ میں ہیں اور جنھیں اس دودمان ہدایت نشان سے بڑی قربت، حالات کی گہری واقفیت اور خود سلطان العلماء سے زبردست عقیدت تھی، سید العلماء کی مدح میں کہتے ہیں ۔

امامی کہ در کشور اجتہاد چو او مادر دہر ہرگز نہ زاد

اور یہ بہت بڑی اور معاصر شہادت ہے۔ خاندان اجتہاد کے موجودہ سر براہ جو سلطان العلماء کے منجھلے (چوتھے) بھائی سید مہدیؒ کی نسل میں ہیں یعنی مولانا الحاج سید کلب عابد صاحب، آپ نے بھی ایک گفتگو میں یہی بتایا کہ اعلمیت وافقہیت جناب سید العلماء کے لئے تھی۔ یہی اعلم زمانہ سلطان العلماء سے اپنے استفادہ کا ذکر فرماتے ہیں:

"میں نے اپنی تعلیم کی ابتداء اور انتہا دونوں میں اپنے والد ماجد غفران مآب کی خدمت میں پڑھا لیکن وہ جناب میرے دوران تعلیم علیل ہو گئے جس کی وجہ سے میرا درس اخی معظم مجد اوحد جناب سید محمد کے حوالے کر دیا ہے لہٰذا میں طویل مدت تک ان جناب کی خدمت میں، علوم عربیہ میں معانی و بیان، بعض علوم حکمیہ وفنون رسمیہ اور بعض علوم دینیہ کی تحصیل میں مشغول رہا۔ جب علامہ آفاق والد ماجد کو مرض سے افاقہ ہوا تو پھر میرا درس ان کے یہاں ہونے لگا۔[2] ترجمہ

---

[1] سلطان العلماء کی اہمیت، ص ۳۷

[2] مضمون نوشتہ راقم، ماہنامہ الواعظ اگست، ۱۹۷۴ء، ص، ۱۸

## دربار اودھ سے روابط

آصف الدولہ اور سعادت علی خاں کا زمانہ غفرآن مآب کے سامنے گزرا اور قدر دانی کے ساتھ غازی الدین حیدر شاہ کے عہد سلطنت میں ۱۲۳۵ھ میں غفرآن مآب نے رحلت فرمائی اسی دور سے زیر سطح بے چینی کا آغاز ہوا۔ ہندوستان میں صوبہ اودھ کی حیثیت جب تک خود مختار نہ تھی فرماں روایان اودھ کے تصرفات صحیح تھے۔

جس وقت نوابی کا اختتام اور سلطنت کی بنیاد قائم ہوئی تو اس اقدام کے جواز کے سامنے سوالیہ نشان لگ گیا۔ پھر بھی غفرآن مآب کا عہد بخیر وخوبی گزرا۔ غازی الدین حیدر سے مولانا سید محمد کا تعلق بس واجبی سا رہا۔ لیکن نصیر الدین حیدر شاہ کا دور آتے ہی کش مکش شروع ہوگئی۔ یہ روداد آپ خاندان اجتہاد کے ایک اور اہل قلم سید محمد باقر شمس لکھنوی کے قلم سے دیکھیں:

''غازی الدین حیدر کے بعد نصیر الدین حیدر تخت حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ سلطان العلماء کی بڑی آؤ بھگت کی۔ ولی عہدی کے زمانے میں اپنی طرف مائل سمجھ کے، مگر تخت پر بیٹھتے ہی ان سے ٹکر ہوگئی۔ ایک عورت سے (جسے اس کا شوہر چھوڑ چکا تھا، مگر شرعی طور پر طلاق نہیں ہوا تھا) نکاح پڑھنے کے لئے طلب کیا انھوں نے صاف کہہ دیا کہ شوہر اول سے افتراق شرعی طور پر ثابت نہیں، اس لئے میں نکاح نہیں پڑھوں گا بادشاہ کا چہرہ غصّہ سے متغیر ہوگیا اور آپ لاحول ولاقوۃ الا باللہ کہہ کے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس کے بعد شراب کے جواز کا فتویٰ اس صورت سے چاہا کہ طبیب حاذق نے بادشاہ کی زندگی کا انحصار شراب میں تجویز کیا ہے اس صورت میں حکم شرعی کیا ہے۔ تمام علمائے اسلام نے جواز کا فتویٰ دیا۔ سلطان العلماء جانتے تھے کہ اس بہانے شراب نوشی مقصود ہے جس طرح جان بوجھ کر طبیب حاذق کی غلط تجویز ہے اسی طرح مفتی کا فتویٰ غلط ہوگا۔ حقیقت تو یہی تھی مگر صورت مسئلہ میں طبیب حاذق کی رائے سے مخالفت مفتی کے لئے بے معنی

ہے۔اس لئے انھوں نے اپنی خداداد ذہانت سے کام لیا اور لکھ دیا ''لاشفاء فی الحرام'' (حرام چیزوں میں شفا نہیں) ان سے پہلے کسی نے اس محل پر اس حدیث کو پیش نہیں کیا تھا۔نصیر الدین حیدر کی تند مزاجی مشہور ہے یہ دوسری چھڑپ تھی۔اب رعب شاہی سے کام لینا چاہا اور ایک مسئلہ پوچھنے کے بہانے سے سلطان العلماء کو بلوایا۔ایک کرسی پر خود بیٹھے اور ایک کرسی سامنے رکھوا کر اس پر قلمدان رکھ دیا اور ارادہ کیا کہ جب سلطان العلماء آئیں گے تو تعظیم نہ کروں گا۔سلطان العلماء نے دروازے کے پاس پہونچتے ہی عربی قاعدے کے موافق بلند آواز سے یا اللہ کہا اور اندر داخل ہو گئے۔بے اختیار بادشاہ تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے اور وہ قلمدان اٹھا کے بیٹھ گئے۔بادشاہ دیر تک سناٹے میں رہے اور آخر میں ایک مسئلہ یوں ہی پوچھ کر رخصت کر دیا۔جب مصاحبین خاص نے پوچھا تو کہا جب وہ کمرے میں آئے معلوم ہوا کسی نے بغلوں میں ہاتھ دیکر کھڑا کر دیا۔مفتی میر عباس صاحب نے اسی واقعے کی طرف اشارہ کیا کہ ان کے چہرے میں تنہا وہ رعب وجلال تھا جو بادشاہوں کو لشکروں کے ساتھ نصیب نہ تھا۔

اس واقعہ سے سلطان العلماء سمجھ گئے کہ بادشاہ کو مخالفت پیدا ہو گئی ہے اور وہ توہین پر آمادہ ہیں، دوسری دفعہ جب بلائے گئے تو جانے سے انکار کر دیا۔نصیر الدین حیدر اس کی تاب کہاں لا سکتے تھے۔آگ بگولہ ہو گئے۔حکم دیا کہ مکان توپ سے اڑا دیا جائے۔شہر میں ہلچل مچ گئی رات کو یہ حکم ہوا تھا کہ بجلی کی طرح سارے شہر میں خبر دوڑ گئی۔ امرائے دربار دوڑے آئے کہ سلطان العلماء معافی مانگ لیں۔انھوں نے صاف انکار کر دیا۔رات لوگوں نے آنکھوں میں کاٹی۔صبح ہوئی شاہی فوج کے کپتان نواب مقبول الدولہ نے توپ خانے سے دو توپیں نکلوائیں۔ایک سلطان العلماء کے مکان پر چڑھ گئی دوسری محل سرائے شاہی پر۔صبح کو بادشاہ کی آنکھ کھلی معلوم ہوا کہ شاہی محل پر توپ چڑھ گئی۔حواس جاتے رہے پوچھا یہ توپ کیوں اور کس نے چڑھائی ہے؟ معلوم ہوا کہ شاہی فوج کے کپتان نے۔وہ کہتے ہیں کہ میری غیرت قبول نہیں کرتی کہ

بادشاہ دین کا مکان توپ سے اڑادوں اور بادشاہ دنیا کا محل کھڑا رہے۔ اس لئے میں اپنی دین و دنیا آج ختم کئے دیتا ہوں۔ احساس مذہبی نے بادشاہ کو چونکا دیا اور شرمندہ ہو کر اپنا حکم منسوخ کیا۔ کپتان کو ان کے جوش ایمانی پر گراں بہا خلعت عنایت کیا مگر سلطان العلماء سے زندگی پھر صفائی نہ رہی اگر چہ مذہبی امور کی انجام دہی انھیں کے ہاتھوں ہوتی رہی۔[۱]

محمد علی شاہ کے تخت نشین ہونے کے بعد حالات میں ہمواری پیدا ہوئی۔ محمد علی شاہ کا رجحان مزاج مذہب کی طرف تھا۔ اب امور خیر و خیرات کی طرف توجہ ہونے لگی اور احکام شرع کو گوش ہوش سے سنا جانے لگا۔ شمس صاحب اسی سلسلۂ بیان میں رقم طراز ہیں:

''انھوں نے جامع مسجد بنوائی اور سلطان العلماء سے نماز پڑھانے کی استدعا کی، انھوں نے کہا اس میں کچھ زمین نعیم خاں کی شامل ہوگئی ہے۔ اس لئے میں نماز نہیں پڑھاؤں گا۔ یہ بادشاہ نہایت متدین اور بیدار مغز تھے انھوں نے سلطان العلماء ہی کے سپرد اس کی تحقیقات کی اور کہا کہ شرعی حیثیت سے جواز کی صورت آپ نکال دیں، انھوں نے نعیم خاں کو بلوا کے معاوضہ پر راضی کیا اور بادشاہ سے معاوضہ دلوا کے نماز پڑھائی۔''[۲]

یہ دور بادشاہ دنیا اور نائب امام کے تعاون اور ہم آہنگی سے گزرا۔ امجد علی شاہ نے تخت نشین ہو کے سلطنت کے جواز کو شک و شبہ سے بالاتر قرار دینے کے لئے یہ حل تجویز کیا کہ تخت سلطنت سلطان العلماء کو سونپ دیا جائے مگر قبلہ و کعبہ نے اپنی طرف بڑھتے ہوئے تاج کو اپنے ہاتھ سے ان کے سر پر رکھا اور عہد و پیمان لیا کہ حکومت فقہ جعفری کے نظام الٰہی پر ہو۔''[۳]

---

[۱] شیعیت کی تاریخ، ص، ۳۹۔ ۳۷

[۲] وہی، ص، ۴۰

[۳] تاریخ سلطان العلماء، ص ۴۴

بادشاہ نے ممکن حد تک عہد پورا کیا اور نظم و نسق کا رخ حکومت الٰہیہ کی طرف حتیٰ الامکان ہوا۔ اس کی تفصیل بڑی حد تک آپ گزشتہ اوراق میں ملاحظ فرما چکے۔ یہ واقعہ خود شاہد عادل ہے کہ سلطنت کن حالات میں سلطان العلماء کی طرف بڑھی۔

## خطاب

امجد علی شاہ نے قبلہ و کعبہ کے لئے حسبِ ذیل خطاب تجویز فرمایا تھا:

''مجمع علوم دین، مرجع سادات و مومنین، حافظ احکام الٰہ، مورد اعتقادات امجد علی شاہ، سلطان العلماء مجتہد العصر مولانا سیّد محمد صاحب۔ لیکن خود سلطان العلماء کی تجویز پر 'مورد اعتقادات' کو 'مورد عنایات' سے بدل دیا گیا۔''

امجد علی شاہ اور سلطان العلماء کے روابط پر یہاں پھر سے اظہار خیال کی ضرورت نہیں، گذشتہ اوراق میں حسبِ ضرورت بحث ہو چکی ہے۔ اب ہمیں سلطان عالم واجد علی شاہ سے سلطان العلماء کے روابط کو دیکھ لینا چاہیئے جناب شمسؔ لکھتے ہیں:

''ولی عہد واجد علی شاہ پر ایک زن بازاری نے دعویٰ دائر کیا کہ وہ میری حضانت سے ایک لڑکی کو زبردستی لے گئے۔ مقدمہ کی سماعت ہوئی اور فریقین کے ثبوت و بیان کے بعد فیصلہ ہوا کہ اس کی رقیت شرعی نہج سے ثابت ہوئی لہٰذا ولی عہد بہادر کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ فوراً اس لڑکی کو مدعیہ کے سپرد کر دیں۔ واجد علی شاہ نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔ اسی طرح کا ایک واقعہ یہ بھی تاریخوں میں موجود ہے کہ واجد علی شاہ نے ولی عہدی کے زمانے میں کسی عورت کو اپنے تاہّل میں لانا چاہا جو اُن پر حرام تھی۔ فتویٰ پوچھا جواب نفی میں ملا۔ جب بادشاہ ہوئے تو خیال ہوا کہ شاید اب مرعوب ہو جائیں۔ کہلوایا کہ کیا اس حکم پر نظر ثانی کی گنجائش ہے؟ سلطان العلماء نے جواب دیا کہ حَلَالُ مُحَمَّدٍ حَلَالٌ اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَةِ وَحَرَامُ مُحَمَّدٍ حَرَامٌ اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَةِ[1] (یعنی حضرت پیغمبر آخر الزماں

---

[1] شیعیت کی تاریخ، ص ۴۵

نے جو چیزیں حرام یا حلال کردی ہیں، اس میں قیامت تک تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ چونکہ سلطان العلماء کا اصلی نام محمد تھا۔ اس لئے الفاظ حدیث بہت پُر معنی ہوگئے۔)''

# انتزاع کے بعد

واجد علی شاہ کے عہد میں بھی یہی صورت حال برقرار رہی، بادشاہ کو علماء کے احترام و اکرام کا خود بہت خیال رہتا تھا اور تمام نظم ونسق تقریباً اسی نہج پر رہا جو ان کے والد جنت مکان کے عہد میں تھا۔ انتزاع سلطنت کے بعد جب تحریک آزادی کی لہر آئی تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سلطان العلماء کو کسی ناگوار صورت حال کا سامنا ہوا۔ مولوی اعجاز حسین صاحب ابن مولوی محمد قلی صاحب نے لکھنؤ پہونچ کر تمام امور بخیر وخوبی انجام کو پہونچائے۔[1]

انگریزوں نے بھی قبلہ وکعبہ کی قدردانی سے کام لیا۔ حاضریٔ عدالت اور اسلحے کے لائسنس سے مستثنیٰ تھے۔ دربار میں کرسی بھی ملتی تھی۔[2] دربارِ اودھ سے جو معافی و مراعات تھی وہ بھی بحال کی گئی۔

# علمی خدمات

اگرچہ سلطان العلماء کے اوقات عزیز عدالتی فرائض اور دربار سے متعلق دوسرے امور میں بہت بڑی حد تک صرف ہوتے تھے لیکن اس کے باوجود آپ نے تصانیف و تلامذہ کی بڑی تعداد اپنی یادگار چھوڑی ہے آپ پہلے فرد تصنیفات ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ اجازہ روایت واجتہاد برائے ممتاز العلماء سید تقی صاحب، مطبوعہ ۱۸۶۴ء

۲۔ اجازہ برائے عمدۃ العلماء سید ہادی صاحب قبلہ

۳۔ احیاء الاجتہاد، اصول فقہ

---

[1] تذکرۂ بے بہا، ص، ۸۔ ۷

[2] وہی

۴۔ دررد عبدالحیی

۵۔ اصل الاصول

۶۔ بارقۂ ضیغمیہ (یہ کتاب تحفۂ اثناعشریہ کے بعض مباحث کے جواب میں ہے)

۷۔ بشارت محمدیہ

۸۔ بوارق موبقہ (یہ کتاب تحفہ اثناعشریہ کے بعض مباحث کے جواب میں ہے)

۹۔ برق خاطف

۱۰۔ کتاب مبسوط (یہ کتاب تحفہ اثناعشریہ کے بعض مباحث کے جواب میں ہے)

۱۱۔ ثمرۃ الخلافۃ

۱۲۔ حفاظ قرآن امامیہ

۱۳۔ حاشیہ حمداللہ

۱۴۔ رسالہ حل مسئلہ جذر اصم

۱۵۔ حاشیہ شرح صغیر

۱۶۔ رسالہ تحقیق نجاست عرق جنب بحرام

۱۷۔ رسالہ ضیق و وسعت در نماز قضا

۱۸۔ رسالۂ جمعہ

۱۹۔ سبع مثانی۔ (تجوید میں)

۲۰۔ سیفٌ ماسحٌ مسح علی الرجلین

۲۱۔ سُمّ الفارِ

۲۲۔ شرح زبدۃ الاصول

۲۳۔ صمصام قاطع

۲۴۔ ضربت حیدریہ۔ دو ضخیم مجلدات

۲۵۔ طعنُ الرّماح

۲۶۔ عجالہ نافعہ
۲۷۔ فوائد نصیریہ
۲۸۔ قتال النواصب
۲۹۔ گوہر شاہوار
۳۰۔ کشف الغطا
۳۱۔ لوعلم ابوذر ما فی قلب سلیمان
۳۲۔ منہاج التدقیق
۳۳۔ شرح جعفریہ محقق شیخ علی
۳۴۔ تفضیل سادات بر مشائخ
۳۵۔ اجازۂ شقشقیہ بحق ملک العلماء بندہ حسین
۳۶۔ جوابات، سوالات علی بن شدقم
۳۷۔ حاشیہ بر معالم الاصول
۳۸۔ جدول، تاریخہائے سعد و نحس وولادت ووفات آئمۂ معصومینؑ
۳۹۔ احقاق الحق: اسی نام کی ایک مشہور کتاب شہید ثالث نور اللہ شوستری کی بھی ہے مگر سلطان العلماء نے بھی اس نام سے ایک کتاب لکھی ہے۔
۴۰۔ تحریرات سلطان العلماء رام پور کے کتب خانے میں ہیں۔ جن میں تاریخ اودھ اور انتزاع سلطنت پر بحث ہے۔[۱]

## تلامذہ

یہ ابھی ہم دیکھ چکے ہیں کہ سلطان العلماء اپنے نامور چھوٹے بھائیوں اور بیٹوں کی تعلیم کے کفیل رہے ہیں۔ ان کے علاوہ انہوں نے لاتعداد بچوں کی بسم اللہ بھی کرائی ہے۔

---

[۱] مصنفات کے نام تاریخ سلطان العلماء سے بصد تشکر لئے گئے ہیں۔

ان کے علاوہ جن افراد نے ان کے سامنے با قاعدہ زانوئے ادب تہہ کر کے اکتساب علم و کمال کیا ہے ان میں سے جو نام معلوم ہو سکے ہیں۔ وہ پیش کئے جارہے ہیں:

۱۔ میرزا جعفر علی فصیح[1]

۲۔ قاضی آغا سید صاحب جائسی

۳۔ میر اولاد حسین صاحب

۴۔ محسن رضا صاحب۔ صاحب تذکرہ بے بہا[2] نے ان دونوں حضرات کو ایک ہی شخص قرار دیا ہے صاحب تاریخ سلطان العلماء[3] انھیں الگ الگ فرد قرار دیتے ہیں اور آغا سید صاحب جائسی کا اصل نام محمد رضا بتاتے ہیں۔

۵۔ مولوی سید شاہ بخاری

۶۔ قاری سید جعفر علی جارچوی

۷۔ مولوی سید دیدار جہاں محدّث

ان بزرگوار کو صاحب تاریخ سلطان العلماء نے بڑا گاؤں ضلع فیض آباد کا متوطن بتایا ہے اور استاذی مولانا خادم حسین صاحب مرحوم کو ان کی اولاد دختری میں شمار کیا ہے۔[4] راقم کا خیال ہے کہ یہ بزرگ راجہ ارادت جہاں رئیس خراسان (اب خراسوں ضلع اعظم گڑھ) کے احفاد میں تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ان کے یعنی راجہ ارادت جہاں کے انگریزوں کے دست ظلم سے کشتۂ ستم اور علاقہ ضبط ہو جانے کے بعد اس خاندان نے رودھولی ضلع جونپور میں پناہ لی اور اب بھی وہیں آباد ہے۔[5]

اس خاندان کا تعلق بڑا گاؤں ضلع جونپور سے بھی ہے اور غالباً یہی نام کی وحدت سبب

---

[1] تحقیقی نوادر، ص ۲۰۰

[2] ص ۳۴۲

[3] ص ۱۵۸

[4] ص ۱۵۹

[5] سید اقبال احمد جونپوری مشرقی راجیہ جونپور کا اتہاس، ص، ۵۔ ۲۹۴

غلط فہمی ہوئی ہے۔ شاہ گنج اعظم گڑھ (یوپی) کی چھوٹی لائن پر دیدار گنج ریلوے اسٹیشن غالباً انھیں بزرگ کی یادگار ہے۔

۸۔ مفتی سردار مرزا صاحب

۹۔ مولوی سید سرفراز حسین صاحب۔ مرزا غالبؔ اسی مناسبت سے ان بزرگ کو مجتہد العصر، اور سلطان العلماء سے بطور مزاح یاد کرتے تھے۔ میر مہدی مجروحؔ کے نام کے خطوط میں ان کا ذکر بہت آیا ہے۔

۱۰۔ مولوی میر سید علی صاحب محدّث

۱۱۔ مولانا علی حسن صاحب جائسی

۱۲۔ مولوی میر برکت علی صاحب

۱۳۔ مولانا سید حامد حسین صاحب فردوس مآب

۱۴۔ مولوی مرزا محمد بن علی محمد فیض آبادی

۱۵۔ مولوی سید محمد صاحب

۱۶۔ مولوی مشرّف علی صاحب

۱۷۔ مولوی عبد العلی صاحب

۱۸۔ مولانا سید ابو القاسم قمی صاحب

## ازواج و اولاد

مولانا سید محمد کی شادی چودہ سال کی عمر میں اپنی خالہ زاد بہن دختر سید محمد صالح ابن سید ابو الفضل[1] سے ہوئی۔ ان کے علاوہ چھ بیویاں اور ہوئیں اور صاحب تاریخ سلطان العلماء کے بیان سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ یہ سب کی سب امہات اولاد تھیں۔

---

[1] دوحہ ہاشمیہ قلمی کتب خانہ ریاست لورپور، فیض آباد

گیارہ بیٹے اور چھ بیٹیاں[1] خدا نے دیں۔ صاحب تذکرۂ بے بہا کے بیان کے مطابق ان کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں:

(۱) منصف الدّولہ سید محمد باقر صاحب

(۲) مولوی محمد صادق صاحب

(۳) خلاصۃ العلماء سید محمد مرتضیٰ صاحب

(۴) مولوی سید عبداللہ صاحب

(۵) ملک العلماء جناب بندہ حسن صاحب

(۶) ڈپٹی مولوی سید علی اکبر صاحب

(۷) تاج العلماء جناب سید علی محمد صاحب

(۸) مولوی غلام حسین صاحب

(۹) مولوی سید محمد علی صاحب

دو حضرات کا نام نظر سے نہیں گزرا۔ صاحبزادیوں کا نام معلوم ہونے کا تو امکان ہی نہیں ہے، وہ کہاں منسوب ہوئیں پیش نظر دو ماخذوں میں اس کا ذکر بھی نہیں ہے۔ تاریخ سلطان العلما سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ سلطان العلماء کی ایک صاحبزادی ان کے حقیقی برادر زادے سید ہادی صاحب خلف سید مہدی صاحبؒ سے منسوب تھیں۔ سلطان العلماء کی ایک صاحب زادی فاطمہ صغریٰ نصیر آباد بیاہ کر گئیں۔ ان کے بطن سے سید عسکری صاحب پیدا ہوئے۔ ان کو سید العلماء کی دختر طیّبہ بیگم منسوب ہوئیں۔ ان کے انتقال کے بعد دوسری صاحبزادی امّ سلمہ کا عقد ہوا۔ ان کی نسل بھی باقی ہے۔[2]

---

[1] تاریخ سلطان العلماء، ص ۱۶۹

[2] تاریخ سلطان العلماء، ص ۱۰۵

# سلطان العلماء کی زندگی کے چند اہم واقعات

سلطان العلماءؒ کو اپنی طویل زندگی میں حکومت شرعیہ کے قیام، رقوم زکوٰۃ وخمس کی مستحقین شرعی میں تقسیم اور اسی طرح کے مسائل کے علاوہ بعض نہایت اہم اور دوررس اثرات کے حامل واقعات کا سامنا کرنا پڑا جنہوں نے جناب کی عام مقبولیت کو متاثر کیا۔ یہ واقعات ایسے تھے جن میں فقہ جعفری کے عالم اور پیشوا کی حیثیت سے ان کے لئے راہِ عمل وہی تھی جو انھوں نے اختیار کی، کوئی بدل ممکن نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو اس طرح سمجھا نہیں جا سکا، جس طرح سمجھا جانا چاہیئے تھا۔ آیئے! اب انھیں کسی قدر بسط سے دیکھیں۔

سب سے پہلی منزل تو ہندوستان کے انگریزی عہد میں دارالحرب ہونے کا مسئلہ تھا۔ شاہ عبدالعزیز دہلوی اور ان کے پیرو ہندوستان کو اس وقت انگریزی راج میں دارالحرب سمجھتے تھے اس لئے جہاد کا سزاوار جانتے تھے۔ فقہ جعفری میں شرائطِ جہاد کی شدتیں اور سختیاں اتحاد عمل کی راہ میں سنگ گراں تھیں اور اس نے انفرادی طور پر نہیں جماعتی پیمانے پر بُعد پیدا کیا۔

سید احمد شہید تو ان حضرات کے ہم وطن ہی تھے۔ ان کی قربانی نے پورے صوبے کو ہلا کے رکھ دیا مگر وہیں اسی اصول کہ ''غیبت امام میں جہاد نہیں'' کی فقہی پابندی نے شیعہ عناصر کو عملی ہمدردی سے کنارا کش رہنے پر مجبور کر دیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ میں بھی اعلانیہ اور اجتماعی اقدام میں بھی یہی رکاوٹ رہی۔

سلطان عالم واجد علی شاہ کے زمانے میں مسجد اجودھیا کی بے حرمتی اور مولوی امیر الدین علی کی عزیمت نے بھی غلط فہمیاں پیدا کیں۔ عملی اقدام کی حمایت یا شرکت کر نہیں سکتے تھے، ایک استفتا کے جواب میں بہت واضح فتویٰ دیا۔

''اہل اسلام وایمان سے کافروں اور لیئموں کے شر کا دفع کرنا حکّام اسلام کا فریضہ ہے۔''[1]

---

[1] مرزا جان حدیقۃ الشہدا ص ۱۴۱

مگر بدگمانی نے اس سیدھے سادھے بالکل بے لاگ فتوے کے معنی پہنائے کہ اس سے قتل سنّیان مقصود ہے، وہ اس پردے میں موجود ہے[1] اس کا سلطان العلماء کیا علاج کرتے!

اسی زمانے میں کچھ پہلے حضرت ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ ظفرؔ شہنشاہ ہند نے سلطان العلماء کے نام ایک مراسلہ بھیج کر مذہب شیعہ قبول کرنے کی اطلاع اور درگاہ حضرت عباسؑ میں چڑھانے کے لئے علم مبارک بھیجا۔ اس وقعہ کی ضروری تفصیل آپ پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیبؔ کے حقائق نگار قلم سے ملاحظہ کریں:

''علم کے قضیئے کے متعلق خود مرزا حیدر شکوہ کا بیان ہے کہ جس زمانے میں وہ کلکتے میں مقیم تھے بہادر شاہ ظفرؔ بیمار ہوئے، اسی بیماری کی حالت میں انھوں نے ایک خواب میں خود کو حضرت عباس کی درگاہ میں علم چڑھاتے ہوئے دیکھا اور ایک خط میں مرزا حیدر شکوہ کو اس خواب کا حال لکھ بھیجا۔ جب بہادر شاہ کو صحت ہوئی تو انھوں نے ایک سونے کا علم بنوا کر مرزا حیدر شکوہ کے بھائی میرزا نورالدین کے پاس لکھنؤ بھیجا۔ جب حیدر شکوہ کلکتے سے واپس آئے اور بہادر شاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے اس خواب اور علم کا حال زبانی بھی ان سے بیان کیا اور لکھنؤ کے مجتہد سلطان العلماء مولوی سید محمد صاحب کے نام ایک خط لکھ کر مرزا حیدر شکوہ کی معرفت روانہ کیا۔ انھیں کے ہاتھ ایک خط مرزا نورالدین کو بھی بھیجا۔ جس میں ان کو لکھا کہ معلوم نہیں کہ علم حضرت عباسؑ کو درگاہ میں چڑھا دیا گیا یا نہیں۔ اگر نہ چڑھایا گیا ہو تو جلد چڑھا دیا جائے۔ قصّہ مختصر مرزا حیدر شکوہ کی معرفت بہادر شاہ کا خط وصول ہونے کے بعد مجتہد العصر نے ۶؍ربیع الاوّل ۱۲۷۰ء کو وہ علم شاہی انتظام اور شاہانہ جلوس کے ساتھ حضرت عباسؑ کی درگاہ میں چڑھا دیا۔ یہ خبر کچھ جھوٹے سچّے حاشیوں کے ساتھ دہلی پہونچی اور وہاں کے علماء و مشائخ نے بہادر شاہ

[1] وہی (حوالہ سابق)

کو دھمکی دی کہ اگر یہ خبر صحیح ہے تو جمعہ اور عیدین کے نماز کے خطبے سے ان کا نام نکال دیا جائے گا۔ اس خوف سے بہادر شاہ مکُر گئے اور یہ ظاہر کیا کہ مرزا حیدر شکوہ اور مرزا نورالدین نے ان کی بیماری کے زمانے میں ان کی صحت کے لئے اپنے مذہب کے موافق علم چڑھانے کی نذر مانی تھی جس کو انھوں نے اپنے طور پر پورا کیا۔

علم کے قضیئے نے بہت طول کھینچا اور اس کے بارے میں بہت خط و کتابت ہوئی اس سلسلے کی تمام اہم تحریریں مرزا حیدر شکوہ نے ایک رسالے میں جمع کر دی ہیں۔ اسی رسالے میں انھوں نے یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ امیر تیمور سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک کل مغل بادشاہ مذہباً شیعہ تھے اور اس دعویٰ کے کچھ ثبوت بھی پیش کئے ہیں یہ رسالہ ۱۲۷۰ھ میں ''علم حیدری در عقائد سلاطین تیموری'' کے نام سے لکھنؤ میں چھپا تھا۔''[1]

اس شہرت کے تدارک کے لئے وزیر اعظم حکیم احسن اللہ خاں نے ایک مثنوی مرزا غالبؔ سے کہلوائی۔ اس کا جواب مرزا حیدر شکوہ کے علاوہ میر دوست علی خلیلؔ شاگرد خواجہ آتشؔ نے لکھنو سے دیا۔ دہلی میں یہ خیال کیا گیا کہ خلیلؔ کی کوشش میں مفتی علامہ میر عباس شوستری کی مدد شامِل ہے۔ اس لئے مولوی امام بخش صہبائی نے جواب کی فکر کی اور اس میں مفتی علامہ پر علانیہ طعن و تشنیع سے کام لیا۔ اب مفتی صاحب نے بھی قلم سنبھالا اور ۱۲۷۷ھ میں ان کی مثنوی 'خطاب فاصل' پایہ تکمیل کو پہونچی۔ اس طرح مناظرے کے فن کی یکے بعد دیگرے پانچ مثنویاں وجود میں آئیں۔

مرزا غالبؔ کے سلطان العلماء سے بڑے مخلصانہ روابط تھے۔ مرزا اپنے مذہبی تردّدات میں جناب کی ہی طرف رجوع کرتے تھے قبلہ و کعبہ بھی دربار اودھ سے ان کی تواضع میں توجہ فرمایا کرتے تھے۔ اس مثنوی کے بعد بھی، جس میں کافی سخت کلامی سے کام لیا گیا تھا، اگر چہ خواجہ حالیؔ کے بیان کے مطابق قبلہ و کعبہ نے مرزا سے دریافت کیا کہ آپ

---

[1] نگارشات ادیب، ص، ۷۔۱۹۶

نے خود مذہب شیعہ اور مرزا حیدر شکوہ کی نسبت اس مثنوی میں ایسا اور ایسا لکھا ہے۔[۱] لیکن تعلقات پر کوئی اثر نہیں پڑا اور مرزا کی جناب سے عقیدت اور مرزا پر جناب کی عنایت سابق بدستور رہی۔ غالبؔ ان عنایات کا اعتراض سید یوسف مرزا کے نام کے ایک خط میں یوں کرتے ہیں:

''سنو صاحب، تم جانتے ہو کہ میں ۴ پارچے کا خلعت ایک بار اور ملبوس خاص شالی رومال دوشالہ ایک بار، پیشگاہ حضرت سلطان عالم سے پا چکا ہوں، مگر یہ بھی جانتے ہو کہ وہ خلعت مجھ کو دو بار کس کے ذریعے سے ملا ہے۔ یعنی جناب قبلہ وکعبہ حضرت مجتہد العصر مدظلّہ العالی۔ اب آدمیت اس کی مقتضی نہیں کہ میں بے ان کے توسط کے مدح گستری کا قصد کروں چنانچہ قصیدہ لکھ کر اور جیسا میرا دستور ہے، کاغذ کو بنوا کر حضرت پیر ومرشد کی خدمت میں بھیج دیا ہے۔ یقین ہے کہ حضرت نے وہاں بھیج دیا ہوگا اور میں تم کو بھی لکھ چکا ہوں کہ میں نے قصیدہ لکھنؤ بھیج دیا ہے۔ اسی خط میں یہ بھی تم کو لکھا ہے کہ حضرت زبدۃ العلماء سید نقی صاحب اگر کلکتے پہنچ گئے ہوں تو مجھ کو اطلاع دو۔''[۲]

منشی مہیش پرشاد کی تحقیق کے مطابق یہ خط ۵ر نومبر ۱۸۵۹ء یعنی ربیع الثانی ۱۲۷۶ھ کی کسی ابتدائی تاریخ کا ہے، گویا تصنیف مثنوی کے چھ سال بعد کا اور ابھی مثنوی کا قضیہ ٹھنڈا نہیں ہوا تھا۔ کیونکہ اسی زمانے میں مفتی صاحب جوابی مثنوی کی تصنیف کر رہے تھے اور کلکتہ ہی میں مقیم تھے۔ اس خط سے اس بات کا بھی ثبوت بہم پہنچتا ہے کہ خاندان سلطان العلماء کے سبھی نمودار بزرگ غالبؔ پر مہربان تھے ورنہ وہ جناب کے برادر زادے زبدۃ العلماء معین المومنین سید نقی صاحبؒ کے بارے میں اطلاع کیوں منگواتے۔ مثنوی کی تصنیف کے بعد غالبؔ کے حال پر سلطان العلماء کا یہ التفات جناب کی معاملہ فہمی ہی نہیں کشادہ قلبی کو بخوبی واضح کرتا ہے۔

---

[۱] نگارشات ادیب، ص، ۱۹۷

[۲] خطوط غالب مرتبہ مہیش پرشاد، ص ۳۔ ۱۶۲

ان مسائل میں جو سلطان العلماء کی عام مقبولیت پر اثر انداز ہوئے عزاداری کا مسئلہ بھی تھا۔ حدود شرع میں عزاداری کا فروغ غفرآن مآب وآل غفرآن مآب کا عمومی کارنامہ ہے۔ سلطان العلما کی خصوصیت یہ ہے کہ طبقۂ علماء کی وہ پہلی شخصیت ہیں جنھوں نے خود ذاکری کی۔ اس وقت بھی مسلمانوں کے ایک چھوٹے مگر بااثر حلقے میں تعزیہ داری بدعت اور اس کے بعض مظاہر شرک کی حد تک شمار کئے جاتے تھے۔ یہ صورت حال بھی منافی قربت تھی۔ یہی سب مسائل تھے جن سے سلطان العلماء کو مدۃ العمر سابقہ رہا۔ انگریزی مفاد کے ترجمان تاریخ نگاروں نے انھیں نشانۂ ستم اس لئے بنایا تا کہ انگریزوں کی مداخلت کا جواز ثابت کرسکیں۔ اس کے لئے انھیں نظم ونسق کے ہر شعبے کو ہر پہلو سے بدنام اور رسوا کرنا تھا۔ ان تاریخ نگاروں میں کمال الدین حیدر غالباً ابوطالب اصفہانی کے بعد سب سے اہم شخص ہیں۔ اس لئے ان کی تحریر میں سلطان العلماء کی سیرت پاک کی نسبت سوٗظن کے نہایت ناپاک اشارے پائے جاتے ہیں۔

## سلطان العلما کی خوش طبعی

سلطان العلما کی خوش طبعی کے ذکر کے بغیر اُن کی شخصیت کا خاکہ مکمل نہیں ہوسکتا۔ اس کے بے شمار واقعات ہیں جن میں سے چند یہاں پیش کئے جاتے ہیں تا کہ جناب مفتی صاحب کی اس مدح سرائی کی وضاحت ہوسکے ؎

حسن خلق و خوف محشر ز جناب شان نگر
خنده بر لب داشتند و دیدۂ تر داشتند

(۱) رفیق الدولہ نے کسی تقریب عروسی میں قبلہ وکعبہ کے سامنے طلائی اگالدان بڑھا دیا۔ آپ نے ان کو غور سے دیکھ کر فرمایا ”ہم سونے اور چاندی پر تھوکتے بھی نہیں۔“
صاحب تاریخ سلطان العلماء تبصرہ کرتے ہیں کہ ”امام اہلسنت (علامہ) فخر الدین رازی نے بھی اپنی تفسیر میں سونے چاندی کے برتنوں کے استعمال پر حرمت کی

صراحت کی ہے۔[1]

(۲) پالکی پر تشریف لے جارہے تھے کوئی صاحبزادہ ساتھ تھا۔ کھلونوں کی دوکان دیکھ کر مچل گیا۔ سواری روک کر آپ نے مٹی کے کھلونے خریدے ایک ملّائے مسجد کی نظر پڑ گئی۔ حیرت سے کہا ''آپ اور بت پرستی'' فرمایا کہ ہم چاہتے ہیں کہ بچوں کے ہاتھ سے بت شکنی ہو۔''

(۳) لکھنؤ میں ایک قاری صاحب وارد ہوئے جن کو اپنے فن تجوید وقرأت پر بڑا ناز تھا۔ باربار کہتے تھے کہ ''جس کا نکاح میں نہ پڑھوں گا وہ صحیح نہ ہوگا'' کسی صحبت میں قبلہ و کعبہ سے ملاقات ہوگئی۔ جناب نے پوچھا کہ ''قاری صاحب آپ کی والدہ کا نکاح کس نے پڑھا تھا۔'' اس کے جواب میں قاری صاحب نے مستقل خاموشی اختیار کرلی۔

(۴) نواب فقیر محمد خاں گویاؔ نے ایک معزز عالم کو بھیج کر کہلایا کہ ''آپ شیعوں کے قبلہ وکعبہ کہلاتے ہیں اور لذائذ دنیا میں ایسے منہمک ہیں کہ بغیر متعہ کسی دن چین نہیں آتا؟

چو کفر ز کعبہ بر خیزد کجا ماند مسلمانی

فرمایا کہ کعبے سے کفر کہاں اُٹھا تھا!

(۵) بعد انتزاع اودھ ایک پادری صاحب تشریف لائے اور فرمایا کہ مسلمانوں میں جہاد کا بڑا رواج ہے۔''

جناب نے فرمایا ''غیبت امام میں جہاد کہاں''۔ انہوں نے کہا اچھا بعد ظہور تو آپ ہم پر جہاد کریں گے؟ فرمایا کہ ''ظہور حضرت عیسیٰ بھی ہوگا وہ جو ہمیں فرمائیں گے اس پر عمل کریں گے۔''

(۶) ایک پادری نے کہا جب امام حسینؑ کو شہید کیا جارہا تھا تو محبوب خدا نے اللہ سے نہیں

---

[1] مفاتیح الغیب، ص، ۵۹۱ مکتبہ ممتاز العلماء لکھنؤ، یہ تمام واقعات تاریخ سلطان العلما سے ماخوذ ہیں۔

کہا کہ اے اللہ! حسین کو قاتلوں سے بچالے۔'' آپ نے باوقار تبسم کے بعد فرمایا کہ ''محبوب خدا نے خدا سے کہا تھا۔ مگر بارگاہ الٰہی سے جواب ملا۔'' آپ نہیں جانتے ان بدبختوں نے میرے بیٹے عیسیٰ کو سولی پر لٹکادیا جب اپنے فرزندوں کو میں نہ بچا سکا تو جناب والا کے نواسے کے لئے کیا کرسکتا ہوں۔''

## سانحۂ ارتحال

۱۲۸۴ھ (۱۸۶۷ء) میں لکھنؤ میں زبردست ہیضہ پھیلا۔ نماز اموات میں سلطان العلما کو غیر معمولی تعب کا سامنا ہوا۔ ۲۱ ربیع الاول کو جناب خود مبتلا ہو گئے۔ آخری نماز مغربین جس کا چرچہ نصف صدی تک زبانوں پر رہا اس طرح پڑھی کہ یاد الٰہی سے مرض غافل نہ کرسکا۔ تکبیرۃ الاحرام میں دونوں ہاتھ نرمہ گوش تک، اللہ اکبر صحیح تلفظ، تشنج میں کانپتے ہاتھوں کو وقت تکبیر اٹھاتے رہے۔ مگر افسوس شدت مرض نے علامات حیات کو دیر تک جسم میں قائم رہنے نہیں دیا۔ ۲۲ ربیع الاول ۱۲۸۴ھ مطابق ۲۵ جولائی ۱۸۶۷ء دس بجے رات کو حرارت عزیزی مستقر سے خارج ہوئی اور کلمہ طیبہ پڑھ کر یہ آفتاب اجتہاد افق ہستی سے ہمیشہ کے لئے غروب ہوگیا۔[۱]

نماز میت ممتاز العلماء فخر المدرسین سید محمد تقیؒ نے پڑھائی۔ مجمع اتنا کثیر تھا کہ نماز جماعت کے لئے امام باڑہ آصف الدولہ کا صحن منتخب کیا گیا۔ تاکہ اگر ضرورت ہو تو مشرقی عمارت کی چھت پر صفیں قائم ہوسکیں۔ نماز کے بعد جنازہ امام باڑہ غفرآن مآب لایا گیا۔ شہ نشین میں زیر ضریح سپرد خاک کئے گئے۔ تیسرے دن مجلس سیوم ہوئی جس میں سید الذاکرین میر سید علی صاحب نے ذاکری کی۔

شعراء نے قطعات تاریخ میں بڑی دلچسپی لی ہم یہاں چند منتخب تاریخیں پیش کرتے ہیں:

---

[۱] تاریخ سلطان العلماء، ص، ۱۳۴

(۱)

## مفتی میر عباسؒ

سال تاریخ وفاتش راچہ می پرسی زمن آسمانے بود بالا از زمین برداشتند

۱۲۸۴ھ

(۲)

## منیرؔ شکوہ آبادی

بہر تاریخ وفات آں ملاذ الاصفیا سال ہجری و مسیحی فکر کردم اے منیرؔ
یافتم در مصرع واحد دو تاریخ ایں چنیں وائے حصر عقل کل، ہے ہے امام بے نظیر

۱۸۶۷ء ۱۲۸۴ھ

(۳)

## امیر اللہ تسلیم

چو جناب قبلہ عالم زدار بے مدار شد بجنّت در دلم فکر سنِ تاریخ گشت
شد طریقت لنگ، بے سر شد شریعت زہد نیز سینہ بشگا فید و از آرام و تقویٰ در گذشت

۳۱۹ + ۶۸۰ + ۹ ۱۰۸۰ - ۵۰۶ = ۸۷۸ = ۱۲۸۴

(۴)

گفت تسلیم حزیں سال وفات باز راہ خلد را آباد کرد

۱۲۸۴

(۵)

## لامعلوم

سنیّم من مگر از ان مخدوم     بود چوں جاں یک اعتقاد بدل
زیں سبب در سن وفات دوبار     گفتہ ام بآں، یک اعتقاد بدل(۱)
۶۴۲/ ۱۲۸۴ھ

❑❑

۱ قطعات تاریخ بھی، تاریخ سلطان العلماء سے مستفاد ہیں۔

(۸)

# امجد علی شاہ پر الزامات واتہّامات

# اورتاریخ نگاری پرایک نظر

اب ہمیں ان الزامات، اتہامات، اعتراضات کی پرکھ کرنا ہے جو امجد علی شاہ اوران کے نظم ونسق پر کئے جاتے ہیں اور ضمنی طور سے ہندوستان کی تاریخ نگاری کے عام انداز اور تاریخ اودھ سے متعلق چند کتابوں کی حیثیت کا جائزہ لینا ہے۔ہمیں سب سے پہلے نواب شرف الدّولہ محمد ابراہیم خاں کا معاملہ دیکھنا چاہیئے۔

مرزا رجب علی بیگ سرورؔ شرف الدّولہ بہادر کے بڑے نمک حلال متوسل اور زبردست مدّاح ہیں۔ اتنے زبردست کہ شرف الدّولہ کی برطرفی کی پاداش میں امجد علی شاہ جنت مکان کی تضحیک اوران کے نظم ونسق کی تذلیل میں کوئی دقیقہ اٹھانہیں رکھا۔اس دور کے بارے میں جتنے اعتراض ملتے ہیں ان میں بیشتر کا سراسرورؔ ہی کی گمراہ کن ہوائیوں میں ملتا ہے، وہ ہرمرض کی دوا شرف الدولہ ہی کو سمجھتے ہیں۔ بڑی حسرت کے ساتھ فرماتے ہیں:

> ''خلاصہ یہ کہ چاروں طرف اس گمان پرآگ لگی ہے ایک کو دوسرے سے لاگ لگی ہے، قادرِ مطلق ہم نام خلیل کو جلد برسر حکومت پہونچائے جو یہ لگی بجھ جائے۔''[1]

لیکن سرورؔ شرف الدّولہ کی برطرفی کی کوئی وجہ نہیں بتاتے۔ان کا جو اندازِ محاکات ہے

[1] فسانۂ عبرت،ص۶۱

اسے دیکھتے ہوئے، ان کا بس اتنا کہنے پر اکتفا کرنا کہ:

''نویں رجب پنجشنبہ کا روز تھا کہ نواب شرف الدولہ بہادر خانہ نشین ہوئے اور امداد حسین خاں مسند وزارت پر جلوہ افروز ہو کے امین الدولہ عمدۃ الملک ذوالفقار جنگ ہوئے۔''[۱]

بجائے خود اس بات کا شاہد ہے کہ تعصّب وغیرہ کی کوئی اصلیت نہ تھی ورنہ سرورؔ اتنے پر تھم جائیں! یہ بیان بھی کمال الدین حیدر کے بیان سے مختلف ہے اور دونوں بیک وقت صحیح ہوں یہ بھی ممکن نہیں۔ غالباً یہ شوشہ کمال الدین حیدر کا چھوڑا ہوا ہے۔ فرماتے ہیں:

''اس کے بعد شرف الدولہ محمد ابرہیم خاں کے موقوف کرنے کی فکر ہوئی۔ ایک تو تاسّی مذہب دوسرے بڑے صاحب کا خوف صلاح صواب دید۔''[۲]

اتنا کہنے کے بعد شرف الدولہ کو خراج عقیدت بھی نذر کرتے ہیں:

''اور بہادر موصوف نے بھی بادشاہ سے کسی طرح کی صفائی دنیا داری بھی نہ چاہی تھی۔''[۳]

ہم امین الدولہ کے ذکر میں شرف الدولہ کے مجہول رویے کا حوالہ دے چکے ہیں پھر بھی اس بیان کا جائزہ آگے چل کر بقدر ضرورت لیں گے۔ اس وقت تو محض یہ دیکھنا ہے کہ سیاق و سباق سے الگ کر کے، تاسّی مذہب کے ٹکڑے میں نجم الغنی کیا جوڑ لگاتے ہیں اور ایک چنگاری کو آتش نمرود میں بدل دینے کا کیا کمال دیکھاتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

''نواب شرف الدولہ محمد ابراہیم خاں چونکہ مذہب سنت و جماعت رکھتے تھے بادشاہ کو تشیع میں غلو تھا۔ اس لئے ایام ولی عہدی سے ان کی طرف سے کدورت تھی اور وہ نظروں سے گرے ہوئے تھے ان کو تین ماہ کے بعد عہدۂ وزارت سے ۹؍رجب

---

[۱] وہی، ص ۶۰

[۲] سوانحات جلد ۱، ص ۳۷۲

[۳] وہی

۱۲۵۸ء کو موقوف کر کے نواب امداد حسین خاں کو عہدۂ وزارت عطا کیا۔''[۱]

ظاہر ہے کہ یہ بیان غلط ہے۔ نہ قیاس و عقل کی کسوٹی پر پورا اترتا ہے نہ تاریخیت کی۔ ایک سبب تو وہی ہے جو عرض کیا گیا۔ یعنی ایسا زرّیں موقع ہاتھ لگتا اور سرور نظر انداز کر دیتے جب کہ متوسل ہونے کے باعث سرور کو شرف الدولہ کے حالات کا بہتر علم تھا اور وہ شرف الدولہ کے عروج و زوال سے براہ راست متاثر ہوتے تھے، ان کو کمال الدین یا کسی بھی دوسرے کے مقابلے میں واقفیت کے بہتر مواقع تھے۔ اس لئے یہ بجائے خود ایک اہم ثبوت ہے کہ یہ افترائے محض ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ نجم الغنی نے محض اپنے مطلب کی چیز لی ہے۔ کمال الدین حیدر اگرچہ تاسّی مذہب کو بھی ایک وجہ ظاہر کرتے ہیں لیکن اصل وجہ بھی نہیں چھپاتے کہ بڑے صاحب کا خوف صلاح صواب دید تھا۔ پھر وہ طرفین کے لئے تعصب مذہب کی روایت کرتے ہیں۔ پوری عبارت اس طرح ہے:

''لیکن مرزا ولی عہد بہادر سے بسبب تعصب مذہب کے طرفین سے نہ بنی اور ان سے بھی ان کی اطاعت نہ ہو سکی بلکہ ہر امر میں ان سے خلاف کرتے رہے ان کی فہم و فراست سے اس امر میں سب کو تعجب ہوتا تھا۔ مرزا ولی عہد بہادر باپ کے خوف سے صبر کر کے رہ جاتے تھے۔ موقوف بر وقت جانتے تھے۔ ان کو شاید گمان ہوگا کہ انتقال سلطنت ان پر نہ ہوگا۔''[۲]

یہاں کمال الدین حیدر کی عبارت آرائی قابل داد ہے۔ موقوف بروقت کے معنی بند فقرے میں حالات کے تقاضے کا بھرپور اظہار ہے۔ اس عبارت سے بیّن طور پر یہ نتائج ہاتھ لگتے ہیں:

(۱) اَن بن طرفین کے تعصب مذہبی کی وجہ سے تھی۔

(۲) شرف الدولہ جو عملاً وزیر ہوتے ہوئے بھی ضابطے سے ولی عہد کے ماتحت تھے ان

---

[۱] تاریخ اودھ، ج، ۵، ص، ۲۴

[۲] سوانحات، ج، ۱، ص، ۳۶۶

کی اطاعت نہیں بلکہ ہر امر میں مخالفت کرتے تھے۔

(۳) ولی عہدی میں تو امجد علی شاہ باپ کے خوف سے خاموش تھے۔ مگر ''موقوف بر وقت'' کا تہیہ کئے ہوئے تھے۔

(۴) شرف الدولہ کو یہ گمان تھا کہ انتقال سلطنت امجد علی شاہ کے بجائے اور کسی پر ہوگا۔

مجھے اس بیان کی صحت میں بھی شک ہے لیکن بحث کے لئے اگر صحیح تسلیم کرلیں تو یہ سمجھنا آسان ہو جائے گا کہ شرف الدولہ اپنے گمان کو یقین میں بدلنے کے لئے کچھ نہ کچھ کرتے بھی رہے ہوں گے اور اس صورت میں باہمی اعتماد کی جو کیفیت ہوسکتی ہے وہ بخوبی تصور کی جاسکتی ہے۔ ہم امین الدولہ کے حالات میں کرنل جان لو ریذیڈنٹ کا وہ خط دیکھ چکے ہیں جس میں اس نے یہ اظہار کیا ہے کہ وزیر اعظم اور شرف الدولہ میں ایسی کشاکش تھی، جس کی وجہ سے میں نے دونوں سے مل جل کر کام کرنے کی استدعا کی۔ اس سوال کا جواب صاحبان انصاف و معقولیت کے ذمہ ہے کہ اس طرح کی کشاکش میں اگر دونوں ہم مذہب ہی ہوتے تو کیا یہ تلخی نہ ہوتی۔ طاقت کی سیاست کا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ فرشتہ صفاتی اور ملک خصلتی کے باوجود امجد علی شاہ بادشاہ تھے۔ بادشاہی میں باپ بیٹے کا رشتہ بھی بڑی معنویت نہیں رکھتا وہاں اصل وفاداری بشرط استواری ہوتی ہے۔ اس کی نظیر تاریخ کے کسی دور افتادہ معرکے سے نہیں لانا ہے۔ انھیں کے فرزند اکبر مصطفیٰ علی حیدر کو ہی دیکھ لیجئے۔ دادا کے کچھ زیادہ مقرب ہوگئے تھے، کبھی کبھی باپ کی شکایت کردیا کرتے تھے۔ نتیجہ کیا ہوا سلطنت سے محروم ہوگئے۔ دوسری طرف واجد علی دادا کے مقابلے میں باپ کی خوشنودی کے زیادہ جویا رہے تھے۔ دادا بادشاہ ہوئے تو سب کا وظیفہ ہوا مگر یہ میاں بیوی محروم رہ گئے۔ [1]

---

[1] محل خانہ شاہی، ص، ۱۳۰

کیا یہاں بھی طرفین میں تعصب مذہبی درمیان تھا۔کمال الدین حیدر نے عظیم اللہ اعظم الدولہ کی برطرفی کا ذکر بھی کیا ہے،کیا وہ سنّی تھے؟ ایسا تو نہیں پھر وہ کیوں برطرف ہوئے۔کمال الدّین حیدر خود ہی سبب بتاتے ہیں کدورت عناد ہائے زمان ماضیہ اور شکوہ ہائے درونی جو موقوف بروقت خاص رکھے تھے۔''[1] یہاں بھی وہی موقوف بروقت خاص کا معنی بند فقرہ۔

سیدھی سادھی بات یہ ہے کہ دربار میں دو پارٹیاں تھیں۔ایک شرف الدّولہ بہادر کی دوسری خود مرزا ولی عہد بہادر وزیر اعظم کی۔اس پارٹی میں مہاراجہ بال کرشن نمایاں تھے۔ انھیں شرف الدّولہ نے چلتا کر دیا تھا۔خیر مہاراج کو چھوڑیئے اور کمال الدّین حیدر کو بہت مستند جاننے والوں سے پوچھئے کہ جب محمد خلیل الدّین خاں کاکوروی کو شرف الدولہ نے سو روپئے ماہوار کی معمولی پنشن پر بھیج دیا تھا تو اس میں بھی تعصب مذہبی کا قدم درمیان تھا؟ اور ان سب کے علاوہ ایک بات جو خاص طور سے غور کرنے کی ہے کہ ''موقوف بروقت'' خاص کی حقیقت کیا ہے؟ کیا بادشاہ کو اس کی واقعیٔ فکر تھی! واقعات کا تجزیہ کمال الدین حیدر کی تصدیق نہیں کرتا جیسا کہ ہم دیکھ رہے ہیں۔وزارت پر منصوبی و معزولی کا مسئلہ ایسا تھا کہ جس کے بارے میں کمپنی سرکار کو اصرار تھا کہ ازروئے معاہدہ ریذیڈنٹ کو محض مشورہ دینے کا حق نہیں بلکہ اس پر عمل کے لئے بادشاہ کو مجبور کرنے کا بھی حق ہے۔یہ امین الدولہ بہادر کے معاملے میں دوبار مشاہدے میں آیا۔پھر کیا بات تھی کہ شرف الدولہ بہادر کے لئے امر خانگی بن گیا۔کمال الدین حیدر اپنی بات کہنے میں خود مختار نہ تھے یہ ہم ابھی تفصیل سے دیکھیں گے۔پھر بھی ایسے اشارے موجود ہیں جن سے عقل مند حالات کو سمجھ سکتے ہیں۔کمال الدین حیدری یہ بھی بتاتے ہیں:

''ایک مرتبہ گیند خانہ حسین آباد میں دوسرے دلکشا میں ریذیڈنٹ نے کسی حیلۂ ظاہری

---

[1] مضمون شیخ تصدق حسین الواعظ لکھنؤ اگست، ۱۹۴۶، ص ۱۹

سے عمداً ملاقات کی اور بالمشافہ فرمایا کہ ''یہ امر خاص محول بخوشی بادشاہ ہے۔ ہم اس میں کبھی مداخلت نہ کریں گے۔''[۱]

سامنے کی بات ہے کہ امجد علی شاہ شرف الدولہ کی برطرفی کے لئے ویسے ہی بے چین ہوتے جیسا کہ کہا جاتا ہے تو ریذیڈنٹ کا ایک اشارہ کافی ہوتا اور امجد علی شاہ اسے نعمت غیر مترقبہ کی طرح فوراً بصد شکریہ قبول کرتے صاحب کو دوبارہ تاکیدی اشارے کی ضرورت نہ پڑتی۔ صاحب کا اصرار خود بتاتا ہے کہ بادشاہ اس کے مشتاق نہ تھے اور جو کچھ ہوا ''خوف صلاح صواب دید'' سے اور شاید خوف و صلاح صواب دید سے بھی نہ ہوتا۔ اگر شرف الدولہ مثبت رویہ اختیار کرتے مگر وہ ایسا نہ کر سکے، پھر یہ کیسا تعصب مذہبی کہ اس کا نزلہ گنے چنے افراد پر گرے، اسے اپنے مقام پر تفصیل سے دیکھیں گے۔

انصاف کا تقاضہ ہے کہ ''طرفین کے پردے میں شرف الدولہ بہادر پر جو تعصب کی تہمت جڑی گئی ہے اس کا بھی جائزہ لیا جائے۔ تاریخ اودھ کے طلاب اور دلچسپی لینے والے بخوبی جانتے ہیں کہ پہلی جنگ آزادی میں لکھنؤ میں شیعہ سنّی قضیہ بھی کھڑا ہو گیا تھا اور انقلابی قوتوں کے اضمحلال کا وہ بھی ایک سبب تھا۔ ایک طرف ایک کثیر جماعت جس کی سربراہی امراء و حکّام کر رہے تھے شہزادہ برجیس قدر کو والئ اودھ تسلیم کر چکی تھی ان کو شہنشاہ ہند حضرت بہادر شاہ کی توثیق بھی حاصل تھی۔[۲]

دوسری طرف حامئ دین محمدؐ، خادم محراب شاہ، مولوی احمد اللہ شاہ اپنی بادشاہت کا اعلان کر چکے تھے۔ شررؔ کہتے ہیں:

''دونوں درباروں میں پولیٹکل اختلاف کے ساتھ شیعہ سنّی کا جھگڑا اور تعصب بھی نمایاں ہونے لگا۔''[۳]

---

[۱] سوانحات، ج ۱، ص ۳-۲۷۲

[۲] خدنگ غدر میں ہے کہ برجیس قدر کا سکّہ تھا۔ بزرزد سکہ نصرت طرازی۔ سراج الدین بہادر شاہ غازی، ص ۱۱۸

[۳] گذشتہ لکھنؤ، ص ۱۰۷

یہی وہ محل تھا جہاں شرف الدّولہ کے تعصب کو نمایاں ہو جانا چاہیئے تھا اور انہیں شاہ صاحب کا ڈنکا پیٹنا شروع کر دینا چاہیے تھا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ وہ شاہ صاحب کی سپاہ کے ہاتھوں گرفتار اور پھر اسی کے ہاتھوں قید علایق سے آزاد ہوئے۔[۱]

مرآۃ احمدی شرح مثنوی تواریخ احمدی ( تائب لکھنوی ) میں مولانا الحاج ابرار حسین فاروقی گوپامئو نے اس شعر کے حاشیئے میں ۔

جو تھا حاکم لکھنؤ کا وزیر
تلنگے اُسے کر کے لائے اسیر[۲]

اس گرفتار وزیر کو شرف الدّولہ محمد ابراہیم ہی سمجھا ہے مگر مثنوی کے اس ایڈیشن میں جو ابیات ہیں ان سے وزیر کی محض گرفتاری اور نظر بندی دریافت ہوتی ہے لیکن ماثر دلاوری تذکرۂ احمد اللہ شاہ میں جو افادہ مولانا فرماتے ہیں وہ یہ ہے:

''گویا اس طرح سے اس وزیر کی جان کو محفوظ کر کے بقول مولانا تائب نظر بند کر دیا۔ بلکہ باوجود وعدۂ حفاظت کے اسی افراتفری میں ۔

کسی نے پس خسرو نیک نام
کیا کار نواب والا تمام[۳]

خدنگ غدر میں شرف الدولہ بہادر کا ذکر کسی قدر بسط کے ساتھ ہے ان کے قتل سے متعلق بیان اس طرح ہے:

''شرف الدولہ بہ ہمراہی اسی خدمت گار کے پا پیادہ مکان عاشق علی سے نکل کے چلے، راستہ میں تلنگے باغیوں نے شناخت کر کے پیٹی توپ پر بٹھا لیا۔ احمد اللہ شاہ کے روبرو لے جا کے حاضر کر دیا۔ احمد اللہ شاہ نے بلا استفسار حال و گفتگو اس جرم پر کہ وزیر

---

[۱] محمد رضا ظہیر تنقید آب حیات قلمی
[۲] ۲۶۹
[۳] ماثر دلاوری، ص ۱۲۰

ہو کے ہمراہ بیگم صاحبہ کیوں نہ گئے حکم قتل شرف الدولہ کا دیا۔"[۱]

بہت صاف بات ہے کہ تعصب و تنگ نظری کے مریض ہوتے تو اپنے فرقے یا مذہب کی برتری و بالا دستی کے لئے کوشاں نظر آتے لیکن ہم ان کا طرز عمل دوسرا ہی پاتے ہیں۔ ایک واقعہ ملاحظہ فرمائیے:

"لکھنؤ میں پھر برجیس شاہی ہوئی۔ مرافعہ اور کچہری مثل عہد سلطانی ہوئی۔ مفتی صاحب (میر عباسؒ) کا جبر وصبر قابل قدر ہے کہ آپ نے پھر توجہ نہ کی متفرق مقامات پر بسر کرتے رہے اور عسرت و سختی برداشت کرتے رہے۔ اس دور کے وزیر شرف الدّولہ ابراہیم اور مموخاں سپہ سالار فوج غدر باغی وغیرہ نے بلایا کہ کوئی عہدہ مثل سابق قبول کریں۔ آپ نے ضعف و بیماری کا عذر کر دیا اور زید پور تشریف لے گئے۔ حضرت پورو کنتو رو غیرہ میں رہے جب حکومت کی جستجو کم ہوگئی پھر لکھنؤ چلے آئے۔"[۲]

ان حقائق کی موجودگی میں کیسے باور کیا جائے کہ شرف الدولہ تعصب کا شکار تھے۔ بادشاہ وزیر میں سبب اختلاف تعصب طرفین تھا، اصل وجہ جسے انگریزوں اور ان کے نقیب طرح طرح کے پردوں میں چھپانے کی کوشش کرتے ہیں یہ ہے کہ انگریز اودھ کے نظم و نسق کو سیدھے چلنے ہی نہیں دینا چاہتے تھے اس خبیثانہ سازش کا شکار شرف الدولہ بھی ہوئے۔ اس راز سے بابو پری پورنا نندورما نے پردہ اٹھایا ہے:

"وزیر شرف الدولہ نے بڑی محنت سے اس کا (مال گذاری کی تحصیل) انتظام کیا۔ جب وہ کامیاب ہونے لگے تو ریذیڈنٹ نے ہی بادشاہ سے کہہ کے انھیں کام سے ہٹوا دیا۔"[۳]

سرکاری کاغذات میں سنّی و ہندو اہلکاروں کو "اسمائے مبارک خالق کائنات و پنجتن

---

[۱] خدنگ غدر معین الدین حسن مرتبہ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، ص ۱۳۲

[۲] تجلیات، ج ۲، ص ۳۹

[۳] واجد علی شاہ اور اودھ، ص ۲۰۰

پاک وآئمہ اطہار'' لکھنے کی ممانعت تھی اور بس اتنا ہی لکھنے کے لئے نظم ونسق کے ہر شعبے میں شیعہ منشیوں کی ایک بڑی تعداد ملازم رکھی گئی تھی۔'' اس الزام کی تشہیر، رام سہائے تمنّا، نجم الغنی خاں، ڈاکٹر صفی احمد، ڈاکٹر جی ڈی بھٹنا گر سب نے کی ہے۔ اس حکم کے اجراء اور منسوخی کا بیان آپ نجم الغنی خاں کے الفاظ میں ملاحظہ کریں:

''افضل التاریخ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے اس میں لکھا ہے ایک حکم عام یہ جاری ہوا کہ کسی دفتر سرکاری میں کوئی ہندو، یا اہل سنّت اسمائے مبارک خالق کائنات و پنجتن پاک وائمہ اطہار اپنے ہاتھ سے نہ لکھے۔ اس کام کے انصرام کے لئے ہر دفتر میں ہر سرشتے پر مومنین اثنائے عشریہ مقرر ہوئے تا ایام معدود یہ سلسلہ جاری رہا۔ اتفاق سے ایک دن آدھی رات کے وقت پرچہ اخبار سے یہ خبر آئی کہ راجہ ہردت سنگھ تعلقدار بونڈی مقید نظامت بہرائچ فرار ہوگیا۔ امجد علی شاہ نے بلحاظ قرب بود وباش راجہ بالکرشن بہادر کو طلب کر کے شقے لکھنے کو حکم فرمایا۔ مہاراجہ مذکور ارشاد میں مصروف ہوئے اور کئی بار اسمائے خدا ورسول حسب عرض مہاراجہ بہادر بادشاہ نے اپنے ہاتھ سے تحریر کئے جب ہر شقے میں یہی نوبت پہونچی تو اسی وقت حکم سابقہ منسوخ فرمایا اور ہر کچہری و دفتر میں علی الصباح احکام روانہ ہوئے۔ مومنین نو بھرتی کا سلسلۂ رزق جاتا رہا۔''[1]

ڈاکٹر صفی احمد طوطا رام شایاںؔ اور محمد عظمت علی کے حوالے سے[2] یہ بھی اضافہ کرتے ہیں کہ ان مومنین نو بھرتی کو کھپانے کے لئے کچھ غیر شیعہ اہلکار ملازمت سے برطرف بھی کئے گئے تھے۔ برطرفی کا واقعہ غالباً نجم الغنی خاں وغیرہ نے بھی قابل قیاس نہیں پایا اس لئے اُسے نقل نہیں کیا۔ ڈاکٹر صفی احمد کے رجحان طبیعت کے مطابق ہونے سے یہ حصّہ بھی انہوں نے قبول کرلیا۔

آیئے! اب الزام کا تجزیہ کیا جائے۔ اول تو یہ روایت بالکل خلاف قیاس ہے کیونکہ

---

[1] تاریخ اودھ، ج، ۵، ص، ۲۳

[2] ٹوکنگس آف اودھ ص ۵۲/حاشیہ ۱۱۸

اہل تسنن کے لئے اس طرح کی پابندی کی کوئی وجہ نہیں ہوسکتی۔ کسی قرن وعصر میں اس طرح کے فتوے کا سراغ نہیں ملتا۔ اور یہ ممکن نہیں کہ اس طرح کا حکم امجد علی شاہ مجتہد العصر کے فتوے کے بغیر جاری کریں اس لئے راوی نے سنّیوں کو شامل کر کے الزام کی مہملیت کو اپنے ہاتھوں عریاں کر دیا ہے۔ پھر یہ روایت اس لئے بھی وضعی اور جعلی ہے کہ ایسا حکم اگر مجتہدین کی ایما سے جاری ہوتا تو یہ ناممکن تھا کہ ان کے سیرت نگار اس کے ذکر سے باز رہتے۔ شرعی حکم ہونے کی صورت میں معاملہ محض دیوان و دربار سلطانی تک کیوں محدود رہتا؟ وہ سبھی دربار جہاں مجتہد العصر کی تقلید اور بادشاہ کا اتباع ہوتا تھا اس پر عمل پیرا ہوتے اور یہ دربار بہت سے تھے مگر اس قسم کا کہیں کوئی نشان نہیں ملتا۔ بلکہ حضرات علماء کے کاروبار تک میں کایستھ منشیوں کی موجودگی ملتی ہے۔ پھر یہ کہ یہ حکم محض ایک اتفاقی واقعے سے ناقابل عمل سمجھ لیا گیا اور پھر واپس لے لیا گیا، اس سے فتویٰ تو بدل نہیں جاتا۔ کاروبار سلطنت کے علاوہ اور جگہوں پر تو برسرِ عمل رہتا اور اس کے آثار قابل اعتبار وسیلے سے ہم تک پہونچتے۔ رہ گئی منشی تمنّا وغیرہ کے یہاں مذکور ہونے کی بات تو اس پر روشنی ڈالنے کا یہ محل نہیں۔ تاریخ نویسی کے ساتھ انگریزوں کی دھاندلی سے بحث آگے آرہی ہے۔

اس الزام پر ایک اور زاویئے سے غور کرنا ضروری ہے۔ ڈاکٹر صفی احمد کا کہنا ہے کہ امجد علی شاہ اپنے اب وجد کے مانند کٹّر شیعہ تھے۔ مگر ان لوگوں سے زیادہ تنگ نظر تھے ان کے والد تو اس وقت جب ان کے مذہبی معتقدات کا ٹکراؤ مفاد ملکی سے ہوتا تھا تو سمجھوتہ کر لیا کرتے تھے لیکن اس کے برعکس امجد علی اتنے کٹّر متعصب تھے کہ مفاد ملکی کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔[1] مثال میں شرف الدولہ اور اسمائے طیبہ والے معاملے کو پیش کرتے ہیں۔ لیکن اگر ڈاکٹر صفی احمد اس فقرہ پر توجہ کرتے کہ تا ایام معدود یہ سلسلہ جاری رہا، تو ان کو کٹر پن کا یہ الزام لگانے کی گنجائش نہ ملتی۔ اسی لئے انھوں نے مہاراجہ بالکرشن والا قصہ اور حکم کی منسوخی کا ٹکڑا اور

[1] ٹوکنگس آف اودھ ص ۵۲/حاشیہ، ص، ۱۱۸

مومنین نو بھرتی کا سلسلہ رزق جاتے رہنے والا حصّہ نقل ہی نہیں کیا۔ ڈاکٹر بھٹنا گر نے بار بار اپنی اس طرح کی رائے ظاہر کی ہے:

''واجد علی شاہ کو ورثے میں ایک ایسا نظم و نسق ملا جو بے دست و پا، غیر منظم اور بدانتظامی کا شکار تھا۔''[1]

میں یہ کیسے عرض کروں کہ ڈاکٹر صاحب کے سامنے اس طرح کی رائے قائم کرنے کے اسباب نہ رہے ہوں گے۔ لیکن یہ عرض کرنے کی اجازت ہو کہ اگر وہ اسباب کا ذکر کرتے تو ان کا جائزہ لینا ممکن ہوتا اور دعویٰ مع دلیل سمجھا جاتا۔ راقم کے پیش نظر جو کچھ ہے اس کی بناء پر اس رائے سے اتفاق ممکن نہیں۔ بطور مثال اسی راجہ بونڈی کے فرار کے واقعے کو لے لیں تو بھی سمجھ میں آجاتا ہے کہ نظم و نسق اتنا چست تھا کہ ایک قیدی کے فرار کے واقعے کی اطلاع آدھی رات کو خود بادشاہ سلامت تک پہنچ گئی اور وہ بنفس نفیس کارروائی میں مصروف ہو گئے اور معمولی افسر نہیں خود وزیر مال طلب کر لئے گئے۔ مہاراجہ کی طلبی کی وجہ قرب بود و باش نہ رہی ہوگی بلکہ یہ رہی ہوگی کہ معاملہ براہ راست ان کے شعبہ سے متعلق تھا اور آگے کی کارروائی میں بادشاہ کو ان کے مشورے کی ضرورت تھی۔

بات یہ ہے کہ ڈاکٹر بھٹنا گر نے بڑی حد تک اور بابو پری پورنانند ورمانے کسی حد تک جو اعتماد بعض ماخذوں پر کیا ہے وہ ماخذ ہرگز اس کے مستحق نہیں ہیں۔ کمال الدین حیدر اور رام سہائے تمنّا تو غصب اودھ کے وقت یا قریب تر ماضی کے مصنف ہیں۔ تاریخ 'تفضیح الغافلین' ایسے قدیم ماخذوں کی نسبت فلسفۂ تاریخ کے مایۂ ناز عالم اور اُستاد پروفیسر حبیب مرحوم نے جو احتیاط برتی ہے، آپ اُسے ملاحظہ فرمائیں:

''ابوطالب کی اصل کتاب کی حقیقت کے بارے میں ہمیں یہ یاد رکھنا ہوگا کہ حکومت برطانیہ نے اپنے اثر و رسوخ کا سایہ ڈالنا شروع کر دیا تھا اور ابوطالب نے ایک

---

[1] اودھ انڈر واجد علی شاہ، ص، ۱۴

برطانوی افسر کرنل رچرڈسن کی تجویز سے یہ کتاب لکھنی شروع کی تھی چنانچہ اکثر و بیشتر انھوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایجنٹ کی طرح لکھا، سوچا اور برتاؤ کیا ہے۔ تفضیح الغافلین (جس کا انگریزی ترجمہ ۱۸۵۵ء میں' ہوئے' نے کیا) اس مقدمے کا ایک جزو معلوم ہوتی ہے جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے افسران نے اودھ کے الحاق کے جواز کے لئے بنانا شروع کیا تھا۔''[۱]

اسی تفضیح الغافلین کا اردو ترجمہ تاریخ آصفی کے نام سے اب ڈاکٹر ثروت علی نے شائع کیا ہے اصل کتاب کو بھی ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے مرتب کر کے شائع کر دیا ہے یہاں ہمیں اس مبحث پر تفصیلی گفتگو کر لینی چاہیئے۔

## تاریخ نویسی اور انگریزوں کی دھاندلی

آپ سب سے پہلے مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کا ایک اقتباس ملاحظہ کریں:

''ہر حکومت کی تاریخ میں اچھے اور بُرے، منصفانہ اور ظالمانہ دونوں قسم کے واقعات ملتے ہیں اس کلیئے سے ہندوستان میں مسلمانوں کی تاریخ بھی خالی نہیں، مگر ملک کی بھلائی اس میں نہیں ہے کہ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر مسلمانوں کی حکومتوں کی کچھ واقعیٔ برائیاں اور کچھ گڑھ (کذا) کر مفروضہ افسانے یکجا کئے جائیں اور وہ انجمنوں کے جلسوں میں، لڑکوں کے مدرسوں میں، مطالعہ کی کتابوں میں، اخبارات کے کالموں میں، روز بروز کی گفتگوؤں میں کھیل اور تماشے کے ناٹکوں میں اس طرح بار بار دہرائے جائیں کہ وہ بچّے بچّے کی زبان پر چڑھ جائیں اور دونوں قوموں کے درمیان تلخی اور ناگواری اور بدگمانی اور عداوت راسخ ہو جائے۔''[۲]

پنڈت سندر لال کا کہنا ہے:

---

[۱] تاریخ آصفی، پیش لفظ از محمد حبیب، ص د

[۲] حیات سلیمان، ص، ۲۲۵

''سچ یہ ہے کہ جو کتابیں ابھی تک (یعنی رواں صدی کا نصف اول) ہندوستان کی تاریخ پر اسکولوں اور کالجوں میں پڑھائی جاتی ہیں ان میں، تاریخوں، راجاؤں کے ناموں یا حددرجہ موٹے موٹے واقعات کو چھوڑ کر باقی باتوں میں کم سے کم ۹۰ ر فیصدی کی قیمت ایک معمولی ناول سے زائد نہیں ہے اور وہ بھی نہایت خطرناک ناول، جس کا اثر قوم کے بڑھتے ہوئے دماغوں پر حددرجہ زہریلا پڑتا ہے۔''[۱]

اس کے بعد پنڈت سندرلال نے کرائے کے مصنف کے عنوان سے ایک فصل لکھی ہے جس میں سید غلام حسین کی سیر المتاخرین، فرانسیسی مصنف 'اپے دوبائے' کی کتاب اور مرزا اقبال وغیرہ کی مثالیں پیش کرنے کے بعد پنڈت سندرلال جی رقم طراز ہیں:

''اس طرح کی اور بھی متعدد مثالیں انگریزوں کے زمانے کی ہندوستان کی لکھی ہوئی تاریخ سے دی جاسکتی ہیں۔ سچ یہ ہے کہ اس وقت کی مغربی تہذیب میں اور خاص کر مغربی سیاست میں ایمانداری یا سچ کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی اور مغربی فن تاریخ نویسی بہت درجے تک مغربی سیاست کا محض ایک حصّہ ہے۔ پروفیسر سیلی، پروفیسر گولڈن اسمتھ جیسے یورپین فاضلوں نے تاریخ کو سیاست کا محض ایک حصّہ تسلیم کیا ہے اور سیاست میں خیر وشر کی تمیز کا کوئی مقام نہیں، انگریزی کی ایک مشہور کہاوت ہے۔''[۲]

افسوس ہے کہ اس طرح کی واضح نشان دہی کے باوصف ابھی ہم انگریزوں کے جال سے نکل نہیں پائے ہیں۔ بڑی حیرت تب ہوتی ہے جب ہندوستان کی تاریخ کے بارے میں ہم تھوڑی بہت احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ لیکن جب بات مختصر ہو کے صرف اودھ تک رہ جاتی ہے تو رہی سہی احتیاط بھی پامال کر دی جاتی ہے۔ ڈاکٹر بھٹناگر خود معترف ہیں کہ کمال الدین حیدر میرزا زائر کی کتاب پر انگریزوں کی ایک تثلیث نے نظر کر کے اُسے سہ آتشہ بنایا۔ اس تثلیث کے ارکان میں کلائنٹ اور ڈاکٹر اسپرنگر کے علاوہ سلیمن بھی ہیں۔ انتزاع

---

[۱] بھارت میں انگریزی راج (۱)، ص، ۱۰

[۲] بھارت میں انگریزی راج، ص، ۱۱

اودھ کے سلسلے کی سرنام شخصیت، اس کے باوجود ڈاکٹر صاحب کی رائے میں ''کمال الدین حیدر نے بیان واقعات میں ناجانب داررہنے کی کوشش کی ہے۔''[۱]

وہ سلیمن کے بارے میں بھی خوش فہمی رکھتے ہیں۔ یہاں کمال الدین حیدر کی کتاب کا تعارف یوں کراتے ہیں:

''غدر کے سلسلے میں اودھ کی بہت سی تاریخیں انگریزوں ہندوؤں اور مسلمانوں نے لکھی ہیں۔ان میں قیصر التواریخ خاص طور پر اہم ہے۔ یہ تاریخ سید کمال الدین حیدر حسنی الحسینی المشہدی عرف میرزا آئر نے لکھی ہے۔ لکھنے والے میرزا آئر صاحب ہیں اور لکھوانے والے مشہور مورخ سر ہنری ایلیٹ ہیں جو گورنر جزل ہند کے سکریٹری تھے۔طبع اوراشاعت کا انتظام سرڈگ بجے سنگھ راجہ بلرام پور نے کیا تھا جو سرکار کمپنی بہادراور سرکار انگریزی بہادر کی وفاداری اور اپنے ملک کی غداری میں مشہور ہیں، چھاپنے والا نول کشور پریس ہے۔''[۲]

آیئے! اب وہ خراج عقیدت کا انبار دیکھیں، جو ہمارے دانش وروں نے میرزا آئر کے استاد معنوی ایلیٹ صاحب کو پیش کیا ہے۔سب سے پہلے علامہ سیّد سلیمان ندوی مرحوم کے افکار ملاحظہ فرمایئے:

''ایلیٹ کی کتاب کو اپنا گائڈ بنانے والا محقق، مسلمان سلاطین کے عہد کو صرف خون آلود اور خون آشام پاتا ہے جس کے ذہنی اثرات مدتوں کی تحقیق و کوشش کے بعد بھی مشکل سے مٹ سکیں گے، ایلیٹ شروع انگریزی عہد کا آدمی ہے اور یہ ایک گونہ سرکاری حیثیت بھی رکھتا ہے اور اس نے اپنے کام کے مقصد کو چھپا کر نہیں رکھا ہے۔ اس نے صاف طور سے یہ ظاہر کر دیا ہے کہ اس کے پیش نظر تمام تر یہ ہے کہ اپنے اگلے پیشرو حاکموں کے غیر منصفانہ عہد کی تاریکی کو دکھا کر اپنی قوم کے عہد حکومت کی روشنی دکھائے

---

[۱] اودھ انڈر واجد علی شاہ، ص، ۳۷، حاشیہ ۲۱

[۲] واجد علی شاہ اور اُن کا عہد، ص، ۵۶۵

تا کہ ہندوستان کے رہنے والے اس کو سایۂ رحمت سمجھ کر اطاعت مندانہ اخلاق کا خراج ہمیشہ پیش کیا کریں۔''[۱]

الیٹ صاحب کے نخل تمنّا کا سب سے اچھا ثمر مراد سید مرحوم کی 'تاریخ سرکشی ضلع بجنور' ہے۔ سید سلیمان صاحب کے نامور شاگرد اور ہندوستان کی تاریخ کے اچھے مبصر مولوی سید صباح الدین عبدالرحمٰن کے یہاں سے دو ایک اقتباس ملاحظہ ہوں تا کہ الیٹ صاحب کی ذہنیت اور ان کے نصب العین یا مشن کا اندازہ اور وضاحت کے ساتھ ہو جائے۔

''سر ہنری الیٹ نے اپنی ضخیم تاریخ کی مختلف جلدوں میں زیادہ تر ایسے ہی اقتباسات جمع کئے ہیں جو مسلمان فرماں رواؤں کی تاریخ کے تاریک پہلو تھے۔ الیٹ اور اس کے مکتبہ خیال کے اور مورخوں کی تاریخی تحقیقات کا مقصد یہ تھا کہ وہ مسلمانوں کے عہد کی ایسی ہولناک اور خوں ریز تاریخ پیش کریں کہ ہندوستان کے باشندوں کو برطانوی حکومت ایک نعمت اور رحمت معلوم ہو۔''[۲]

صباح الدین عبدالرحمن صاحب کے حوالے سے مولانا ابوالکلام آزاد کا ارشاد دیکھئے:

''ٹاڈ کی تاریخ راجستھان اور الیٹ کی تاریخ ہندوستان کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا مقصد ہندو مسلمانوں کے اختلاف کو بڑھانا تھا یہ دونوں ایسٹ انڈیا کمپنی کے اعلیٰ عہدہ دار تھے اور وہ ایسے تمام ہندو مورخوں کا ذکر حقارت سے کرتے ہیں جو مسلمان بادشاہوں کی تعریف کرتے ہیں۔ ان کو تعجب ہوتا ہے کہ ہندو مورخین مسلمانوں کی عدل پروری اور انصاف پسندی کے مداح ہیں۔''[۳]

ایک دوسرے عالم دین کی رائے ملاحظہ فرمایئے:

''سر ہنری الیٹ جنھوں نے سب سے پہلے ہندوستان کی تاریخ کو مسخ کر کے اس

---

[۱] مقالات سلیمان، ص، ۳۹۰

[۲] ہندوستان کے عہد وسطی کی ایک جھلک ص ۲

[۳] ہندوستان کے عہد، ص ۷

کو تفرقہ انگیز مذہبی افسانوں کا گندہ ٹوکرہ بنا کر ہندوستان کے سامنے پیش کیا اور جس کے تراجم اور اقتباسات اسکولوں میں داخل کرا کر ہندوستانیوں کی ذہنیت کو برباد کیا گیا۔''[۱]

اس لئے یہ سوچنا کہ جو کتاب الیٹ صاحب کے اہتمام میں لکھی جائے گی وہ ناجانبدارانہ ہوگی حقائق ثابتہ سے انکار کے مرادف ہے۔

نجم الغنی خاں، منشی رام سہائے تمنا سے امجد علی شاہ کے تعصب کے واقعات لینے میں بہت فراخ دل ہیں لیکن جب اجودھیا اور مولوی امیر الدین علی کا قضیہ آتا ہے تو بڑی سادہ دلی سے فرمانے لگتے ہیں:

''حدیقۃ الشہدا اور افضل التواریخ میں تھوڑا فرق پایا جاتا ہے کیوں کہ دونوں نے جوش مذہبی کے تعصب سے لکھا ہے۔''[۲]

یعنی جو ہم کو اچھا لگے یا ہماری پسند کے مطابق ہو وہ تاریخ اور جو ناپسند ہو اور اچھا نہ لگے وہ جوش مذہبی کا تعصب یا یہ نقطہ نظر بھی کتنا لوچ دار ہے اور خاں صاحب کا اعتراف ہے کہ جوش مذہبی کا تعصب آزادانہ فکر پر تاریخ نویسی میں غالب آیا ہے۔

بابو پری پورنا نندورما کی بھی کسی قدر یہی مجبوری ہے۔ وہ اپنے بالغ شعور پختہ فکر اور قوم پرستانہ نقطۂ نظر کے باوصف رجب علی بیگ سرورؔ کے چکر میں ایسا آئے کہ تذبذب کے باوجود رجحان سرورؔ کی صحت وصداقت کی طرف ہی رہا۔ اس میں کسی قدر واجد علی شاہ کے ساتھ ہمدردی کا بھی دخل ہے، فرماتے ہیں:

''اگرچہ زائر صاحب حضرت امجد علی شاہ کی تعریف نہیں کرتے پر برائی بھی نہیں کرتے ہیں۔ کرنل سلیمن نے بھی اپنی ڈائری میں ان کی اتنی برائی نہیں کی جتنی مرزا رجب علی سرورؔ نے۔ ہوسکتا ہے کہ امجد علی شاہ کے معائب کو سلیمن نے اور زائر نے بھی اس لئے چھپایا ہو کہ سب گناہ واجد علی شاہ کے سرآجائیں کہ انھوں نے راج کاج چوپٹ

---

[۱] روح روشن مستقبل ص ۲۵۵ بحوالہ علماء حق جلد ۱، ص ۱۱

[۲] تاریخ اودھ، ج ۵، ص ۲۳۰

کیا۔''[۱] ترجمہ

اب آیئے دیکھیں کہ ''فسانۂ عبرت'' کی حقیقت کیا ہے۔ سب سے پہلے خود مرحوم مسعود صاحب کے قلم حقیقت رقم سے اسے ملاحظہ فرمایئے جن کی مسیحانفسی اس قصۂ پارینہ کی حیات تازہ کا باعث بنی، فرماتے ہیں:

''مبالغہ بھی اس زمانے میں بہت مقبول تھا۔ سرور بھی جب کسی کی تعریف یا مذمت میں قلم کا زور دکھاتے ہیں تو مبالغے کے پل باندھ دیتے ہیں۔ اس کتاب میں مبالغہ آمیز مدح وذم کی مثالیں وہ طول وطویل عبارتیں ہیں جن میں عہد امجد علی شاہ کی خرابیاں بیان کی گئی ہیں۔ ایسے حد سے گزرے ہوئے مبالغے کا ایک اچھا پہلو یہ ہے کہ پڑھنے والے کو اس پر حقیقت کا دھوکا نہیں ہوسکتا۔''[۲]

یہی بات ہمارے دوسرے بزرگ دانش ور اور بالغ نظر مصنف مولانا عبدالماجد دریا آبادی بھی فرماتے ہیں:

''اودھ کے آخری چار بادشاہوں کے اس میں حالات ہیں لیکن اب تاریخ سے کہیں بڑھ کر ادب وانشاء کی کتابوں میں شمار ہونے کے لائق[۳] ہے۔''

لیکن قومی آواز ایسے باوقار روزنامے کے مبصر خبیر بات کی تہہ تک نہ پہونچ سکے اور یہ رائے قائم کی:

''یہ تحریر ان تاریخی صداقتوں کی حامل ہے جن کی تلاش تاریخ اودھ کے مطبوعہ ذخیرہ میں کرنا فعل عبث ہے۔''[۴]

بچارے یہی بھول گئے کہ زیر تبصرہ ایڈیشن قلمی نسخے پر مبنی نہیں تھا، مطبوعہ ذخیرے ہی

---

[۱] واجد علی شاہ اور اودھ ص ۶۲

[۲] دیباچہ فسانۂ عبرت، ص ۷

[۳] صدق جدید لکھنؤ، یکم اگست ۱۹۵۸، بحوالہ فسانۂ عبرت، ص ۶۱

[۴] قومی آواز لکھنؤ، ۱۳ جنوری ۱۹۵۸ بحوالہ فسانۂ عبرت، ص ۱۶

سے لیا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ جب قومی آواز کے مبصر اور بابو پری پورنا نند ورما کی طرح کے متوازن لوگ غلط فہمی کا شکار ہو سکتے ہیں تو یہ عام قاری چہ رسد! واقعہ یہ ہے کہ پنڈت سندر لال نے حقیقت حال کی کتنی صحیح نبض شناسی کی ہے:

> ''اس طرح کی جھوٹی اور خیالی تاریخ کا نتیجہ ہماری قومی زندگی پر اور خاص کر ہمارے تعلیم یافتہ اہل وطن کی ذہنی کیفیت پر اتنا گہرا پڑا ہے کہ آج تک ہماری قومی ترقی کی راہ میں بھی یہی سب سے بڑی رکاوٹ دکھائی دے رہی ہے۔''[1]

## 'مطالعہ' کا مطالعہ

پنڈت جی کے محولہ بالا تبصرہ کی سب سے اچھی مثال تاریخ اودھ کے سیاق وسباق میں ہمارے عزیز ونوجوان دوست ذکی کاکوروی کا مجموعہ مضامین 'مطالعہ' ہے۔ انھیں جھوٹی اور خیالی تاریخوں نے آپ کو شاہان اودھ سے اس درجہ بیزار کردیا کہ ان کے حق میں کلمۂ خیر کہنے والے کو بھی امان نہیں دیتے۔ چند فقرے ملاحظہ فرمایئے:

> ''واجد علی شاہ کی بے حس ذلیل طبیعت، ایسا ماحول جو انتہائی نجس تھا۔ عیاشی اور عیش پرستی کا مجسمہ شاہان اودھ کی بدکرداری اور بدذوقی۔''

پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیبؔ مرحوم کا مرتبہ و مقام اردو ادب و تحقیق میں جو ہے اُسے دیکھئے اور نوجوان مصنف کے یہ تبصرے ملاحظہ کیجئے: 'مسعود صاحب کو موضوع سے صحیح واقفیت قطعی نہیں۔''

ان کی ''جملہ تاریخی تحقیق سطحی اور محدود'' کورانہ عقیدت مندی، فاضِل مورخ کے غلط سلط اقتباسات مضحکہ خیز طریقۂ تحقیق وغیرہ وغیرہ۔ ماخذوں کے بارے میں کہ فاضل ادیب'' ردی کی ٹوکری پر اتر آئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس سطح پر تو مصنف سے گفتگو ممکن نہیں

---

[1] بھارت میں انگریزی راج، ج،۱،ص ۱۱۲

ہے۔لیکن پھر بھی نفس اعتراضات واتہامات پر جہاں تک امجد علی شاہ کا تعلق ہے نظر کرنا پیش نظر مطالعے کے لئے ضروری ہے۔ متن وحواشی میں امجد علی شاہ کا ذکر جس طرح آیا ہے اس سے فرد جرم کی ہیئت کچھ اس طرح کی ہوتی ہے۔

(۱) سریندرناتھ سین نے ،اٹھارہ سو ستاون ، میں بالکل صحیح لکھا ہے کہ ''ان کے (یعنی واجد علی شاہ) کے والد نے ان کو بدقومے گویّوں کے ساتھ رہنے کی اجازت دے دی تھی۔''

(۲) حقیقت یہ ہے کہ امجد علی شاہ خود بھی اپنے کردار کی خامیوں میں واجد علی شاہ سے مختلف ضرور تھے مگر کم ہرگز نہ تھے۔

اس کے بعد حاشیئے میں حکیم نجم الغنی خاں کا ایک اقتباس دیا ہے۔اس سے پیدا ہونے والے دوایک اعتراضوں کو ہم دیکھ آئے ہیں باقی یہ ہیں:

(الف) مذہب شیعہ نے خوب رونق پائی

(ب) نادرالعصر میں لکھا ہے کہ مجتہد صاحب ہنود اور اہل سنت وجماعت کے عروج پر حسد کرتے تھے۔

(ج) زرنان کاری تنخواہ اکثر اہلسنت اور ہنود کا ضبط ہوکر مومنین اثنا عشری کے نام پر مقرر رہوا۔

(۳) جاہلانہ مذہبیت اور کم عقلی

(۴) ملک کے انتظامی امور سے لے کر بادشاہ کی نجی زندگی تک ہر کام میں مجتہدین کا دخل تھا۔

(۵) بادشاہ میں تنگ نظری اور فضول خرچی بہت تھی

(۶) بڑے بڑے عہدوں اور وزارت کی تبدیلیاں

(۷) سود پر روپیہ چلانا

(۸) بڑے بیٹے مصطفیٰ علی حیدر کے ساتھ بدسلوکی

(۹) مجتہدین پر لاکھوں روپیہ خرچ کرنا
(۱۰) جلسے اور بڑی بڑی دعوتیں، فضول خرچیاں اور بدانتظامیاں
(۱۱) امجد علی شاہ کو ہندوؤں اور سنّیوں سے نفرت تھی

آیئے! اب اس البیلی لیلائے تحقیق کے چہرے سے غیر منہضم خیالات، جوش اور کم فکری کی تہ در تہہ نقابیں اٹھائی جائیں۔

(۱) ذکی صاحب کے جذبات کی تسکین ڈاکٹر سینؔ کے خیالات سے ہوتی ہے، یہ الگ بات ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ آزاد جمہوریہ کا سرکاری مورّخ ہوتے ہوئے بھی ڈاکٹر سینؔ کا نقطۂ نظر برطانوی سامراج کے حق میں ہے۔ پی۔ سی۔ جوشی اپنی شاہکار تالیف 'انقلاب ۱۸۵۷ء' میں کہتے ہیں:

''اس جد و جہد کے دوران عوام کی سماجی قوتیں بھی بروئے کار تھیں، جن کے ساتھ نئے خیالات اور نئے عوامل بھی آئے۔ حیف کا مقام ہے کہ ڈاکٹر موز مدار، ڈاکٹر سین اور پنڈت نہرو نے نہ تو ان پر توجہ کی اور نہ انھیں کوئی وقعت دی۔''[۱]

اسی نقطۂ نظر سے انھوں نے شاہان اودھ کے کردار کو دیکھا۔ انھوں نے سلیمن اور اودھ بلو بک، کو مستند جانا جواب بلو بک کو عوام کے سماجی قوتوں اور نئے عوامل و خیالات کی طرح بے وقعت مانا۔ ورنہ یہ موسیقاران باکمال بدقومے گویّے تھے یا کیا تھے، انھیں معلوم ہو جاتا۔ اس سلسلے میں برڈ کی کتاب کا نواں باب قابل ملاحظہ ہے جو اب انگریزی کے علاوہ ہندی میں بھی دست یاب ہے۔

ڈاکٹر سین کی دقیانوسیت اور احیائیت کے ثبوت کے لئے تو یہی کافی ہے کہ جمہوری ہندوستان میں سانس لے کر وہ بدقومی اور خوش قومی کا سوال اٹھاتے ہیں۔ ہندوستان کی تاریخ کا یہ کوئی معمولی المیہ نہیں کہ یہاں کے بادشاہ ہوں پر سیکولرازم کے تازہ

---

[۱] انقلاب ۱۸۵۷ء ص، ۱۸۸

سے تازہ تر معیار پر پورا اُترنے کی شدت کی جاتی ہے اور پھر وہ نالایق ثابت کئے جانے کیلئے نسل ورنگ کے قدیم سے قدیم تر معیاروں سے پرکھے جاتے ہیں۔

(۲) امجد علی شاہ اپنے کردار کی خامیوں میں واجد علی شاہ سے کم نہ تھے۔ اسی کا نام ہے 'بناء فاسد علی الفاسد' مہمل دلائل سے مہمل نتائج اخذ کرنا۔ انگریزوں یا ان کے میاں مٹھوؤں کی کتابیں ایسی نہیں ہیں جن پر اعتماد محتاط طریقۂ کار یا معقول طرز عمل ہو۔ سلطان عالم واجد علی شاہ کے کردار کو سمجھنے کے لئے ان سطروں کے منظر عام پر آنے سے پہلے مسعود صاحب کی شاہ کار تخلیق مہیا ہو چکے گی۔ ہر وہ شخص جو ان کے طریقۂ تحقیق کو مضحکہ خیز نہ سمجھتا ہو یقیناً اس کتاب سے محظوظ بھی ہوگا اور مستفید بھی۔ آپ یہاں پنڈت سندر لال کا ایک اقتباس ملاحظہ کریں جس میں مشہور انگریزی مورّخ سر جان کے اعتراف نقل کئے گئے ہیں۔ پنڈت جی نے ہندوستانی فرماں رواؤں پر جھوٹے کلنک کے عنوان سے ایک فصل لکھی ہے اور یہ اقتباس وہیں سے کیا جا رہا ہے:

''ہم لوگوں میں یہ رواج ہے کہ پہلے کسی ہندوستانی فرماں روا کا راج اس سے چھین لیتے ہیں۔ پھر معزول فرماں روا یا اس کے ہونے والے جانشین پر جھوٹے کلنک لگا کر اسے بدنام کرتے ہیں۔''[۱] (ترجمہ)

ایم۔ ایم۔ مسیح الدّین کا کہنا ہے:

''ان (واجد علی شاہ) پر لگائے گئے الزامات من گڑھت اور اوٹ پٹانگ ہیں۔ جو محض بادشاہ کی بدنامی کے لئے گڑھ لئے گئے ہیں۔ کرنل سلیمن نے من گڑھت الزام لگانے میں سبھی مذمت گروں کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔''[۲] (ترجمہ)

انگریزوں نے واجد علی شاہ کی نسبت جو کچھ گڑھوایا ہے، پنڈت سندر لال اس کا خصوصیت سے ذکر کرتے ہیں:

---

[۱] بھارت میں انگریزی راج ج ۱، ص ۱۱۰

[۲] اودھ کی لوٹ، ص، ۱۱۵۔ حاشیہ

''واجد علی شاہ کی حکومت اور کردار پر طرح طرح کے جھوٹے کلنک لگا کر کئی کتابیں لکھوائی گئیں۔ ان میں ایک مشہور کتاب لارڈ ڈلہوزی کے سیرت نویس سر جان آرنلڈ کی لکھی ہوئی ہے...... مگر بدنصیبی سے آرنلڈ جیسوں کی کتابوں کی بنیاد پر کئی ناول لکھے گئے۔ واجد علی شاہ کے خیالی گناہ ایک تاریخ سے دوسری تاریخ میں نقل کئے جانے لگے اور آج تک بے شمار ہم وطن ان میں سے کئی گندے الزاموں کو سچّا مانتے چلے آرہے ہیں۔''[1]

جویائے حق اس تبصرے سے ازسرِ نو اپنی رائے قائم کرنے میں مدد لے سکتا ہے۔ لیکن اگر کسی کی تسکین قلب ہی امجد علی شاہ اور ان کے فرزند واجد علی شاہ کو برا سمجھنے اور کہنے میں پنہاں ہے تو اس سے کوئی مطالبہ نہیں۔

(الف) مذہب شیعہ نے خوب رونق پائی: اگر یہ جرم ہے تو تسلیم ہے اس کی شہادت تو خود اسی کتاب کے پچھلے اوراق ہیں۔ لیکن کیا اسے واقعی جرم سمجھا جانا چاہیئے کیا وہ دور لادینی (سیکولر) حکومت کا تھا! کیا حضرت بہادر شاہ ظفرؔ مرحوم کے نام نامی کا خطبہ جمعہ وعیدین کی نمازوں میں نہیں ہوتا تھا! کیا خود کمپنی بہادر کی ملک گیری کا مقصد محض نفع اندوزی تھا، عیسائیت کی تبلیغ نہیں؟

الزام لگانے والے اور ان الزاموں پر سر دھننے والے احباب اسے فراموش فرما دیتے ہیں کہ اودھ، دلّی کی مرکزی حکومت کا ایک تابع صوبہ تھا۔ انگریزوں کی شہ زوری اور اپنی کمزوری کے باعث مرکز کا قلادۂ اطاعت اتارنے پر مجبور ہو گیا تو بھی نظم و نسق کا خاکہ وہی رہا جو ہندوستان کے شاہان اسلام کا تھا۔ آیئے! دیکھیں کہ اس دور میں مذہب کی نگہداشت اور نومسلموں کی خاطر داشت کا کیا انتظام تھا اس کو سمجھنے کے لئے بس دو عہدیداروں سے تعارف کافی ہے۔ ایک شیخ الاسلام، دوسرے داروغہ جدید الاسلام، اور ان کی تعریف مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی اور علامہ سید سلیمان

---

[1] بھارت میں انگریزی راج، (۲) ص، ۸۰۲

ندوی کی زبان قلم سے ملاحظہ کریں:

''چونکہ ترک، مغل، پٹھان بادشاہوں کو وہ دینی وقار اور مذہبی تقدس حاصل نہ تھا اس لئے حکومتوں میں شیخ الاسلام کا ایک جدید عہدہ وضع ہوا۔ بادشاہ کی دینی و دنیاوی وہ مرکب وممزوج حیثیتوں میں سے وزیر دنیاوی اور شیخ دینی حیثیت کے مظہر تھے۔''[1]

''داروغہ جدید الاسلام'' کا ذکر خیر خود جناب علامہ کی لفظوں میں ملاحظہ فرمائیے:

''عہد حکومت مغلیہ میں داروغہ جدید الاسلام کے نام سے ایک عہدہ تھا، نومسلموں کی غورو پرداخت اس کا فرض تھا۔ اس کو بہت سی سرکاری اعانتیں ملتی تھیں۔''[2]

قارئین گرامی اس غلط فہمی میں نہ پڑیں کہ مذہب کی سرکاری سرپرستی مغلوں یا مسلمانوں کی ایجاد ہے اپنے وطن میں تو ہم اس کے آثار اشوک کے عہد میں بھی پاتے ہیں:

''یہ بڑی دلچسپ بات ہے کہ جب سمراٹ اشوک نے بدھ مت کو پھیلانے اور لوگوں کو تبدیلئ مذہب پر آمادہ کرنے کی پوری کوشش کی اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے سرکاری ذرائع کو بھی استعمال کیا۔ پھر بھی ہم اشوک کو عظیم شہنشاہ مانتے ہیں۔''[3]

یہی دانشور آگے چل کر لکھتا ہے:

''سیکولر اسٹیٹ کا تصور بہت جدید ہے اور اس طرح تاریخی طور پر یہ وسطی صدیوں اور اس سے قبل پر منطبق نہیں ہوسکتا اس لئے اگر اس دور میں حکومت تبلیغ کرتی ہے تو بھی بالکل اسی طرح قرین قیاس تھا۔ جیسا کہ سمراٹ اشوک کے معاملے میں۔''[4]

ان اقتباسات کے پیش کرنے کا ہرگز یہ مقصد نہیں ہے کہ امجد علی شاہ یا شاہان مغلیہ

---

[1] حیات سلیمان، ص ۱۵۷

[2] وہی، ص ۲۵۳

[3] مضمون ہربنس مکھیا ترجمہ امین اللہ شاہین، سہ ماہی، عصری ادب دہلی جولائی، ۱۹۷۰ء، ص ۱۵۵

[4] سہ ماہی عصری ادب دہلی جولائی، ۱۹۷۰ء ص ۱۵۶

نے تبدیلئ مذہب کی کسی عام مہم میں حصّہ لیا تھا اور اس کی صفائی پیش کی جائے۔ مقصد صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ نئے تبدیل مذہب کرنے والوں کی ضرورت کا لحاظ رکھنا اور ان کے ساتھ رعایت برتنا آئین جہاں بانی اور عدل کے خلاف شمار نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ اس وقت لادینی طرز حکومت ایجاد ہی نہیں ہوا تھا۔ ایجاد ہو بھی چکا ہو تو مغلیہ حکومت یا اس کے صوبے داروں کی حکومت کا نصب العین نہیں بنا تھا۔

امجد علی شاہ کے عہد میں بھی جبری تبدیلئ مذہب کی ایک مثال نہیں ملے گی ریذیڈنسی کے جلال و جبروت کے ہوتے ہوئے یہ ممکن بھی کہاں تھا۔

(ب) نادر العصر میں لکھا ہے کہ ''مجتہد صاحب ہنود اور سنت جماعت کے عروج پر حسد کرتے تھے''، یہ الزام بہت دلچسپ ہی نہیں ہمارے لئے بہت کارآمد بھی ہے۔ کیونکہ اس سے تو ثابت ہوتا ہے کہ اہلسنت و اہل ہنود کو اتنا عروج حاصل تھا کہ مجتہد صاحب تک کو حسد کرنے کی نوبت آ گئی تھی۔ یہ وہی مجتہد صاحب ہیں جن کا بقول راجہ درگا پرشاد مہرؔ سندیلوی صاحب بوستان اودھ ''حکم آب و باد پر جاری تھا'' اور گویا مجتہد صاحب کا رتبہ ان سے فروتر تھا۔ آخر حسد تو محروم و کم تر ہی فائز و برتر سے کرتے ہیں۔

اصل یہ ہے کہ 'نادر العصر' منشی نول کشور نے کرنل سانڈرس الکس اپیٹ صاحب بہادر کمشنر لکھنؤ، کے نام نامی کی یادگار کے واسطے تالیف و ترتیب کیا تھا۔ منشی جی تاجر تھے اور مال گاہک کی پسند کے مطابق پیش کرنے کا ہنر خوب جانتے تھے۔ انھوں نے کتاب اپنے ضمیر کی آواز یا شاہان اودھ کی ''یادگار'' کے واسطے تالیف نہیں کی تھی۔

نادر العصر کو ملاحظہ فرمانے والے حضرات پر یپورنانند ورما کی رائے بھی دیکھیں:

''چیف جج مجتہد العصر سُلجھے ہوئے آدمی تھے اس کا تجربہ ایک المناک واقعے سے ہوتا ہے۔''[۱] (ترجمہ)

---

[۱] واجد علی شاہ اور اودھ، ص، ۱۹۰

اب دو رائیں سامنے ہیں، ایک سامراجی دور کے خطاب یافتہ تجارت پیشہ کی۔ دوسری آزادی وطن کے مجاہد بالغ نظر دانشور کی۔ آپ جسے چاہیں قبول کریں۔ یہی نجم الغنی خاں جنھوں نے نادر العصر کی روایت لکھی ہے اپنی تاریخ میں مفتی محمد یوسف صاحب مرحوم کی تقرری کا ذکر کرتے ہیں کہ مولوی محمد اصغر صاحب مفتی نے اپنی زندگی سے مایوس ہو کے اپنی جگہ اپنے صاحبزادے مولوی محمد یوسف صاحب کے تقرر کی استدعا کی۔ ان کی علمی لیاقت کا اختیار مجتہد العصر کے سپرد ہوا، مجتہد العصر کا جواب ملاحظہ ہو:

> ''فقہ حنفی نیز دیگر علوم میں مولوی یوسف صاحب کی گیرائی و گہرائی ان کے والد کے عہد ہی سے ظاہر تھی، فقہی فتوؤں میں ماضی کے آثار کی پیروی ان کے نام ہی سے سمجھ میں آتی ہے۔ ان کے خاندان کا فضل و کمال انتہائی شہرت پر ہے پشتوں سے اس سرکار سے وابستہ ہیں اور الولد سر لابیہ کے مطابق فتوائے اہلسنت کی پوری استعداد و لیاقت رکھتے ہیں۔''[1] ترجمہ

یہ فیصلہ اہل نظر و نصفت پر چھوڑا جاتا ہے کہ یہ عبارت ہمدردی و قدر شناسی کی مظہر ہے یا نفرت و حسد کی۔ نفرت و حسد ہوتا تو اس خاندانی سلسلے کو ختم کر کے اطمینان کی سانس لی جاتی یا بس دو ایک چلتے ہوئے جملوں میں بات ختم کر دی جاتی۔ مدحیہ عبارت کی ضرورت نہ تھی۔

(ج) زرنان کاری تنخواہ اکثر اہل سنت و ہنود کا ضبط ہو کر مومنین اثنائے عشریہ کے نام پر مقرر ہوا۔''

یہ الزام بہت مبہم ہے جب تک تعین کے ساتھ سب نہ سہی کچھ نام نہ معلوم ہوں جائزہ نہیں لیا جا سکتا۔ یہ بہت ممکن ہے کہ جو وظیفے بند ہوئے تھے ان میں کچھ غیر شیعہ افراد

---

[1] تاریخ اودھ ۵ /ص ۲۶

بھی رہے ہوں۔ مگر کسی اثنا عشری کی نئی نا نکار جاری ہونا بالکل خلاف قیاس اور تقریباً مستحیل ہے۔ کیونکہ سلطنت سنبھالتے ہی امجد علی شاہ نے شہزادوں تک کے وثیقے ایک چوتھائی کے بقدر کم کردیئے [۱] تھے۔ دوسرے شعبہ ہائے سلطنت میں بھی تخفیف عمل میں آئی تھی جس کا مذاق سرورؔ نے یوں اڑایا ہے:

''مزاج معلیٰ تخفیف کی طرف آیا بحدیکہ صرف اسراف ہوا۔ سب پر ہتّھا صاف ہوا۔ جُز پر طبیعت مصروف ہوتی کل کو بگاڑا۔ اس بکھیڑے میں جز و کل کو بگاڑا پہلے باورچی خانہ سرد ہوا خاصہ اس قدر کم ہوا۔ پھر قفل ایک عالم ہوا سرکار کا مودی پوجا کر کے دوپہر ڈھلے دوکان کھولنے لگا۔ صبح کا راتب اس وقت سیر کا تین پاؤ تولنے لگا۔ نقدی موقوف، معاملہ ادھار کا ہوا۔ میدے میں میل جوار کا ہوا۔'' [۲]

ظاہر ہے کہ یہ حقیقت حال کی عکاسی نہیں ہے۔ سرورؔ کی مبالغہ آرائی اور زیٹ ہے۔ لیکن یہ نتیجہ نکالنا بجا ہے کہ تخفیف کا عمل ہمہ گیر تھا اس کا محور مذہبی تعصّب نہ تھا۔ مومنین اثنائے عشریہ کے زرنا نکار کی روایت اس لئے محض ناقابل یقین ٹھہرتی ہے کہ علمائے شیعہ کے بھی وظیفے بند کردیئے گئے تھے۔ مفتی میر عباسؒ کے لئے تو صراحتاً معلوم ہے:

''مفتی صاحب کے لئے ۱۲۵۸ھ میں محمد علی شاہ کی طرف سے علمی قدردانی ہوئی اور مناسب وظیفہ مقرر ہوا۔ اسی زمانے میں جواہر عبقریہ تصنیف کی۔ بادشاہ موصوف کی حیات تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ پھر موقوف ہوگیا۔'' [۳]

اگر ۱۲۵۸ھ میں کہیں بھول چوک نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ وظیفہ ایک دو مہینے سے زیادہ نہ مل سکا ہوگا اور تخفیف میں آ گیا ہوگا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ مفتی صاحب

---

[۱] سوانحات، (۱) ص ۳۷۰

[۲] فسانۂ عبرت، ص ۶۵

[۳] تجلیات، ص ۷۶

کا وظیفہ کس مومن اثنا عشری کی نا نکار کے لئے بند ہوا۔

(ج) ''جاہلانہ مذہبیت و کم عقلی''ہم دیکھ چکے ہیں کہ امجد علی شاہ کا رجحان ابتداء سے علمی رہا۔ ولی عہدی کے بعد سے علماء کو تصنیف و تالیف پر آمادہ کرنے لگے۔ حضرت رسالت مآبؐ اور آئمہ اطہارؑ کی سوانح عمریاں، تفسیر قرآن، عقائد کی مبسوط کتابیں ان کے دور کی یادگار ہیں۔ نہ صرف تصنیف و تالیف بلکہ طباعت و اشاعت بھی۔ مدرسۂ سلطانیہ کا قیام و رصد خانے کی تکمیل۔ یہ سب ان کی مذہبیت اور ذوق علمی کی یادگاریں ہیں اگر عقل اس قوت کا نام ہے جس کے وسیلے سے رب رحمان کی عبادت اور فردوس جناں کی تحصیل کی جائے تو اسے کیسے بے عقلی میں شمار کیا جائے۔

(۴) ''بادشاہ کی نجی زندگی تک ہر کام میں مجتہدین کا دخل تھا۔'' یہ الزام برائے الزام ہے۔ کیونکہ نظم و نسق کی محکمہ جاتی تقسیم کار کی تھی۔ وہ شعبے جو علما کے دائرہ تصرف سے باہر تھے ان میں علما کی مداخلت کا کوئی معاملہ تو سامنے آیا نہیں، اگر آیا ہو تو سراغ دیا جائے۔ جہاں تک نجی زندگی کا سوال ہے کسی خدا پرست اور دیندار کی زندگی میں علماء کا دخل ناگزیر ہے۔ پھر اسلام تو نظام زندگی اور نظام حکومت دونوں کا حامل ہے۔ استبرا و استنجا سے لے کر جہاں داری و جہانبانی کے تمام آداب معین ہیں اگر اس کا پیرو اللہ اور اہل اللہ کو زندگی کے ہر کام میں دخیل رکھے تو قابل اعتراض نہیں ہونا چاہیئے۔

(۵) ''تنگ نظری اور فضول خرچی'': تنگ نظری نئی چوٹ نہیں ہے، دوسرے الفاظ میں پہلے بھی دی جا چکی ہے۔ شرف الدولہ بہادر کے معاملے کی ایک معین مثال پیش کی گئی تھی۔ بقدر گنجائش جائزہ لیا گیا۔ دوسرا کوئی معین معاملہ سامنے نہیں آیا۔ مبہم الزامات کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔

اب رہی فضول خرچی، اس طرح کے الزامات میں یہ دیکھنا ذمہ داری کا تقاضہ ہے کہ اس میں ریذیڈنسی کا کتنا ہاتھ ہے۔ برڈ کے ان بیانات سے حالت سمجھنے میں مدد

ملے گی۔ ہر چند کہ یہ واقعات سلطان عالم کے دور کے ہیں پھر بھی ریذیڈنسی کی خبیثانہ مداخلت کی نشان دہی تو کرتے ہیں:

''فریڈرک جان شور کے ایک اہم بیان سے پتہ چلتا ہے کہ برٹش کمپنی کے دلالوں نے بادشاہ پر کتنے ہی جور وظلم کئے۔ شور کا بیان ہے کہ: میں نے خود دیکھا ہے ریذیڈنٹ نے ایک بڑے ہی قیمتی کھلونے کو بادشاہ سے خریدوا ڈالا۔ بادشاہ کو پہلے خود ہی کھلونا دکھلانا اور بعد میں اسے خریدنے کے لئے دباؤ ڈالنا۔ اگر مداخلت نہیں تو اور کیا ہے۔ انھیں بزرگوار نے بادشاہ پر یہ بھی دباؤ ڈالا کہ انگریز گاڑی بانوں، مالیوں گویّوں نیز کئی اور لوگوں کو اپنے ظل عاطفت میں لے لیں بادشاہ کے سر بلا وجہ انھیں منڈھ دیا گیا۔ انھیں حرکتوں سے کمپنی کے مظالم میں اودھ کو ایک طویل مدت تک مبتلا رکھا گیا۔''[1]

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ ''طویل مدت'' محض واجد علی شاہ کے دور کے دس سال کی نہیں ہے اس سے کہیں زیادہ ہے اور اس میں امجد علی شاہ کا دور یقیناً شامل ہے۔ ناجانبدار اہل قلم کے لئے ذمہ داریاں معین کرتے وقت بڑی احتیاط درکار ہے۔ ہاں! دل کی بھڑاس نکالنے والے کے سامنے بڑا وسیع میدان ہے۔

(۶) بڑے بڑے عہدوں اور وزارتوں کی تبدیلیاں: بلا شبہ وزارت میں تبدیلیاں ہوئیں۔ اس حقیقت کو ثابت کرنے کے لئے استشہاد کی ضرورت نہیں کہ یہ تبدیلیاں بہت کم بادشاہ کی اختیاری ہوتی تھیں اس کے تار کا سرا ریذیڈنسی میں رہتا تھا اور بیشتر وہیں سے جنبش دی جاتی تھی۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ شرف الدّولہ کو ریذیڈنٹ نے ہٹوایا۔ ایک مختصر وقفے کو چھوڑ کر جب منور الدولہ وزیر رہے۔ بیشتر دور امجدی میں امین الدولہ ہی وزارت پر فائز رہے۔ بادشاہ امین الدولہ کے اتنے مستقل وثابت قدم پشت پناہ نہ ہوتے تو اور بھی تبدیلیاں ہوتیں۔ لیکن اس کو بھی تو دیکھنا چاہیے کہ

---

[1] اودھ کی لوٹ، ص ۱۱۱

ریذیڈنٹوں میں کتنی تبدیلیاں ہوئیں۔ انگریزوں سے تعلقات کے ذیل میں اس کی تفصیل عرض کی جا چکی ہے، یہاں اعادے کی حاجت نہیں۔

وزیروں میں تبدیلیاں ہوئیں تو ان کے ڈپٹیوں اور مقرب زیر دستوں میں ناگزیر تھیں اور یہ زیادہ تر مسلمان تھے۔ سلطنت کا نظم و نسق ۲۵ سے زائد شعبوں میں منقسم تھا۔ بہت تھوڑے محکمے ایسے ہیں جن میں تبدیلیاں نظر آتی ہیں۔ بعض میں امراء کا موروثی سلسلہ تھا[۱] بھٹنا گر نے بتایا ہے کہ بخشی گری کی سر دفتری پر پہلے راجہ لال جی بہادر، اور پھر ان کے بیٹے راجہ الفت رائے پھر ان کے پوتے دھنپت رائے فائز رہے۔ اسی طرح دفتر بیت الانشا یا منشی خانہ سلطانی کی افسری پر راجہ کندن لال کا تقرر عہد محمد علی شاہ میں ہوا اور وہ ۱۸۴۸ء تک اپنی تاحیات اس عہدے پر فائز رہے اور یہ عہد واجدی تک بحال رہے۔ اس دور کی آزاد حکومت میں بھی وہی اس عہدے پر آئے۔ اگرچہ ان کے اخلاص پر شبہ ظاہر کیا جاتا ہے:
مدبر الدولہ راجہ جوالا پرشاد کے تعلق کی ابتداء عہد آصف الدولہ سے ہوتی ہے۔ جب ان کے دادا راجہ خوشحال رائے کی نیابت میں بخشی مقرر ہوئے تھے ان حالات پر نظر رکھنے والا ایسے لغو الزامات نہیں لگائے گا۔

(۷) سود پر روپیہ چلانا: یہ بھی من جملۂ الزامات ہے۔ بادشاہ بد انتظام بھی تھے، مجتہدین کے اشارۂ چشم و ابرو کے تابع بھی تھے سودی کاروبار بھی کرتے تھے۔ خدا جانے یہ اجتماع اضداد بآن واحد ہوا کیسے! علماء کے ساتھ امجد علی شاہ کے حسن اعتقاد کی جو عمومی شہرت ہے اور علمائے اعلامؒ کی ان کی نسبت جو رائیں ملتی ہیں ان کو دیکھتے ہوئے سود خواری تو کیا کسی خلاف شریعت کاروبار کا یقین کرنا ممکن نہیں۔ اگر یہ اشارہ برٹش کمپنی میں جمع زر ودیعت کے متعلق ہے تو پھر اس کا فیصلہ نقاد کی رائے سے نہیں

---

[۱] اودھ انڈر واجد علی شاہ، ص ۱۴ تا ۱۸

اس فقہ کی رو سے ہوگا جس کے امجد علی شاہ متبع تھے۔

(۸) بڑے بیٹے مصطفی علی حیدر کے ساتھ بدسلوکی:۔ معترض اس معاملے میں بھی انتہا پسندی کا شکار ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ شرف الدّولہ اس گمان میں تھے کہ انتقال سلطنت امجد علی شاہ پر نہیں کسی اور پر ہوگا۔ شرف الدّ ولہ سے یہ بات بہت بعید ہے کہ وہ کسی محکم اساس کے بغیر یہ گمان کرلیں۔ اگر اساس تھی تو پھر وہ کوئی ''اور'' مصطفی علی حیدر کے سوا کون ہوسکتا تھا؟ ظاہر ہے کہ بتقاضائے بشریت امجد علی شاہ اس حد تک متاثر ہوئے کہ شہزادے کو اولاد تسلیم کرنے سے ہی منکر ہوگئے۔ پھر یہ کہ مصطفی علی حیدر غیر کفو بطن سے تھے انتزاع سلطنت کے موقع پر ریذیڈنٹ سے متبادل تجویز کے طور پر جو ملکۂ کشور نے کہا تھا وہ یہ تھا:

''ہر چند مصطفی علی حیدر ہمارے کفو نہیں ہیں مگر ان کو تخت نشین کر دیا جائے۔''[۱]

دوسری وجہ یہ تھی کہ شہزادۂ مصطفی علی حیدر کی افتادِ طبع کے باعث رائے عامہ ان کے حق میں نہ تھی۔ واجد علی شاہ بہت مقبول تھے۔[۲] امجد علی شاہ نے اتنے ہی پر اکتفا کی، دوسرا ہوتا تو معلوم نہیں کیا سلوک کرتا۔

(۹) مجتہدین پر لاکھوں خرچ کرنا:۔ ایسا الزام ہے جو سرتا سر محتاج ثبوت ہے۔ غالباً جو بات ڈاکٹر صفی احمد نے صراحتاً کہہ دی ہے وہ ذکی صاحب کہنا نہیں چاہتے۔ ''زکوٰۃ'' ایک مذہبی محصول پہلے امجد علی شاہ کے عہد میں خزانہ عامرہ پر عاید ہوا اور مجتہد العصر کو اپنے ہم مذہب فقراء و مساکین میں تقسیم کے لئے دیا گیا۔ یہ تین لاکھ سالانہ کی رقم ریاست اور اس کے باشندوں کی فلاح عامہ پر صرف نہیں کی جاسکتی۔[۳]

چار سال کے دوران بارہ لاکھ جو تاسّی مذہب کی پابندی سے شرعی مستحقوں میں تقسیم

---

[۱] اودھ انڈر واجد علی شاہ، ص ۱۸۔ ۱۴

[۲] واجد علی شاہ اور ان کا عہد از رئیس احمد جعفری ندوی، ص ۳۰۱

[۳] ٹوکنگس آف اودھ، ص ۵۳ تا ۵۵

ہوا۔ اس کا بڑا صدمہ ہے پچاسوں لاکھ کا نقد و جنس انگریزوں کی بھینٹ چڑھا۔ اس کی کسی بھائی کو فکر نہیں ہے۔ صفی صاحب کا استدلال تسلیم کرلیا جائے تو پھر اسلام طاق میں اٹھا کر رکھ دینے کی چیز بن جائے۔ اعتراض کی مشعل روشن کرنے سے پہلے معقولیت کا ہی نہیں انسانی خصوصیات کا مطالبہ بھی ہے کہ دیکھ لیا جائے کہ اس شعلے کی لپک کہاں تک جاتی ہے، جو احباب سیکولرازم کا مطلب بے دینی سمجھتے ہیں وہ گمراہی کا شکار ہیں اور پھر شاہان اودھ نے تو کبھی سیکولرازم کا دعویٰ بھی نہیں کیا، ان پر شدت کیوں! اور نہ اسلام کا نظام جہاں بانی اتنا ناقص ہے کہ اس میں عام باشندگان ریاست کو انصاف نہ مل سکے۔ ڈھائی یا پانچ فیصدی کی رقم اگر کوئی فرماں روا اپنے مذہبی عقاید کی تکمیل میں خرچ کرتا ہے تو شخصی حکومت میں یہ ماتم کرنے کی بات نہیں ہے۔ حکومت الٰہیہ میں تو بالکل نہیں۔

جہاں تک مجتہد العصر کی دیانت پر کمال الدّین حیدر کے اشارۃً اور صفی احمد کے صراحۃً اظہار شک و شبہ کا سوال ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس الزام کو کسی طرح کی اہمیت دینا یا قابل صفائی سمجھنا میری نظر میں یہ بھی گستاخی ہے۔ اس عصر میں اگر وہ متدین نہ تھے تو سمجھنا چاہیے کہ پھر کوئی ایماندار چشم مردم کے سامنے نہ تھا۔

(۱۰) جلسے اور بڑی بڑی دعوتیں، فضول خرچی اور بدانتظامیاں: فضول خرچیوں کے بارے میں پانچویں اعتراض کے ذیل میں گزارش کی گئی۔ اب پہلے بدانتظامیوں کو دیکھ لیں تب جلسوں اور بڑی بڑی دعوتوں کا لطف لیں گے۔

بدانتظامی کے الزامات غصب اودھ کے مقدمے کے فرضی دعویٰ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک دو کی بات نہیں، اس کا سلسلہ شجاع الدولہ کے عہد سے چلا اور حسب مصالح فرنگ گھٹتا بڑھتا رہا ہے۔ برطانوی ذہنیت کا راز برڈ نے بڑی چابک دستی سے فاش کیا ہے۔ اب دو ایک اقتباسات ملاحظہ کریں میجر جنرل لو کہتے ہیں:

''اودھ کے نظم و نسق کی بدانتظامیوں کے باب میں گزشتہ تیس برسوں سے اخباروں

میں بہت کچھ چھپتا رہا ہے۔ کسی نے اس کی مخالفت میں ایک لفظ بھی نہیں لکھی اور نہ جھوٹے بیانوں کو رد کیا ہے۔ اپنے ہم وطنوں کی تو عادت ہے کہ جن پڑوسی ریاستوں میں وہ کبھی گئے تک نہیں اور نہ انھیں کچھ وقوف ہی ہے جب بھی کوئی قضیہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے تو وہ ایک سرے سے وہاں کے حکمراں کو خطاوار ٹھہرانے لگتے ہیں لہٰذا حکمراں ہی اس کے لئے ذمہ دار قرار دے دیا جاتا ہے۔''[1]

ایک دوسرا بیان ملاحظہ فرمائیے:

''اکثر اودھ کو بدانتظامی کے لئے بدنام کیا جاتا رہا ہے اور جھوٹ موٹ الزامات اودھ پر لگائے جاتے رہے ہیں سب سے پہلی بات تو یہی ہے کہ سبھی الزام سراسر بے بنیاد ہیں۔ کسی الزام کی بھی سیدھی تردید کی جاسکتی ہے۔''[2]

یہاں پر ایک سوال اٹھتا ہے۔ سراج الدولہ کے مرشد آباد سے لے کر میر رستم خاں کے سندھ تک کون سا خطہ بدنظمی سے خالی تھا، جسے انگریزوں نے بخش دیا۔ مراٹھے، روہیلہ، بنگش، سکھ، سندھیا ان میں سے کسی کی جان بخشی انگریزوں نے کی۔ سب تو سب حضرت بہادر شاہ ظفر کے ہاتھ میں کون سا انتظام تھا جس کو خرابی کے پاداش میں انھیں بدترین ایذا کا شکار بنایا گیا۔ اودھ تو اپنی تمام مبینہ یا افسانوی بدنظمیوں کے باوجود سب سے زیادہ سخت جان ثابت ہوا۔ کیا یہ بات لایقِ شمار ہی نہیں۔ شاہان اودھ کے نقاد بالکل اسی طرز فکر کو اپنائے ہوئے ہیں جس میں یہ کہا جاتا ہے کہ فلسطین پر اسرائیلوں کا حق اسی لئے ہے کہ انھوں نے صحرا کو آباد کیا یہ دیکھنے والا کوئی نہیں کہ کس کی مدد سے آباد کر دیا۔ ہوسکتا ہے کہ رقص بسمل سے تماشائی کی کبھی سیری نہ ہوتی ہو۔ لیکن سواد ظلم کبھی خود ہی مظلوموں کا ماتم کر لیتا ہے۔ سر ہنری لارنس کے اس اعتراف کو اسی قبیل سے سمجھ کے ملاحظہ فرمائیے:

---

[1] اودھ کی لوٹ، ص ۱۰۹

[2] وہی، ص، ۱۱۶

''اودھ کے معاملات میں ہر اہل قلم نے جو حقائق فراہم کئے ہیں وہ سب اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ اودھ کے ساتھ انگریزی مداخلت، اس کے دربار اور رعایا کے لئے جس قدر مضرت رساں ثابت ہوئی اسی قدر وہ برطانیہ کے نام کے لئے شرم ناک بھی تھے۔''[۱]

جلسے اور بڑی بڑی دعوتوں پر سہام ملامت برسانے سے پہلے مذاق زمانہ کا لحاظ ضروری ہے۔ یہ قطعاً ضروری نہیں کہ جو چیز سو برس بعد غلط لگے وہ اپنے زمانے میں بھی معیوب ہو۔ اگر کوئی بات اپنے عصری مزاج سے ہم آہنگ ہے تو یہ انفرادی یا شخصی نقص نہیں، اس دور یا عہد کی خرابی شمار ہونی چاہیے۔ اس بات پر اعتراض سے پہلے یہ دیکھنا انصاف پسند طبیعت کے لئے لازمی ہے کہ اس وقت کی دلّی اور لکھنؤ کی سماجی زندگی کی ثقاہت اور برگزیدگی کن چیزوں سے عبارت تھی۔ بیت السلطنت کو برطرف کریں مضافاتی قصبوں کو لیں تو محمود آباد، ملیح آباد، سندیلہ، موہان، نگرام کی سرزمین نے معلوم نہیں اس طرح کے کتنے نظّارے دیکھے ہوں گے۔ آج کے زمانے میں ماضی سے کٹے ہوئے بے خبر نوجوان اس پر معترض ہیں۔ اس وقت میں ان کی تعبیر اولوالعزمی، سیر چشمی، دریا دلی، مہمان نوازی اور کبھی کبھی غربا پروری سے کی جاتی تھی۔ آج کے مذاق و معیار سے بخوبی آگاہ انقلابی دانشوران یادوں کی برات نکالتے ہیں اور اگر ان پر فخر نہ کرتے ہوں تو بھی شرمندہ تو نہیں دکھائی دیتے۔ غلامی نے مزاج و معیار، تبدیل و پست نہ کر دیا ہوتا تو یہ باتیں بلا استثنا قابل فخر ہوتیں۔ اس سلطانی جمہور کے زمانے میں قانونی پابندی عاید کر کے ان کو روکنا پڑتا ہے۔

امجد علی شاہ کی برپا کردہ جو ضیافت بہت مشہور ہے وہ صمصام الدّولہ نوب تجمل حسین خاں والیٔ فرخ آباد کے اعزاز میں تھی۔ اسے عام دعوتوں میں شمار کرنا تشریفات (پروٹوکول)

---

[۱] لکھنؤ کی تہذیبی میراث، ص ۱۳۹

کو پامال کرنا ہے۔ایسی ضیافتیں تو شاید ابھی کسی ملک میں شجر ممنوع قرار نہیں پائی ہیں۔ اعتراض کا سنگ بنیاد کہاں سے لایا گیا ہے یہ سمجھ میں نہیں آتا اور پھر سوال اٹھتا ہے کہ سچ کیا ہے؟ اس بادشاہ کا ''یادگار بخل بروایت نادرالعصر یا تاریخی فضول خرچیاں؟''

(۱۱) واجد علی شاہ کو امجد علی شاہ کی طرح ہندوؤں اور سنیوں سے نفرت تھی۔اس الزام کو ہم شرف الدولہ بہادر کے ذیل میں ایک حد تک دیکھ چکے ہیں۔لیکن یہاں باپ کے ساتھ، بیٹے بھی ملوث کر دیئے گئے ہیں۔اس لئے ایک نظر یہاں ڈالنا ضروری ہو گیا ہے۔اصولی بحث سے پہلے یہ دیکھیں کہ اس بارے میں اور لوگ کیا کہتے ہیں:

''کرنل سلیمن کو لکھنؤ کا کوئی جشن، تیوہار اور دھوم دھام اس لئے ناپسند تھی کہ زبردست ہندو مسلم اتحاد کا یہ بڑا بھاری ثبوت تھا۔ایسی محبت انگریز نہیں چاہتے تھے سلیمن کے منھ سے یہ پاپ نکل ہی گیا۔وہ لکھتے ہیں کہ ''کبھی تعزیہ داری، محرّم کبھی روشنی ہندو تیوہار یہ سب دکن اور وسطی ہند کی ریاستوں کے مانند ہیں، کٹر مسلمان یہ سب پسند نہیں کرتے''۔[۱]

ورما جی کی رائے آپ نے ملاحظہ کی رئیس احمد جعفری ندوی فرماتے ہیں:

''واجد علی شاہ کے کردار و سیرت کو آج کتنے ہی بھیانک اور گھناؤنے روپ میں پیش کیا جائے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اپنی رعایا اور فوج دونوں میں حد درجہ ہر دلعزیز تھے۔جو ہر دلعزیزی واجد علی شاہ کو اپنے ملک میں حاصل تھی وہ بہادر شاہ ظفرؔ کو کبھی نہ حاصل ہوسکی۔اگرچہ بہادر شاہ اور ان کی رعایا کا مذہب ایک تھا۔لیکن واجد علی شاہ اور ان کی رعایا کے مذہب میں اختلاف تھا۔وہ شیعہ تھے یہ سنّی تھے اور دونوں اپنے مذہب پر سختی سے قائم تھے۔پھر بھی دونوں کے درمیان طبیعت اور عقیدت کا ایسا رابطہ استوار تھا کہ ضبطیٔ اودھ کے کاغذات مرتب ہو چکے تھے لیکن بغاوت

---

[۱] واجد علی شاہ اور اودھ............ص،۲۱

کے اندیشے سے انگریزوں کے دل دھڑک رہے تھے۔"[۱]

کہا جا سکتا ہے کہ اس میں ہندوؤں کا ذکر نہیں اس لئے اس طرف بھی توجہ ضروری ہے۔لہٰذا پنڈت سندر لال کی رائے دیکھئے:

"لارڈ ڈلہوزی کا بیان ہے کہ واجد علی شاہ کے مظالم سے اودھ کی پرجا دکھی تھی مگر جس طرح ۱۸۵۷ء میں سارے اودھ کے زمینداروں، جاگیر داروں، راجاؤں، سپاہیوں، کسانوں، سوداگروں مختصر یہ کہ سب ہندوؤں اور مسلمانوں نے مل کر واجد علی شاہ کو پھر سے اودھ کے تخت پر بٹھانے کے لئے دس دن کے اندر انگریزی راج کو اکھاڑ کے پھینک دیا اس سے واجد علی شاہ کی حکومت کی مقبولیت اور کمپنی کی حکومت کی نامقبولیت دونوں کا صاف پتہ چل جاتا ہے۔"[۲]

ہر چند کہ ان دانشور، آزادی کے سورما محبان وطن کی شہادت کے بعد دور غلامی کی تحقیقات میں بکھرے ہوئے مہملات کی کوئی حیثیت نہیں، پھر بھی اس مسئلے کو ایک اور رخ سے دیکھنا اصولاً ضروری ہے۔اور وہ یہ ہے کہ تعصب ونفرت کا اظہار ان باپ بیٹوں نے کس کے ساتھ کیا۔شرف الدولہ کے علاوہ کوئی اور نام تو بتایا نہیں گیا۔امجد علی شاہ کے دور میں سب سے مقرب ومعتمد امیر مدبر الدّولہ دبیر الملک منشی جوالا پرشاد تھے انھیں کو کمال الدّین بادشاہ کا مشیر خاص بتاتے ہیں۔اس دور میں جو غیر شیعہ امراء ملتے ہیں ایک بار پھر ذہن میں ان کا نام تازہ کر لیجئے۔تاکہ تعصب، تنگ نظری اور نفرت کا الزام لگانے والے یہ سوچ سکیں کہ اگر امجد علی شاہ کے دور میں سنّی اور ہندو ایک ہی حساب میں تھے تو شرف الدّولہ سے مختلف سلوک، منشی جوالا پرشاد، مہاراجہ، بال کرشن، راجہ کندن لال وغیرہ کے ساتھ کیوں! منشی عبداللطیف کی تقرری کیوں اور کیسے! منشی خلیل الدین خاں کی بحالی کا ہے کو۔ایک نہیں بہت سے نام راجہ درشن سنگھ غالب جنگ، راجہ جے لال سنگھ نصرت جنگ اور معلوم نہیں کون

---

[۱] واجد علی شاہ اوران کا عہد، ص ۳۰۶

[۲] بھارت میں انگریزی راج، (۲) ص ۸۲۲

اور کتنے! کیا یہ سب نفرت وتعصب کا ثبوت ہیں؟ اگر امجد علی شاہ کو سینوں سے ویسی ہی نفرت تھی جیسی کہ بتائی جاتی ہے تو ان کو وزیر امین الدّولہ ایک سنّی عالم حافظ عبدالعلی نگرامی کو بہ اصرار شدید ملازمت قبول کرنے اور پھر اس پر کارگزار رہنے کے لئے راضی کرتے نظر نہ آتے۔ یہ حکایت مولانا یونس نگرامی کے قلم سے ملاحظہ فرمایئے:

''امین الدّولہ وزیر سلطنت اودھ حافظ عبدالعلی صاحب کے بچپن کے ساتھی، ہم سبق[1] رہ چکے تھے............

ایک روز حافظ صاحب لکھنؤ کی ایک سڑک سے گزر رہے تھے تو امین الدولہ کی سواری بھی اسی وقت گزر رہی تھی اس وقت دونوں کی ملاقات ہوگئی۔ جس کی تفصیل مولانا مطلوب الرحمٰن نگرامی نے اس طرح معارف میں لکھی ہے: امین الدولہ کی نظر مولانا پر پڑی فوراً ہی اپنے بچپن کے ساتھی کو پہچان گئے۔ سواری کے روکنے کا حکم دیا اور مولانا سے بغلگیر ہو گئے بڑی دیر تک آپس میں عرصہ سے ملاقات نہ ہونے کا شکوہ وشکایت کا سلسلہ رہا۔ مولانا نے اس موقع پر بھی اپنی خودداری کو قائم رکھا، امین الدولہ نے دربار وزارت کو سرفراز فرمانے کا وعدہ لے لیا اور رخصت ہوئے دوسرے دن مولانا، امین الدولہ کے محل تشریف لے گئے۔ امین الدولہ اپنے استادزادے اور رفیق درس کو آتے ہوئے دیکھ کر سروقد کھڑے ہو گئے۔ اعیان دربار کو حیرت تھی کہ آخر یہ کون شخص ہیں جن کی یہ

---

[1] حافظ صاحب کا امین الدولہ کا ہم سبق ہونا قرین قیاس نہیں ہے کیونکہ حافظ صاحب کی ولادت ۱۲۳۱ھ کی ہے جو ۷-۱۸۱۶ء کے مطابق تھا۔ اس وقت تک امین الدولہ غالباً ذمہ دارانہ زندگی شروع کر چکے ہوں گے یا شروع کرنے کے قریب رہے ہوں گے۔ قیاس یہ ہے کہ دونوں، مولانا حافظ علیم اللہ صاحب کی بزم درس میں ایک ہی زمانہ میں رہے ہوں گے۔ لیکن حافظ صاحب مبادیات پڑھ رہے ہوں گے اور امین الدولہ فراغت کے قریب رہے ہوں گے۔ اس وقت یہ طریقہ عام تھا کہ ایک ہی استاد سے مختلف سطح کے طلاب درس لیا کرتے تھے صاحب تذکرۂ آب بقا نے مولوی وارث علی کے بارے میں لکھا ہے۔ ''وہ طلبا کو مفت درس دیا کرتے تھے اور میزان سے شمس بازغہ تک کے طالب علم ان کے پاس آتے تھے۔'' میزان صرف کی ابتدائی اور شمس بازغہ معقولات کی اعلیٰ کتابوں میں ہے۔ دیکھیں۔ ''ناسخ''، ص ۲۔۲۱۔ مصنفہ مولانا پروفیسر سید شبیہ الحسن نونہروی۔

تکریم و منزلت ہو رہی ہے............ اثنائے گفتگو میں امین الدولہ نے کئی بار اصرار کیا کہ آپ مجھ سے کچھ طلب کریں لیکن مولانا ہر بار اس سوال پر خاموش رہے۔ آخر میں امین الدولہ نے منگرایل ضلع اناؤ کی تحصیل داری کچھ اس انداز سے مولانا کی خدمت میں پیش کی۔ مولانا انکار نہ فرما سکے۔"[۱]

آپ ملاحظہ کریں کہ کس احترام سے پذیرائی ہوئی اور کس اصرار سے ملازمت کے لئے راضی کیا۔ لیکن مولانا نے یہ سلسلہ جاری نہ رکھنا چاہا، روکنے کے لئے اصرار کرتے ہیں:

"نگرام کے رہنے والے ایک خدا رسیدہ بزرگ میاں خدا بخش جن کو حضرت شاہ عبدالعزیز کی ہم نشینی کا شرف حاصل تھا منگرائل پہونچے اور مولانا سے ملے اور شفقت و محبت سے فرمایا کہ اللہ نے آپ پر بڑا احسان فرمایا ہے کہ علم دین کی نعمت عطا فرمائی ہے۔ یہ منصب وغیرہ آپ کے مرتبے سے بہت فروتر ہے............ چونکہ الفاظ دل سے کہے گئے تھے اس لئے فوراً ہی اپنا اثر کر گئے۔ فوراً ہی استعفا لکھا اور لکھنؤ پہونچ کر امین الدولہ کو پیش کر دیا امین الدولہ کے شدید اصرار اور مختلف ترغیبات و تحریصات کے باوجود استعفا واپس نہ لیا۔"[۲]

اگر یہ سب نفرت میں ہوتا ہے تو محبت میں کیا ہوتا ہے، یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آتی۔ مطالعہ، میں تقریباً تمام اعتراضات کا احاطہ پورے جوش و خروش بلکہ پوری سختی و درشتی سے کرلیا گیا ہے۔ لیکن ہمیں قاضی محمد صادق خاں اختؔر کے بیانات کا تعقب کرنا ہی پڑے گا۔ امجد علی شاہ کی مذمت میں نجم الغنی اور شرؔر دونوں ان کی شہادت پیش کرتے ہیں۔ شرؔر صاحب ان کا یہ بیان نقل کرتے ہیں:

"تمام اہل کار بدکار و بد باطن و خود غرض تھے۔ رعایا تباہ تھی۔ زبردست کا ٹھینگا سر پر تھا ظالم و مجرم کو سزا نہ ملتی تھی۔ خزانہ خالی تھا۔ رشوت ستانی کی گرم بازاری تھی اور جو

---

[۱] ضمیمہ قومی آواز مؤرخہ ۹ر فروری ۱۹۷۵ء

[۲] ضمیمہ قومی آواز مورخہ ۹ر فروری، ۱۹۷۵ء

فتنے پیدا ہوتے کسی کے مٹائے نہ مٹ سکتے۔''[۱]

جس استغراق سے تمام عمال کی بدکاری و بدباطنی کا اتہام قاضی جی............نے جڑا ہے اس کی زد سے تو نواب شرف الدولہ بھی نہیں بچتے۔ بھلا یہ عقل میں سمانے والی بات ہے! بدتر سے بدتر نظام میں بھی تمام عمال بدکار و بدباطن و خودغرض نہیں ہو سکتے۔ معدودے چند سہی مستثنیات تو ہوتے ہی ہیں، جیسے اچھے سے اچھے نظام میں سب کے سب تمام کے تمام عمال خوش کردار، پاک باطن و بے نیاز نہیں ہوتے۔ الزام کی ناقابل قیاس گیرائی و پہنائی خود ہی الزام کی صفائی ہے۔

دوسرا بیان رعایا تباہ تھی، رعایا تباہ ہوتی تو سرحد پار کر کے برطانوی ہند میں پناہ لینے پہونچ جاتی۔ کمپنی کے عمال اس کے لئے کوشاں بھی تھے اس بارے میں سبھی حکام ضلع سے کیفیت طلب کی گئی تھی مگر اودھ بلو بک ص ۴۴ پر تسلیم کیا گیا ہے کہ ''ابھی تک کوئی ایسا جواب نہیں ملا۔ جس میں برطانوی اضلاع کے ساتھ مل جانے کی خواہش کی گئی ہو۔'' برڈ کہتے ہیں:

''اودھ کے باہر کمپنی کے ماتحت کچھ صوبے ضرور اودھ میں ملنا چاہتے ہیں، لیکن یہ کہنا سفید جھوٹ ہے کہ اودھ کے لوگ کمپنی کے زیر اقتدار آنا چاہتے ہیں۔''[۲]

''زبردست کا ٹھینگا سر پر تھا۔ ظالم و مجرم کو سزا نہ ملتی تھی......رشوت ستانی کی گرم بازاری تھی۔'' ''برعکس نہند نام زنگی کافور مشہور'' ضرب المثل کا اس سے زیادہ تابناک مصداق اور کیا ہوگا کہ وطن دشمنی، سامراج دوستی، پس آئینہ طوطی صفتی اور شرم ناک افترا پردازی و اتہام تراشی کی شب تیرہ و تار کا نام، صبح صادق پڑ گیا اور نجم الغنی نے اس سے چمک اور شرؔر نے لپک حاصل کی۔ مگر انقلاب ۱۸۵۷ء کا مشہور مورّخ مالی سن لکھتا ہے:

''سارے اودھ نے ہمارے خلاف ہتھیار اٹھا لئے تھے سب کے سب ہمارے خلاف کھڑے ہو گئے ان لوگوں نے کمپنی کی حکومت کو اپنے نوابوں کی حکومت کے ساتھ

---

۱ گذشتہ لکھنؤ، ص ۹۶

۲ اودھ کی لوٹ، ص ۱۳۶

تول کر دیکھ لیا تھا۔ اور قریب قریب ایک رائے سے فیصلہ کر دیا تھا کہ ان کے اپنے نوابوں کی حکومت کمپنی کی حکومت سے بہتر تھی۔ جو پنشنر ہماری فوج میں کام کر چکے تھے ان سب نے صاف ہمارے راج کے خلاف فیصلہ دے دیا تھا اور ان میں سے ہر ایک غدر میں شامل تھا۔''[۱]

وہ قاضی محمد صادق کی روایت ہے، یہ انگریز مورّخ کا تجربہ ہے جو اس نے جمہور کے ردعمل سے حاصل کیا اور جس کو چھپانے پر قادر نہ ہو سکا۔

آخر میں یہ الزام کہ خزانہ خالی تھا۔ کمپنی کی حکومت کو اڑتیس لاکھ روپیہ قرض دیگر امداد، سڑک و پل وغیرہ کے ترقیاتی کام، خمس و زکوٰۃ کی باقاعدہ ادائی کے بعد جو کچھ امجد علی شاہ نے چھوڑا اس کی تفصیل بابو پری پورنا نند ورما کی لفظوں میں سنیئے:

''ایک جگہ سلیمن نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے محمد علی شاہ ۱۶رمئی ۱۸۴۲ء کو مرتے وقت ایک لاکھ چوبیس ہزار سونے کی مہریں اور پینتیس لاکھ سرکاری خزانہ میں اور ۲۴ لاکھ کی مہریں ہماری ہنڈیوں میں چھوڑ گئے تھے۔ ۱۳رفروری ۱۸۴۷ء کو امجد علی شاہ مرتے وقت ہماری ہنڈیوں میں مذکورہ بالا مہریں اور ۹۲ لاکھ روپیہ نقدی یعنی ایک کروڑ چھتیس لاکھ چھوڑ گئے تھے۔''[۲]

برطانوی ریکارڈ کے حوالے سے ڈاکٹر صفی احمد ستّر لاکھ کی ایک ایسی رقم کا حوالہ دیتے ہیں جو امجد علی شاہ نے جمع کر رکھی تھی جسے شدید سے شدید ملکی ضرورت میں بھی صرف نہیں کیا۔[۳]

معلوم نہیں کہ سلیمن کی مبیّنہ تفصیل میں یہ شامل ہے یا نہیں؟ اگر یہ سب خزانہ خالی ہونے کے علامات ہیں تو معلوم نہیں قاضی صاحب کی نظر میں خزانہ بھرا پڑا ہونے کے

---

[۱] بھارت میں انگریزی راج، (۲) ص ۸۶۴

[۲] واجد علی شاہ اور اودھ..........ص ۳۳

[۳] ٹوکنگس آف اودھ، ۵۴

نشانات کیا ہیں۔

اشاعت و طباعت کی صعوبتوں کو دیکھتے ہوئے اب مجھے تخفیف زحمت کرنا چاہئے بہت مستند مواد ایسا تھا جس سے فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا مگر اب اور موقع نہیں۔

آخر میں بس یہ درخواست ہے کہ ذکی کاکوروی صاحب نے مرحوم پروفیسر مسعود حسن کو بہت سے سورسز، رپورٹس، اور منٹس ملاحظہ فرمانے کے بعد تنقید کرنے کی صلاح دی تھی۔ میں اپنے عزیز نوجوان دوست کی خدمت میں یہ کیسے گستاخی کروں! لیکن اودھ کی تاریخ سے دلچسپی لینے والے طلباء سے جن کا مقصد فرمانروایان اودھ کے چہرے مسخ کرنا ہی نہ ہو بلکہ تلاش حقیقت ہو ضرور عرض کروں گا کہ وہ سندر لال، پری پورنا نند ورما، رئیس احمد جعفری، خورشید مصطفی اور صفدر حسین اور اسی طرح کے وطن پرست، انصاف دوست اور آزاد تاریخ نگاروں کے کارنامے کے مطالعے بغیر اپنے مطالعہ کو ناقص اور یکطرفہ نہ سمجھیں۔ ان طلاب کو مجھے اس بات کی طرف بھی متوجہ کرنا ہے کہ برطانوی کاغذات جو قومی دارالاثار یا ریاستی دارالاثاروں میں مہیا ہیں، وہ شک وشبہ سے بالاتر نہیں ہیں کیونکہ انگریزوں نے کاغذات چھپانے، ان میں ہیر پھیر کرنے، کانٹ چھانٹ کر کے موافق مطلب بنانے اور پھر انھیں سچا دستاویز بتا کر پارلیامنٹ تک میں پیش کر دینے میں کوئی تکلف نہیں کیا ہے۔ اس لئے آرکائیوز کا ریکارڈ بھی بڑی احتیاط سے پڑھا جانا چاہیے۔

غدر اور اس سے پہلے کی جن کتابوں کا انگریزوں نے ترجمہ کیا اس میں بھی تحریفات کو بڑی آزادی سے راہ دی ہے۔ اگرچہ راقم کی ناقص رائے میں معین الدین حسن کی خدنگ غدر، انگریزوں کی کارستانی ہے۔ لیکن ہمارے بالغ نظر ادیب و عالم پروفیسر خواجہ احمد فاروقی اسے معین الدین حسن کی آزادانہ تصنیف سمجھتے ہیں۔ یہ مسئلہ تفصیلی مطالعہ چاہتا ہے لیکن ترجمے میں انگریز کیا ترکیبیں کرتے تھے اسے آپ پروفیسر فاروقی کے الفاظ میں دیکھیں اور سمجھیں:

''انگریزی ترجمہ مٹکاف نے ۱۸۹۸ء میں شائع بھی کیا تھا جو فاحش اغلاط سے مملو

ہے اور اس میں ایسی ایسی تحریفیں کی گئی ہیں کہ اصل اور ترجمے میں زمین و آسمان کا فرق پیدا ہو گیا ہے۔''[1]

**خواجہ صاحب خاتمۂ کلام میں فرماتے ہیں:**

''دلچسپ بات یہ ہے کہ مٹکاف نے اپنے انگریزی ترجمے میں سے ایسے حصّے حذف کر دیئے ہیں جو اس کے نزدیک قابل اعتراض تھے۔ بعض جگہ اس نے اپنی طرف سے جملے بڑھا دیئے جو اصل کے ساتھ صریحاً خیانت ہے۔''[2]

**اس لئے ایسے ترجمے بھی نظر احتساب سے دیکھنے کی چیز ہیں۔**

❑❑

---

[1] خدنگ غدر مرتبہٗ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی، ص، ز،

[2] وہی، ص ۵



سید العلماء سید حسینؒ

# ایک سیّاح کا چشم دید بیان

''نجات حسین خاں مرحوم شاہِ دوراں امجد علی شاہ کے عہدِ حکومت میں لکھنؤ پہونچے تھے انھوں نے اپنے سفرنامہ میں بادشاہ کی رحم دلی، عدل وانصاف اور رعایا پروری اور امن کوشی کی بڑی تعریفیں لکھی ہیں۔ ملک میں اس قدر امن وامان تھا اور بادشاہ نے ایسا عمدہ انتظام کیا تھا کہ لوگ بلاخوف وخطر سفر کرتے تھے اور کوئی بھی کسی امیر یا فقیر سے معترض نہیں ہوتا تھا۔ معموری ملک اور آبادانی سلطنت کے لئے بادشاہ نے بڑی سعی کی تھی۔ رعایا کی خاطر داری اس قدر ملحوظ تھی کہ نرمی (؟) صاحب نے پانچ لاکھ روپیہ نذرانہ پیش کر کے افیون کی کاشت والے علاقے کو خریدنے کی کوشش کی۔ لیکن بادشاہ نے قبول نہ کیا کیونکہ ''رعایائے شہر بیشتر افیونی وغربا اند۔ دریں صورت ہلاک خواہند شد''، بادشاہ کی رحمدلی کے ثبوت میں دو واقعے بھی نقل کئے گئے ہیں۔ پہلا یہ کہ ایک شخص چوری کے جرم میں ماخوذ ہوا۔ اس کا جرم ثابت ہو گیا۔ عدالت سے اس کا ہاتھ کاٹ دینے کا حکم صادر ہوا جس وقت سزا کی تعمیل کے لئے مجرم کو لئے جارہے تھے، قضا را بادشاہ کی سواری ادھر سے گزری۔ انھوں نے مجمع دیکھ کر استفسار حال کیا۔ بادشاہ کو رحم آ گیا اور انھوں نے قاضی سے دریافت کیا کہ اگر قطع یدین کے بدلے صرف انگلیاں کاٹ ڈالی جائیں تو سزا کافی ہوگی یا نہیں۔ قاضی صاحب راضی ہو گئے اور مجرم کی سزا میں اس طرح تخفیف ہو گئی۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ موسمِ گرما میں ایک دن پنکھا جھلنے والی ایک خواص کو غنودگی آ گئی اور پنکھا تاجِ سلطانی سے اس طرح ٹکرا گیا کہ تاج سر سے الگ ہو کر دور جا گرا۔ بادشاہ کی والدہ بہت برافروختہ ہوئیں لیکن شاہانہ عفو وکرم سے خواص معتوب نہ ہو سکی، بادشاہ نے

اسے سونے کی اجازت دے دی اور اس کی جگہ دوسری خواص کو مروحہ زنی پر مامور کیا گیا۔

نجات حسین خاں مرحوم بتاتے ہیں کہ غازی الدین حیدر کے زمانوں (کذا) کے اعتبار سے امجد علی شاہ کے عہد میں ملک زیادہ آباد اور پر رونق تھا۔ زراعت کی حالت بہتر تھی اور پیداوار بھی بادشاہ کے حسن نیت کی بدولت روز افزوں تھی۔ غلّہ کی قیمت بازار میں یہ تھی گیہوں کا آٹا روپیہ میں ۲۳ سیر، باسمتی چاول روپیہ میں پندرہ سیر، معمولی چاول روپیہ میں بیس سیر، ارہر کی دال روپیہ میں تیس سیر، مونگ کی دال بیس سیر فی روپیہ، چنا روپیہ میں تیس سیر، خصی کا گوشت دو آنے سیر، گائے کا گھی روپیہ میں پونے دو سیر بکتا تھا۔ بازار کا گھی جس میں کھنڈی کا روغن ملا ہوتا تھا روپیہ میں دو سیر تھا۔ شہر میں عام طور سے اسی گھی کا رواج تھا۔ عوام الناس اور بعض خواص بھی یہی گھی استعمال کرتے تھے۔ خالص دانہ دار گھی گھوسیوں کے یہاں بھی بہ مشکل دستیاب ہوتا تھا۔ آمیزش والے گھی کی وجہ سے خاں صاحب مرحوم کو لکھنؤ کی کوئی مٹھائی چاہے وہ مشہور یا غیر مشہور دکان کی ہو پٹنہ کے کوملی حلوائی کی مٹھائی کے برابر خوش مزہ معلوم نہ ہوئی۔ ملائی فی سیر بارہ ٹکے کے حساب سے بکتی تھی اور جلاون کی لکڑی روپیہ میں ساڑھے تین من ملتی تھی۔ لکھنؤ کا سیر گولک پوری پیسے (کذا) ان کے حساب سے بائیس گنڈے کا ہوتا تھا۔ روپیہ سکّہ نوضرب امجد علی شاہ چودہ گنڈے کا ہوتا تھا اور اس کے ایک جانب یہ شعر تھا۔

در جہاں زد سکہ شاہی بتائید اللہ
ظل حق امجد علی شاہ زمن عالم پناہ

اور دوسری طرف سنِ جلوس تحریر ہوتا تھا۔''

اقتباس از
لکھنؤ سوا سو برس پہلے
نوشتہ پروفیسر سید حسن (پٹنہ، بہار)
ضمیمہ، روزنامہ قومی آواز لکھنؤ
۸؍اگست ۱۹۷۶ء

# فہرست مصادر


## عربی

(۱) سبیکۃ الذہب — حکیم سید علی اکبر کشمیری

## فارسی

(۲) حیاتِ رضواں مآب — مولوی سید علی اکبر اجتہادی

(۳) دوحہ ہاشمیہ

(۴) سوانح عمری — حکیم مرزا محمد کاظم

(۵) نصر المومنین — مفتی میر محمد عباس شوستری

(۶) ورثۃ الانبیاء، ج ا — مولوی سید احمد نقوی اجتہادی (علامہ ہندی)

(۷) وزیر نامہ — سید امیر علی خاں نواب وزیر السلطان

## انگریزی

(۸) اودھ انڈر واجد علی شاہ — ڈاکٹر جی ڈی بھٹنا گر

(۹) برٹش ریذیڈنٹس ایٹ دی کورٹ آف اودھ — ڈاکٹر صفی احمد

(۱۰) فریڈم اسٹرگل ان اتر پردیش (۲) — ڈاکٹر ایس اے رضوی اور ڈاکٹر ایم ایل بھار گو

| | |
|---|---|
| (۱۱) لکھنؤ گزیٹر (طبع جدید) | ونود چند شرما |
| (۱۲) شجاع الدولہ | ڈاکٹر آشیر وادی لال شریواستو |
| (۱۳) دی ایڈمنسٹریشن آف اودھ | ڈاکٹر ٹی پی چند |
| (۱۴) دی فرسٹ ٹو نوابس آف اودھ | ڈاکٹر آشیر وادی لال شری واستو |
| (۱۵) ٹوکنگس آف اودھ | ڈاکٹر صفی احمد |

## ہندی

| | |
|---|---|
| (۱۶) اودھ کی لوٹ | مترجمہ راجیندر پانڈے |
| (۱۷) اردو اتہاس کا آلو چناتمک اتہاس | سید احتشام حسین |
| (۱۸) برٹش کالین بھارت کا اتہاس | ودیادھر اور ساوتری مہاجن |
| (۱۹) بھارت میں انگریزی راج | پنڈت سندر لال |
| (۲۰) واجد علی شاہ اور اودھ راج کا پتن | پری پورنا نند ورما |
| (۲۱) مشرقی راج جون پور کا اتہاس | سید اقبال احمد جونپوری |

## اردو

| | |
|---|---|
| (۲۲) بانی درسِ نظامی | مولانا مفتی محمد رضا انصاری فرنگی محلی |
| (۲۳) بیگماتِ اودھ | شیخ تصدق حسین ایڈوکیٹ |
| (۲۴) تاریخ اجودھیا | راجہ درگا پرشاد مہرؔ سندیلوی |
| (۲۵) تاریخ اودھ، ج ۵ | حکیم نجم الغنی خاں رام پوری |
| (۲۶) تاریخ سلطان العلماء | مولانا آغا مہدی رضوی لکھنوی |
| (۲۷) تجلیات (تاریخ عباس) | مرزا محمد ہادی عزیزؔ لکھنوی |
| (۲۸) تحقیقی نوادر | ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری |

(۲۹) تذکرۂ بے بہائی تاریخ العلماء — مولوی سید محمد حسین نوگانوی
(۳۰) تنقیدِ آب حیات — میر محمد رضا ظہیرؔ
(۳۱) حیاتِ دبیر، ج ا — میر افضل حسین ثابتؔ لکھنوی
(۳۲) حیاتِ سلیمان — مولوی شاہ معین الدین احمد ندوی
(۳۳) حدیقۂ شہداء — مرزا جان
(۳۴) خدنگ غدر — معین الدین حسن مع مقدمہ خواجہ احمد فاروقی
(۳۵) خطوطِ غالبؔ — مرتبہ منشی مہیش پرشاد
(۳۶) دفتر ماتم، ج ا۔ — مرزا اسلامت علی دبیرؔ
(۳۷) دیوانِ اسیر (۳) — منشی مظفر علی اسیر
(۳۸) سوانحاتِ سلاطین اودھ (اردو ترجمہ) — کمال الدین حیدر میرزا ئرحسنی الحسینی
(۳۹) علماءِ حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے — مولانا سید محمد میاں
(۴۰) غالبؔ اور آہنگِ غالبؔ — ڈاکٹر یوسف حسین خاں
(۴۱) فسانۂ عبرت — مرزا رجب علی بیگ سرورؔ
(۴۲) گذشتہ لکھنؤ — مولوی عبدالحلیم شررؔ
(۴۳) لائف یعنی سوانح عمری — مولانا حکیم غلام حسنین علامۂ کنتوری
(۴۴) لکھنؤ کا دبستانِ شاعری — ڈاکٹر ابواللیث صدیقی
(۴۵) لکھنؤ کا شاہی اسٹیج — سید مسعود حسن رضوی ادیبؔ
(۴۶) لکھنؤ کی تہذیبی میراث — ڈاکٹر سید صفدر حسین
(۴۷) لکھنؤ کے چند نامور شعراء — ڈاکٹر سید سلیمان حسین
(۴۸) مجموعۂ صد سالہ جنتری — شام لال
(۴۹) محل خانۂ شاہی — مترجمہ مرزا فدا علی خنجرؔ
(۵۰) مراۃُ احمدی — مرتبہ مولانا الحاج ابرار حسین فاروقی کوپامئوی

| | |
|---|---|
| (۵۱) معارج الفضائل | منشی مظفر علی اسیرؔ |
| (۵۲) مآثر دلاوری | مولانا ابرار حسین فاروقی کوپامئوی |
| (۵۳) مطالعہ | ذکی کاکوروی |
| (۵۴) مقالات سلیماں (تاریخی) ج،۱ | مرتبہ مولوی سید صباح الدین عبدالرحمن |
| (۵۵) ناسخ، تجزیہ وتقدیر | مولانا سید شبیہ الحسن نونہروی |
| (۵۶) نگارشاتِ ادیب | سید مسعود حسن رضوی ادیبؔ |
| (۵۷) نذرِ ذاکر | مرتبہ ٔ مالک رام |
| (۵۸) نذر مقبول | مرتبہ خیر بھوروی |
| (۵۹) نظامی جنتری ۱۹۷۴ء | مرتبہ سید وصی ظہیر نقوی |
| (۶۰) واجد علی شاہ اوران کا عہد | مولوی سید رئیس احمد جعفری ندوی |
| (۶۱) ہندوستان میں شیعیت کی تاریخ اور شیعی عقائد کی تفصیل | مولوی سید محمد باقر شمس لکھنوی |

## مجلّات ورسائل

| | |
|---|---|
| (۶۲) الواعظ ـ لکھنؤ، جون ۱۹۴۶ء | مدیر مولانا سید آغا مہدی |
| (۶۳) الواعظ ـ لکھنؤ، اگست ۱۹۴۶ء | مدیر مولانا سید آغا مہدی |
| (۶۴) الواعظ ـ لکھنؤ، ستمبر ۱۹۴۶ء | مدیر مولانا سید آغا مہدی |
| (۶۵) الواعظ ـ لکھنؤ، فروری ۱۹۴۸ء | مدیر مولانا سید آغا مہدی |
| (۶۶) الواعظ ـ لکھنؤ، اکتوبر ۱۹۵۴ء | مدیر مولانا سید آغا مہدی |
| (۶۷) الواعظ ـ لکھنؤ، اگست، ۱۹۷۴ء | مولوی مسرور حسن مبارک پوری |
| (۶۸) سرفراز لکھنؤ، ۱۷/ مارچ، ۱۹۵۱ء | مولوی خواجہ اسداللہ اسدؔ |
| (۶۹) عصری ادب نئی دلّی، جولائی ۱۹۷۰ء | مولوی ڈاکٹر محمد حسن |

| | | |
|---|---|---|
| (۷۰) | قومی آواز، لکھنؤ ضمیمہ ۹؍فروری ۱۹۷۵ء، | عشرت علی صدیقی |
| (۷۱) | قومی آواز، لکھنؤ ضمیمہ ۸؍اگست ۱۹۷۶ء | عشرت علی صدیقی |
| (۷۲) | کاروان حیات بمبئی، مولا علی نمبر، ج ۲، ص ۱۳ و ۱۴ | سید زین العابدین عابد |
| (۷۳) | نیا دور لکھنؤ، یوم جمہوریت ۱۹۵۸ء | صباح الدین عمر |
| (۷۴) | وثیقہ دار لکھنؤ، محرم نمبر ۳؍ستمبر ۱۹۵۴ء | ابوالفتح علی مرزا رجعت |

❑❑